شرحِ زبورِ عجم

(متن، فرہنگ، ترجمہ اور تشریح)

شرح

ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی

شرحِ زبورِ عجم

(متن، فرہنگ، ترجمہ اور تشریح)

(برائے طلبہ)

شرح
ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

891.51 Yazdani, Dr. Khawaja Hameed
Sharh Zabur-i Ajam/ Dr. Khawaja Hameed Yazdani.- Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2004.
200pp.
1. Iqbal Studies. 2. Persian Poetry.
I. Title.

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ سنگ میل پبلی کیشنز/ مصنف سے باقاعدہ تحریری اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جاسکتا۔ اگر اس قسم کی کوئی بھی صورتحال ظہور پذیر ہوتی ہے تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے۔

2004

نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
سے شائع کی۔

ISBN 969-35-1598-6

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), P.O. Box 997 Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 7220100-7228143 Fax: 7245101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com
Chowk Urdu Bazar Lahore. Pakistan. Phone 7667970

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

پیش گفتار

''زبور عجم'' علامہ اقبال کے فارسی کلام کا چوتھا مجموعہ ہے جو پہلی بار ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ کے بارے میں علامہ کا یہ ارشاد ہے کہ ''میری یہ کتاب اہل مشرق کے لیے ہے۔'' اس کتاب کا' جیسا کہ ملاحظہ ہوگا' شروع میں زیادہ تر حصہ غزلیات پر مشتمل ہے' البتہ آخری حصے میں مشہور مثنوی ''گلشن راز'' کے جواب میں مثنوی ''گلشن راز جدید'' ہے' پھر ''بندگی نامہ'' کے عنوان سے ایک مثنوی ہے جس میں ان ذیلی عنوانات کے ساتھ غلامی کی خرابیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے:

= ''در بیان فنونِ لطیفۂ غلاماں'' موسیقی' مصوری

= ''مذہب غلاماں'' اور آخر میں مختصر سی مثنوی بعنوان ''درفنِ تعمیر مردانِ آزاد'' ہے۔ بقول محترم ڈاکٹر عبدالشکور احسن ''زبور عجم کی غزلیات میں سوز وساز اور لذت غم کی کیفیت نے اس شاہکار کو خود اس کے خالق کی نظر میں کتنا عظیم بنا دیا ہے' اس کا اندازہ خود شاعر کے ایک اردو شعر سے ہوتا ہے۔

اگر ہو ذوق تو فرصت میں پڑھ زبورِ عجم
فغانِ نیم شبی بے نوائے راز نہیں

(اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ' ص ۱۱۱)

گویا علامہ نے انفرادی اور اجتماعی زندگی کی مختلف کیفیات اور تقاضوں کو غزل کے رنگ میں اور جذبات کی زبان میں سمویا ہے۔ اس مجموعہ کلام میں سوز وساز کی ایک منفرد اور بے مثال کیفیت ہے۔ موسیقی کی جو فراوانی اور رنگا رنگ دل کشی اس مجموعہ میں ہے وہ علامہ کے کسی دوسرے مجموعۂ کلام میں نہیں ہے۔ علامہ کے جذب ومستی اور وفورِ شوق کی متلاطم کیفیت وجد آفرین نغموں میں جھلک رہی ہے۔ اس میں شامل مثنویوں میں بھی کچھ ایسی ہی کیفیت قاری کو بے حد متاثر کرتی ہے۔

راقم نے اس مجموعہ کلام کی تشریح میں خاصی محنت اور دقت نظر سے کام کیا ہے۔ چونکہ میرے پیش نظر طلبہ اور عام قاری ہیں' اس لیے کوشش کی ہے کہ شرح سادہ زبان میں ہو اور اس

میں فلسفیانہ بحثوں میں نہ الجھا جائے۔ اصل متن کی نقل مستند مجموعہ (کلیات فارسی جو ایرانیوں اور اقبال اکادمی نے مل کر شائع کی ہے) سے کی گئی ہے' اور جہاں علامہ نے کسی دوسرے شاعر کا کوئی شعر نقل کیا یعنی اس پر تضمین کی ہے' اس شعر کو متعلقہ شاعر کے دیوان' نیز مثنوی رومی سے چیک (Check) کیا ہے اور جو فرق نظر آیا ہے اس کا ذکر تشریح میں کر دیا ہے۔ علامہ کے اس مجموعہ میں بھی دوسرے مجموعہ ہائے کلام کی طرح شعری تلمیحات کے علاوہ قرآنی' حدیث کی اور تاریخی تلمیحات بھی ہیں' ان سب کی وضاحت فرہنگ میں کر دی ہے اور شرح میں وہ تلمیح اسی طرح رہنے دی ہے تاکہ طوالت سے بچا جائے۔ اسی طرح بعض مشکل الفاظ اور ضرب الامثال کی وضاحت بھی فرہنگ میں کر دی ہے۔

توقع ہے طلبہ اور عام قارئین اس شرح سے بھرپور استفادہ کر سکیں گے اور علامہ کے تعمیری جذبات و احساسات سے کما حقہ آگاہ ہو سکیں گے۔

آخر میں سنگ میل کے محمد نیاز صاحب کا شکریہ جن کے ایما پر مجھے یہ کام کرنے کا موقع ملا۔

خواجہ حمید یزدانی

لاہور۔ ہفتہ ۲۹ مئی ۲۰۰۴ء

بخوانندۂ کتابِ زبور

(کتاب زبور کے قاری/ پڑھنے والے سے)

۱- می شود پردۂ چشم پر کاہے گاہے — دیدہ ام ہر دو جہاں را بہ نگاہے گاہے
۲- وادیٔ عشق بسے دور و دراز است ولے — طے شود جادۂ صد سالہ بآہے گاہے
۳- در طلب کوش و مدہ دامن امید ز دست — دولتے ہست کہ یابی سرِ راہے گاہے

۱- کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ گھاس کا ایک تنکا میری آنکھوں کا پردہ بن جاتا ہے اور کبھی ایسا ہوا ہے کہ میں نے دونوں جہانوں کو ایک نگاہ سے دیکھا ہے۔ یعنی جب اس ذاتِ کریمی کا مجھ پر فیضان وارد ہوتا ہے تو مجھے باطن/ دل کی نگاہ سے دونوں جہانوں کا مشاہدہ ہو جاتا ہے' جبکہ یہ فیضان نہ ہونے کی صورت میں میں اپنے ماحول سے بے خبر رہتا ہوں۔

۲- اگرچہ عشق کی وادی بہت دور و دراز ہے' تاہم بعض مرتبہ ایک آہ سے سو سالہ راستہ طے ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ عشق تک رسائی آسانی سے ممکن نہیں' اس کے لیے دل میں سوز و جذبہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ اگر اس محبوب حقیقی کا فضل شامل ہو جائے تو اس وادی کو بآسانی طے کیا جا سکتا ہے' یعنی انسان اس ذاتِ حق کے عشق سے سرشار ہو جاتا ہے۔

۳- تو بھی (اے قاری) طلب میں کوشش کرتا رہ اور امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑ۔ یہ (عشق) ایک ایسی دولت ہے جو کبھی راہ چلتے ہاتھ لگ جاتی ہے یعنی اس کے لیے راہ حق میں سفر کرنا ضروری ہے۔ ممکن ہے کوئی ایسا مردِ کامل مل جائے جس کی نظر فیض اثر سے یا جس کی رہنمائی سے تو اس منزل عشق کو پالے۔

زبورِ عجم

حصہ اول

زبرونِ درگذشتم ز درونِ خانہ گفتم   سخنے نگفتہ ے راچہ قلندرانہ گفتم

ا- میں دروازے کے باہر کے ماحول سے گذر گیا۔ میں نے گھر کے اندر کی بات کی۔ میں نے ایک اَن کہی بات کیسے قلندرانہ انداز میں کہی۔ مطلب یہ کہ میں نے اس کتاب میں اپنی دوسری کتابوں کے مقابلے میں خارج (سیاست' تاریخ' مظاہر فطرت وغیرہ) کی بجائے اندرون اور جلوت کی بجائے خلوت کی یعنی کائنات اور آدم کے اسرار ورموز سے متعلق باتیں کی ہیں اور انہیں بے باکانہ انداز میں بیان کیا ہے۔

دعا

ا- یارب درونِ سینہ دل باخبر بدہ   در بادہ نشہ رانگرم آں نظر بدہ

۲- ایں بندہ راکہ بانفس دیگراں نزیست   یک آہِ خانہ زاد مثال سحر بدہ

۳- سیلم' مرا بجوئے تنک مایہ ے مپیچ   جولانگہے بوادی و کوہ و کمر بدہ

۴- سازی اگر حریف یم بیکراں مرا   بااضطرابِ موج سکون گہر بدہ

۵- شاہین من بصید پلنگاں گذاشتی   ہمت بلند و چنگل ازیں تیز تر بدہ

۶- رفتم کہ طائرانِ حرم راکنم شکار   تیرے کہ نافگندہ فتد کارگر بدہ

۷- خاکم بہ نورِ نغمۂ داؤدؑ بر فروز   ہر ذرۂ مرا پَرِ وبال شرر بدہ

ا- یارب میرے سینے کے اندر ایک باخبر دل عطا کر اور مجھے ایسی نظر سے نواز جس سے

میں شراب کے اندر موجود نشہ کو دیکھ لوں یعنی مجھے ایسی روحانی بصیرت عطا کر جس سے میرا دل اس حقیقت سے باخبر ہو جائے کہ کائنات کی ہر ہر شے میں تیری ہی جلوہ گری کارفرما ہے۔ تصوف کی اصطلاح میں ایسا دل' زندہ دل کہلاتا ہے۔

۲- اے خدا' اپنے اس بندے کو جس نے دوسروں کے سہارے جینا پسند نہیں کیا' صبح کی مانند ایک خانہ زاد آہ عطا کر یعنی ایسی آہ جو میرے دل کی گہرائی اور اخلاص سے نکلی ہو اور جو میرے اندر کی تاریکیوں کو نور میں بدل دے۔

۳- میں ایک سیلاب ہوں' مجھے کسی کم پانی والی ندی میں نہ الجھا/ ڈال۔ میرے لیے تو وادی' پہاڑ اور گھاٹی کو دوڑنے کی جگہ بنا۔ مطلب یہ کہ میری شاعری میں دیے گئے پیغام کو دور دور تک پوری دنیا میں پہنچا دیجو۔

۴- اگر تو مجھے بے کنار سمندر کا مدمقابل بنا دے تو پھر موج کی بیقراری کے ساتھ ساتھ مجھے موتی کا سکون بھی عطا فرما یعنی اگر میرے پیغام کو آفاقی بنائے تو جس طرح لہر میں موتی سکون سے ہوتا ہے اسی طرح مجھے بیقراری اس بات کی ہو کہ اہل جہاں میرے پیغام کو سمجھ لیں اور سکون اس بات کا کہ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے یا میرا پیغام قبول کر لیا گیا ہے۔

۵- تو نے (اے خدا) میرے شاہین کو چیتوں کے شکار کے لیے چھوڑ رکھا ہے' لہٰذا مجھے تو پہلے سے بھی زیادہ بلند ہمتی اور تیز پنجوں سے نواز/ عطا فرما۔ مطلب یہ ہے کہ مسلم معاشرہ مغربی تہذیب سے متاثر ہو کر بگڑ چکا اور اپنا مقام کھو چکا ہے۔ علامہ نے اسی حوالے سے زیادہ بلند ہمتی اور جدوجہد کی دعا کی ہے تاکہ وہ اس بگڑے معاشرے کو سنوار سکیں۔

۶- میں کعبہ کے پرندوں کے شکار کے لیے چلا ہوں یا میں چاہتا ہوں کہ کعبہ کے پرندوں کا شکار کروں تو اس کے لیے ایک ایسا تیر عطا فرما دے جو چلائے بغیر ہی کارگر ثابت ہو۔ مطلب یہ کہ علامہ اپنے کلام کے وسیلے سے مسلمانوں بالخصوص دین فروش ملاؤں اور نوجوان نسل کی اصلاح کا بیڑا اٹھا رہے ہیں' اس حوالے سے انہوں نے اس محنت طلب کام کے لیے خدا سے توفیق کی دعا کی ہے تاکہ ان کا یہ کام آسان بھی ہو جائے اور نتیجہ خیز بھی۔

۷- تو میری مٹی کو حضرت داؤدؑ کے نغمے کے نور سے چمکا دے/ روشن کر دے اور میرے

ہر ہر ذرے کو چنگاری کے بال و پر عطا فرمادے یعنی میرے روئیں روئیں میں عشق حقیقی کی تپش پیدا فرمادے۔ حضرت داوٗدؑ پر الہامی کتاب زبور نازل ہوئی تھی۔ وہ اسے اس خداداد لحن سے پڑھتے کہ اسے جن، انسان، درند، چرند پرند وغیرہ میں سے جو کوئی بھی سنتا اس پر ایک عجیب کیفیت ومحویت طاری ہو جاتی۔ علامہ نے اسی حوالے سے اپنے کلام میں بہت تاثیر کی دعا کی ہے۔ گویا اس تاثیر کی بنا پر ہی یہ کتاب ''زبور عجم'' بن سکے گی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۱)

عشقِ شور انگیز را ہر جادہ در کوئے تو برد　　بر تلاش خود چہ می نازد کہ رہ سوئے تو برد

= شور و غوغا کرنے والے عشق کو ہر راستہ تیرے کوچے میں لے گیا۔ وہ (عشق) بھلا اپنی اس تلاش پر کیا ناز کرتا ہے، اسے تو راستہ تیری طرف لے گیا یعنی انسان میں عشق صادق اور جذبہ صادق ہو تو توفیق ایزدی اسے ایسی راہوں کی نشاندہی کر دیتی ہے جن پر چل کر وہ محبوب حقیقی تک رسائی پالیتا ہے۔

غزل-۲

۱- درونِ سینہ ماسوزِ آرزو ز کجاست؟　　سبو زماست و لے بادہ در سبو ز کجاست؟
۲- گرفتم ایں کہ جہاں خاک و ما کف خاکیم　　بہ ذرہ ذرہٗ ما دردِ جستجو ز کجاست؟
۳- نگاہِ ما بگریبانِ کہکشاں افتد　　جنونِ ماز کجا شورِ ہائے و ہوز کجاست؟

۱- ہمارے سینے میں آرزو کا سوز و تپش کہاں سے ہے؟ صراحی تو ہماری ہے لیکن صراحی میں شراب کہاں سے ہے؟ تمثیل کا شعر ہے۔ سینے کو صراحی سے اور سوز و تپش کو شراب سے تشبیہ دی ہے۔ کہنا یہ چاہا ہے کہ ہر انسان کے دل میں آرزو کی تپش و حرارت معلوم ہوتی ہے، اس کا سر چشمہ کہاں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ (سر چشمہ) کہیں غائب

میں ہے' یعنی اللہ تعالیٰ جو ہمارے جسم کا خالق ہے۔ وہی ہمارے مادی جسم میں یہ آرزو پیدا کرتا ہے اور اس طرح ہماری یہ بے تابی اپنی اصل یعنی اپنے خالق کو دیکھنے کی آرزو کے باعث ہے کیونکہ انسان کا وجود دوسری دنیا میں پہلے روح کی صورت میں تھا جس کے باعث اس محبوب کا دیدار میسر تھا' مادی جسم میں آکر ہماری دیدار کی خواہش اس بیقراری کا سبب بن رہی ہے۔

۲- میں یہ مانتا ہوں کہ یہ جہان مٹی ہے اور ہم مٹی کی مٹھی ہیں (ہمارا وجود مٹی سے تخلیق ہوا ہے) پھر یہ ہمارے روئیں روئیں میں جستجو و تلاش کا درد کہاں سے ہے؟ وہی بات ذرا بدل کر کہی ہے یعنی اس تلاش و جستجو کے درد (انتہائی خواہش) کا محرک کوئی ضرور ہے اور ظاہر ہے وہ خالق حقیقی ہے۔

۳- ہماری نگاہ کہکشاں کے گریبان پر پڑتی ہے لیکن ہمارا جنون کہاں سے ہے اور (اس جنون کی بنا پر ہم میں) جو ہائے و ہو کا شور برپا ہے' اس کا سرچشمہ کہاں ہے یا وہ کہاں سے ہے؟ یعنی انسان کی نگاہ کہکشاں تک تو پہنچ جاتی ہے لیکن اسے یہ معلوم نہیں ہو پاتا کہ ہمارے مادی جسم میں یہ آرزو اور یہ عشق و جنون کہاں سے پیدا ہوتا ہے' اس کا خالق کون ہے؟ (وضاحت کے لیے پہلے شعر کی تشریح دیکھیے)

غزل-۳

۱- غزل سرائے و نواہائے رفتہ باز آور	بایں فسردہ دلاں حرفِ دل نواز آور
۲- کنشت و کعبہ و بت خانہ و کلیسا را	ہزار فتنہ ازاں چشم نیم باز آور
۳- زبادہ ے کہ بخاک من آتشے آمیخت	پیالہ ے بجوانانِ نو نیاز آور
۴- مے کہ دل ز نوایش بسینہ می رقصد	مے کہ شیشہ جاں را دہد گداز آور
۵- بہ نیستانِ عجم بادِ صبح دم تیز است	شرارہ ے کہ فرو می چکدز ساز آور

۱- (خدا سے خطاب ہے) غزل سرائی/گوئی اور اس کے سرتال کا وہ انداز جو پہلے کبھی تھا' پھر لا اور اس طرح بجھے ہوئے دل والوں کے دل کو لبھانے والے کلام کا سامان فرما۔ گویا ملت مسلمہ میں زندگی کا جو سوز و جذبہ ختم ہو چکا ہے' اس (ملت) پر توجہ فرما کر پھر سے اسے ان جذبوں سے سرشار فرما دے۔

۲- آتش پرستوں کی عبادت گاہ، مسلمانوں کے کعبہ، بت خانہ اور عیسائیوں کے گرجا میں اپنی نیم باز (ادھ کھلی) آنکھ سے ہزاروں فتنے برپا کر دے یعنی (اے خدا) اب دور کچھ ایسا آ گیا ہے کہ ہر مذہب کے لوگ مذہب سے دور ہو رہے ہیں اور مادیات پسند ہوتے جا رہے ہیں۔ ایسا سلسلہ فرما کہ وہ پھر سے مذہب کی طرف آئیں اور یوں تجھ سے وابستگی پیدا کر لیں یعنی انہیں دین اسلام سے اور تجھ سے محبت ہو جائے۔

۳- اس شراب سے، جس نے میری خاک (جسم) میں ایک آگ پیدا کر دی ہے، نئی نسل کے ان جوانوں کو بھی ایک پیالہ پلا دے جو تجھ سے تازہ تازہ نیازمندی رکھنے والے ہیں یعنی جو میری شاعری سے متاثر ہو کر نئے نئے تیرے عشق سے سرشار ہو رہے ہیں۔

۴- پھر سے وہ بانسری لا کہ جس کے نغمے سے دل سینے میں رقص کرنے لگتا ہے اور پھر سے وہ شراب لا کہ جس سے روح کا پیالہ پگھل جاتا یعنی روح میں سوز و گداز پیدا ہوتا ہے۔ گویا مسلمانوں میں پھر سے ایسے جذبے پیدا کر دے کہ جن سے وہ تیرے عشق سے سرشار ہو جائیں۔

۵- مشرق/ اسلامی دنیا کے سرکنڈوں کے جنگل میں صبح کی ہوا تیز چل رہی ہے۔ اپنے ساز سے ایک ایسا سر نکال جس سے شرر ٹپکنے لگیں۔ ایسے جنگل میں جب ہوا تیز چلے اور وہاں ایک چنگاری پھینک دی جائے تو جنگل جل اٹھتا ہے۔ علامہ نے اس استعارے سے یہ کہنا چاہا ہے کہ مسلمانوں میں بیداری کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں۔ اے خدا! تو ان میں پھر سے عشق کا وہ سوز و جذبہ پیدا کر دے جس سے وہ ایک زندہ قوم کی صورت اختیار کر لیں۔

غزل-۴

۱- اے کہ زمن فزودہ ای گرمیِ آہ و نالہ را — زندہ کن از صدائے من خاکِ ہزار سالہ را

۲- بادلِ ما چہا کنی، تو کہ بہ بادۂ حیات — مستی شوق می دہی آب و گلِ پیالہ را

۳- غنچۂ دل گرفتہ را از نفسم گرہ کشائے — تازہ کن از نسیم من داغِ درونِ لالہ را

۴- می گذرد خیالِ من از مہ و مہر و مشتری — تو بکمیں چہ خفتہ ای صید کن ایں غزالہ را

۵- خواجۂ من! نگاہ دار آبروئے گدائے خویش　　آنکہ زجوئے دیگراں پر نکند پیالہ را

۱- اے وہ ذات حق کہ جس نے (میری شاعری کے باعث) آہ و نالہ کی گرمی یعنی جذبۂ عشق کو بڑھایا ہے' تو میری آواز (شاعری) سے ہزار سالہ خاک کو زندہ فرمادے یعنی مسلمان' جو ایک طویل مدت سے جدو جہد اور جوش و جذبہ سے محروم اور مادیت پسند ہو چکے ہیں' میری شاعری سے متاثر ہو کر پھر سے تجھ سے وابستگی پیدا کر لیں اور عشق کے جذبہ سے سرشار ہو کر اپنی بقا کا سامان کر لیں۔

۲- تو ہمارے دل سے کیا کچھ کرتا ہے یا کر سکتا ہے تو جو زندگی کی شراب سے پیالہ کے آب و گل کو شوق کی مستی سے نوازتا ہے' خدا نے خمیر کی ہوئی مٹی سے آدمی کی تخلیق کی اور اس میں روح پھونک دی۔ اس حوالے سے علامہ نے یہ کہنا چاہا ہے کہ تیری ذاتِ اقدس جو یہ کچھ کر سکتی ہے یا کرتی ہے وہ ہمارے مردہ دل کو بھی زندہ کر سکتی اور آتش عشق یا سوز و جذبہ عشق سے نواز سکتی ہے۔

۳- تو میرے دم/ میری پھونک یعنی شاعری سے دل گرفتہ غنچہ کی گرہ کھول دے (یعنی مسلمانوں کو رنج و غم سے نجات دلا کر ان کے لیے سکون و راحت کا سامان فرما دے) اور میری بادِ نسیم سے لالہ کے اندر داغ کو جس کی سیاہی ماند پڑ چکی ہے' پھر سے تازگی عطا فرمادے یعنی میری شاعری میں ایسی تاثیر پیدا کر دے جس سے ان کے غمزدہ دل سکون و راحت حاصل کریں اور ان کی مشکلیں اور پریشانیاں دور ہو جائیں۔

۴- میرا خیال/ میری فکر چاند' سورج اور مشتری سے بھی آگے نکل جاتا/ جاتی ہے۔ تو گھات میں کیا سویا یا بیٹھا ہوا ہے' اس ہرنی کو شکار کر۔ علامہ کے مطابق وہ دنیا طلبی میں بہت دور نکل گئے یا نکل جاتے ہیں۔ اس طرح وہ خود سے بھی اور خدا سے بھی دور یا ناآشنا ہو گئے ہیں۔ خدا سے عرض کرتے ہیں کہ وہ ان کی اس مادیت کی دوڑ کو ختم کر کے انہیں اپنی معرفت کی طرف چلائے۔

۵- اے میرے آقا! اپنے اس گدا کی آبرو کی حفاظت فرما' ایسا گدا جو دوسروں کی ندی سے اپنا پیالہ نہیں بھرتا یعنی دوسروں کے سہارے زندگی بسر نہیں کرتا بلکہ صرف تیرے در کا سوالی ہے۔

غزل-۵

۱- از مشت غبارِ ما صد نالہ بر انگیزی	نزدیک تر از جانی باخوے کم آمیزی
۲- در موجِ صبا پنہاں دز دیدہ بباغ آئی	در بوئے گل آمیزی، باغنچہ در آویزی
۳- مغرب ز تو بیگانہ، مشرق ہمہ افسانہ	وقت است کہ در عالم نقش دگر انگیزی
۴- آں کس کہ بسر دارد سودائے جہانگیری	تسکین جنونش کن با نشتر چنگیزی
۵- من بندۂ بے قیدم شاید کہ گریزم باز	ایں طرۂ پیچاں را در گردنم آویزی
۶- جز نالہ نمی دانم گویند غزل خوانم	ایں چیست کہ چوں شبنم بر سینۂ من ریزی

۱- تو (اے خدا) ہمارے مشت غبار (خاکی جسم) میں سینکڑوں فریادیں/ نالے بلند/ پیدا کرتا ہے۔ تو دوسرے سے کم ملنے کی عادت رکھنے کے باوجود تو جان سے بھی زیادہ ہمارے نزدیک ہے۔ ایک قرآنی آیت کے مطابق ارشاد خداوندی ہے کہ ''میں تیری (بندے کی) شہ رگ سے بھی قریب ہوں۔'' اسی حوالے سے علامہ نے یہ کہنا چاہا ہے کہ انسان کی نالہ کشی اس بات کی دلیل ہے کہ تیری ذاتِ اقدس واقعی ہمارے قریب ہے۔

۲- تو صبح کی ہوا میں چوری چوری یعنی چھپ کر باغ میں آتا اور پھول کی خوشبو میں گھل مل جاتا اور کلیوں میں مل جاتا ہے یعنی ان سب کے پیچھے تیری ہی ذات کارفرما ہے۔ سورۂ یونس، آیہ ۶ میں ارشاد ہے ''بلاشبہ رات اور دن کے یکے بعد دیگرے آنے میں اور اللہ نے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں پیدا کیا ہے، ان سب میں ان لوگوں کے واسطے (توحید کے دلائل ہیں جو (خدا کا) ڈر مانتے ہیں۔'' شیخ سعدی نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے:

برگ درختانِ سبز پیش خداوندِ ہوش
ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

(ایک صاحب ہوش وخرد کے لیے سبز درختوں کا ہر ہر پتا اس خالق کی معرفت کی ایک ایک کتاب ہے)

۳- مغرب/ یورپ تجھ سے بیگانہ ہو چکا ہے اور مشرق/ اہل مشرق بھی کہانی کی مانند خیالی دنیا میں کھوئے ہوئے ہیں۔ اب وقت/ موقع ہے کہ تیری ذات اس کائنات میں ایک نیا نقش بنائے۔ اہل یورپ تجھ سے دور ہو چکے ہیں جبکہ اہل مشرق باطل افکار اور

توہمات وغیرہ کا شکار ہیں۔ ضرورت ہے کہ اب ایسی صورتِ حال پیدا فرمادے جس میں انسان صحیح معنوں میں خود کو تیرا بندہ سمجھے، تجھے معبودِ مطلق تسلیم کرے اور شیطانی قوتوں اور افکار سے دور رہے۔

۴- وہ انسان جس کے سر میں جہانگیری کا جنون سمایا ہوا ہے، اس کے اس جنون کو چنگیزی نشتر سے سکون عطا کر۔ اس میں مغربی قوموں کی طرف اشارہ ہے جو خدا کی حاکمیت کی بجائے دنیا پر اپنی ابلیسی حاکمیت مسلط کرنے میں لگی ہوئی ہیں۔ ان کا علاج یہی ہے کہ کوئی چنگیز سا جابر وظالم فاتح آئے جو ان کی تباہی کا سامان کرکے دنیا کو ان کی شیطنت سے نجات دلادے۔

۵- میں ایک آزاد قسم کا بندہ ہوں یا میں (اے خدا) تیرا ایسا بندہ ہوں جو زنجیروں میں جکڑا ہوا نہیں ہے، اس لیے شاید کہ میں پھر تجھ سے بھاگ جاؤں (یعنی دورِ حاضر کے اثرات کے نتیجے میں میں تیرا بندہ ہوتے ہوئے بھی تیرے آقا ہونے کے آداب سے ناواقف ہوں، لہٰذا ممکن ہے کہ میں پھر تجھ سے دور ہو جاؤں، لہٰذا تو اپنے اس بل کھائے ہوئے گیسوؤں کو میری گردن میں لپیٹ دے۔ مطلب یہ کہ مجھے اپنی غلامی کے آداب سے آگاہ وآشنا فرمادے تاکہ میں تیری بندگی / غلامی سے کسی صورت بھی نکلنے کی کوشش نہ کرسکوں۔

۶- میں تو نالہ وفریاد کے سوا کچھ نہیں جانتا جبکہ لوگ مجھے غزل خواں (شاعر) کہتے ہیں۔ پھر یہ کیا چیز ہے جو تو (اے خدا) شبنم کی طرح میرے سینے پر گرا رہا ہے۔ مطلب یہ کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ تیرے فیض کے باعث ہے جو مجھ پر وارد ہوتا ہے۔ میں تیری طرف سے خود پر نازل شدہ پیغام لوگوں تک شاعری کی صورت میں پہنچا رہا ہوں جبکہ اس حقیقت سے بے خبر لوگ مجھے عام قسم کی شاعری کرنے والا سمجھتے ہیں۔

غزل-۶

۱- من اگرچہ تیرہ خاکم دلکے است برگ وسازم — بنظارۂ جمالے چو ستارہ دیدہ بازم

۲- بہ ہوائے زخمۂ تو ہمہ نالۂ خموشم — تو بایں گماں کہ شاید زنوا فتادہ سازم

۳- بضمیرم آں چناں کن کہ زشعلۂ نوائے — دلِ خاکیاں فروزم، دلِ نوریاں گدازم

۴- تب و تاب فطرت ما ز نیازمندی ما ۔۔۔ تو خدائے بے نیازی نرسی بسوز و سازم

۵- بکسے عیاں نکردم ز کسے نہاں نکردم ۔۔۔ غزل آں چناں سرودم کہ بروں فتاد رازم

۱- میں اگرچہ ایک تاریک مٹی ہوں (مٹی کے جسم والا ہوں) تاہم اس مٹی میں موجود ایک چھوٹا سا دل میرا ساز و سامان ہے۔ ایک جمال کے نظارے کے لیے میں کھلی ہوئی آنکھوں والا ہوں۔ دل سے مراد ایسا دل جو خدا کی معرفت کے نور سے روشن ہے اور چونکہ شاعر کا دل اس نور سے منور ہے۔ اس لیے وہ اس ذات کے جمال کے نظارہ کی خاطر آنکھیں کھلی رکھتا ہے۔

۲- تیرے مضراب کی خواہش میں میں سراپا نالۂ خاموش ہوں اور تیری ذات یہ خیال کیے ہوئے ہے کہ شاید میں ایک ایسا ساز ہوں جس میں نغمہ ختم ہوگیا ہے۔ مطلب یہ کہ مجھ میں جذبہ عشق پوری طرح سمایا ہوا ہے' بس تیری توجہ' تیری نظرِ عنایت کی ضرورت ہے۔

۳- تو (اے خدا) میرے ضمیر کے ساتھ ایسا سلوک فرما کہ نوا (شاعری) کے شعلے سے میں مٹی کے پتلے انسانوں کے دل روشن کر دوں اور فرشتوں کے دل پگھلا دوں یعنی میری شاعری سے جہاں انسانوں کے دل تری محبت سے سرشار ہو جائیں وہاں فرشتے بھی سوز و گداز کی لذت سے آشنا ہو جائیں۔

۴- ہماری فطرت/ سرشت میں جو بیقراری کی حرارت اور چمک ہے وہ ہماری اس نیاز مندی کے باعث ہے جو تیری ذات اقدس سے ہمیں ہے۔ تو تو بے نیاز خدا ہے یعنی نیاز مندی سے بے خبر ہے' اس لیے تو میرے سوز و ساز سے کیونکر آگاہ ہو سکتا ہے۔ عشق میں سوز و گداز کی جو لذت ہمیں حاصل ہے تو اسے نہیں پا سکتا۔

۵- میں نے ارادتاً کسی پر راز ظاہر نہیں کیے اور نہ کسی سے چھپائے لیکن معاملہ کچھ ایسا ہوا کہ میں نے غزل کچھ اس انداز میں چھیڑی کہ میرے دل کے راز ظاہر ہو گئے۔ اپنی شاعری کے حوالے سے بات کی ہے۔ یہ راز عام راز نہیں بلکہ ایسے راز ہیں جو خالق و مخلوق' عاشق و معشوق اور بندہ و آقا کے حالات و مقامات سے تعلق رکھتے ہیں۔

غزل-۷

۱- بصدائے دردمندے بنوائے دل پذیرے ۔۔۔ خم زندگی کشادم بجہانِ تشنہ میرے

۲۔ تو بروئے بے نوائے درِآں جہاں کشادی | کہ ہنوز آرزویش نہ دمیدہ در ضمیرے
۳۔ زنگاہِ سرمہ سائے بدل و جگر رسیدی | چہ نگاہِ سرمہ سائے، دو نشانہ زد بہ تیرے
۴۔ بنگاہِ نارسایم چہ بہارِ جلوہ دادی | کہ بباغ و راغ نالم چو تدروِ نو صفیرے
۵۔ چہ عجب اگر دو سلطاں بہ ولایتے نگنجند | عجب ایں کہ می نگنجد بدو عالمے فقیرے

۱۔ میں نے ایک دردمند صدا اور ایک دل پذیر نغمے یعنی اپنی شاعری کے ذریعے پیاس سے مرنے والی دنیا کے لیے زندگی کی شراب کی صراحی کھول دی۔ مطلب یہ کہ میں نے محبوب حقیقی کا پیغام اور اس کے عشق کا جذبہ ان انسانوں تک پہنچایا جو اس سے ناآشنا اور بے خبر تھے۔

۲۔ (اے خدا) تو نے ایک بے نوا پر (اپنے خاص کرم سے) اس جہان کا دروازہ کھول دیا کہ جس کی آرزو بھی ابھی تک کسی کے ضمیر (دل) میں پیدا نہیں ہوئی یعنی تیرے فضل و کرم سے مجھ پر معرفت کے جو حقائق روشن ہوئے ہیں ان سے دوسرے لوگ محروم ہیں۔

۳۔ تو اپنی سرمہ لگی آنکھ کے ساتھ (میرے) دل و جگر میں اتر گیا۔ واہ اس سرمہ لگی آنکھ کے کیا کہنے کہ جس نے ایک تیر سے دو نشانے کیے۔ سرمہ لگی آنکھ سے مراد اس محبوب حقیقی کا جلوۂ حسن ہو سکتا ہے جو کائنات میں، مختلف صورتوں میں نمایاں ہے اور صاحب بصیرت اور جذبہ عشق سے سرشار انسان اس میں محو ہو جاتا ہے۔ علامہ نے یہاں اپنے اس جذبے کے حوالے سے بات کی ہے۔

۴۔ تو نے میری نارسا نگاہ کو جلوؤں کی کیسی بہار سے نوازا یا آشنا کیا ہے کہ میں باغوں اور سبزہ زاروں میں اس چکور کی طرح فریاد کر رہا ہوں جس نے تازہ تازہ بولنا سیکھا ہو یعنی میری نگاہوں میں ایسی صلاحیت نہ تھی کہ وہ تیرے جلوے تک رسائی حاصل کر سکیں۔ یہ تو تیرا مجھ پر لطف و کرم ہے کہ مجھے تو نے اس دولت سے نوازا اور یوں میں جذبہ عشق سے سرشار ہو کر اپنی بیقراری کا اظہار کر رہا ہوں۔

۵۔ اگر دو سلطان ایک ملک/سلطنت میں نہیں سماتے تو یہ کوئی تعجب اور حیرانی کی بات نہیں ہے، تعجب تو اس بات میں ہے کہ ایک فقیر (مردِ کامل) دونوں جہانوں میں نہیں سما سکتا۔ گویا صاحب فقر یا مردِ کامل اپنے صادق جذبوں کی بنا پر بے پناہ وسعت کا مالک ہوتا ہے۔ اس شعر میں جو مضمون ہے وہ شیخ سعدیؒ کے اس مقولہ کی طرف اشارہ

کرتا ہے:

دہ درویش در گلیمے بہ خسپند و دو بادشاہ در اقلیمے نہ گنجند

(دس درویش ایک قالین یا کمبل میں سو جاتے ہیں جبکہ دو بادشاہ ایک اقلیم (وسیع سلطنت) میں نہیں سماتے۔

غزل-۸

۱-	بر سرِ کفر و دیں فشاں رحمت عام خویش را	بندِ نقاب بر کشا ماہِ تمام خویش را
۲-	زمزمۂ کہن سرائے، گردشِ بادہ تیز کن	باز بہ بزم ما نگر آتش جام خویش را
۳-	دام ز گیسواں بدوش زحمت گلستاں بری	صید چرا نمی کنی طائر بام خویش را
۴-	ریگ عراق منتظر، کشت حجاز تشنہ کام	خونِ حسینؓ باز دہ کوفہ و شام خویش را
۵-	دوش براہبر زند، راہ یگانہ طے کند	می ندہد بدست کس عشق زمام خویش را
۶-	نالہ بآستانِ دیر بے خبرانہ می زدم	تا بحرم شناختم راہ و مقام خویش را
۷-	قافلۂ بہار را طائر پیش رس نگر	آنکہ بخلوتِ قفس گفت پیام خویش را

۱- (اے ذات اقدس) کفر اور دین پر اپنی رحمت عام نچھاور کر، اپنے ماہِ کامل/چودھویں کے چاند والے چہرے سے پردہ اٹھا۔ یعنی اپنی تجلیات کو عام کر جس سے مسلمان کا ایمان اور مضبوط ہو اور کافر کفر سے باز آ جائے۔ خدا کے لازوال حسن و تجلی کے حوالے سے یہ کہنا چاہا ہے کہ جب تیرا جلوہ عام ہوگا تو کافر اس کے نظارے سے تجھ پر خود بخود ایمان لے آئے گا۔

۲- پرانا نغمہ پھر چھیڑ دے اور شراب کی گردش تیز فرما دے، پھر تو ہماری محفل میں اپنے جام کی آگ (شراب) کو دیکھ۔ اس دور میں لوگ خدا اور انسانی جذبوں سے دور ہو گئے اور مادیت پسند ہو گئے ہیں۔ اس حوالے سے یہ کہا ہے کہ اے محبوب حقیقی! تو ہمارے اسلاف کی اقدار کا پھر سے سامان فرما دے۔ پھر دیکھ کہ ہم انسان کس طرح تیری ذات کے عشق سے سرشار ہوتے ہیں۔

۳- (اے محبوب حقیقی) تو اپنے گیسوؤں کا جال کندھے پر رکھے گلستان کی طرف جانے کی زحمت فرما رہا ہے، تو اپنی چھت پر بیٹھے پرندے کو شکار کیوں نہیں کرتا۔ مطلب یہ کہ

تیرے عشاق ایک مدت سے تیرے دیدار/ نظارے کی خاطر تیرے در پر بیٹھے ہیں' ان کو اپنی تجلیوں سے نواز۔ چونکہ محبوب کی بات ہے' اس لیے گیسو وغیرہ کے حوالے سے ایسا کہا ہے۔

۴- عراق کی ریت انتظار میں ہے' جبکہ حجاز کی کھیتی پیاسی یعنی سوکھی پڑی ہے تو پھر کوفہ اور شام کو حضرت امام حسینؓ کا خون عنایت کر۔ کربلا کے واقعہ کے حوالے سے یہ کہا ہے کہ آج کی باطل قوتوں کے ہاتھوں تنگ تمام اسلامی ملک اس انتظار میں ہیں کہ کوئی مردِ حق آکر ان باطل قوتوں کو مٹا دے اور انہیں اس اذیت سے نجات دلائے۔

۵- عشق رہنما کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر چلتا ہے یعنی اسے رہنما/ رہبر کی ضرورت نہیں' وہ تنہا اپنا راستہ طے کرتا ہے اور وہ اپنی لگام کسی کے ہاتھ میں نہیں دیتا۔ پہلے مصرعے والی بات دوسرے انداز میں کہی ہے یعنی عشق ایک ایسا جذبہ صادق ہے جو عاشق کو اس کی منزل (محبوبِ حقیقی تک رسائی) تک پہنچا دیتا ہے۔

۶- میں نے بے خبری کی صورت میں بت کدہ کی چوکھٹ پر فریاد کی' تب کہیں میں حرم تک اپنے راستے اور مقام کو پہچان گیا یعنی مجھے معلوم ہو گیا۔ مطلب یہ کہ ایک مدت تک دنیا کی غلامی کے بعد مجھ پر یہ کھلا کہ اصل آقا و مالک تو کوئی اور ہے اور وہ ہے ربِ کعبہ' یعنی تیری ذاتِ اقدس جو رب العالمین ہے۔

۷- اس پرندے کو دیکھ جو بہار کے قافلہ کی خوشخبری اس (بہار) کے آنے سے پہلے دیتا ہے۔ وہ پرندہ اگرچہ پنجرے میں قید ہے یعنی آزاد نہیں ہے' تاہم اس نے اس قید میں بہار کی آمد کا پیغام دیا یا خوش خبری سنائی ہے۔ علامہ نے اپنے حوالے سے بات کی ہے یعنی اگرچہ وہ انگریز کی غلامی میں ہیں (انگریزوں نے اس ملک پر قبضہ کر رکھا ہے) لیکن وہ دیکھ رہے ہیں کہ آزادی کے دن آنے والے ہیں۔ اسلامی ممالک آزاد ہوں گے اور دین اسلام پھر عروج حاصل کرے گا۔

غزل-۹

۱- نوائے من ازاں پر سوز و بیباک و غم انگیز است — بخاشا کم شرار افتاد و بادِ صبحدم تیز است

۲- ندارد عشق سامانے و لیکن تیشہ دارد — خراشد سینۂ کہسار و پاک از خون پرویز است

۳-	مرا در دل خلید ایں نکتہ از مردِ ادادانے	زمعشوقاں نگہ کاری تراز حرف دل آویز است
۴-	بہ بالینم بیا یکدم نشیں کز دردِ مہجوری	تہی پیمانۂ بزم ترا پیمانہ لبریز است
۵-	بہ بستاں جلوہ دادم آتش داغ جدائی را	نسیمش تیز تر می سازد و شبنم غلط ریز است
۶-	اِشارتہائے پنہاں خانماں برہم زند لیکن	مرا آں غمزہ می باید کہ بیباک است و خوں ریز است
۷-	نشیمن ہر دو را در آب و گِل لیکن چہ راز است ایں	خرد را صحبت گِل خوشتر آید، دل کم آمیز است
۸-	مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی	برہمن زادہ ے رمز آشنائے روم و تبریز است

۱- میری نوا یعنی شاعری اس بنا پر پرسوز' بے خوف اور غم ابھارنے والی ہے کہ میرے خس و خاشاک میں چنگاری پڑی ہوئی ہے اور صبح کی ہوا بھی تیز ہے یعنی میرے (علامہ کے) دل میں عشق کی آگ ہے جو ہر لمحہ تیز ہونے والی ہے۔ گویا میرا سینہ/ دل ماسوا اللہ کی آلودگی سے صاف ہو چکا ہے۔

۲- اگرچہ عشق کے پاس کوئی سامان نہیں ہے' تاہم وہ تیشہ ضرور رکھتا ہے جس سے وہ پہاڑ کا سینہ چیرتا ہے اور پرویز کے خون سے بھی پاک رہتا ہے۔ شیریں' فرہاد اور خسرو پرویز کی تلمیح سے استفادہ کیا ہے۔ فرہاد نے شیریں کے حصول کے لیے خسرو پرویز کی شرط منظور کر لی اور تیشے سے کوہِ بیستوں کو کھود کر نہر نکالی لیکن پرویز کو کوئی نقصان نہ پہنچایا۔ گویا ایک عاشق صادق اگرچہ دنیاوی ساز و سامان نہیں رکھتا لیکن دنیا سے ٹکر لیے بغیر اپنے جذبہ صادق کی تکمیل میں مصروف رہتا ہے۔

۳- ایک اداشناس آدمی کے اس نکتے سے میرے دل میں خلش پیدا ہوگئی کہ ''معشوقوں کی دل نشین باتوں کی بجائے ان کی نگاہ زیادہ کاری ہوتی ہے۔'' گویا ایک مردِ کامل کی نگاہ مٹی کو سونا بنا سکتی ہے یا عام انسان میں عشق کے جذبے پیدا کر دیتی ہے اور یہ کام تحریر و تقریر کے بس کی بات نہیں۔

۴- (اے محبوب) تو میرے سرہانے آ اور کچھ دیر کے لیے (میرے پاس) بیٹھ اس لیے کہ دردِ ہجر کے باعث تیری بزم میں خالی پیالہ رکھنے والا یعنی جو تیرے وصل کی شراب سے محروم عاشق ہے' اس کا پیمانہ یعنی زندگی یا صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔

۵- میں نے اپنی جدائی کے داغ کی آگ باغ میں روشن کی (اس خیال سے) کہ شاید باغ کی ہوا سے یہ آگ سرد پڑ جائے لیکن معاملہ اس کے برعکس ہوا یعنی بادِ نسیم اسے اور بھڑکا رہی ہے اور شبنم کا پانی بھی بے اثر ثابت ہوا ہے۔ مطلب یہ کہ عشق اور ہجر

کا غم ایسا ہے جس میں کوئی غمگسار نہیں بنتا الٹا طعنوں تشنوں سے اس غم میں اضافہ کیا جاتا ہے۔

۶- (محبوب) کے پوشیدہ رمز و کنایہ کا انداز اگرچہ عاشق کے گھر کو درہم برہم/ برباد کر دیتا ہے لیکن مجھے ایسے غمزہ و کرشمہ کی ضرورت/ خواہش ہے جو بے خوف بھی ہو اور خون ریز بھی یعنی جو مصلحت نہ دیکھے بلکہ اس سے میرا عشق انتہا کو پہنچے۔

۷- دونوں (عقل اور دل) کا ٹھکانا آب و گل یعنی انسانی جسم میں ہے لیکن یہ کیا راز ہے کہ عقل کو تو مٹی کی صحبت اچھی لگتی ہے جبکہ دل اس سے نہیں گھلتا ملتا یعنی عقل صرف مادی دنیا میں مصروف رہتی ہے جبکہ دل کو دنیاوی علائق سے کوئی سروکار نہیں ہوتا یعنی ایسا دل جو عشق کے جذبۂ صادق سے سرشار ہو۔

۸- مجھے دیکھ کہ تو ہندوستان میں (مجھ سا) پھر نہیں دیکھے گا کہ ہوں تو میں برہمن کی نسل سے لیکن روم اور تبریز کی رمز سے آشنا ہوں یعنی رومی اور شمس تبریزی (جو رومی کے مرشد تھے) کے حقائق و معارف سے آگاہ ہوں۔

غزل-۱۰

۱- دل و دیدہ ے کہ دارم ہمہ لذتِ نظارہ — چہ گنہ اگر تراشم صنمے ز سنگِ خارہ
۲- تو بجلوہ درنقابی کہ نگاہ برنتابی — مہِ من! اگر ننالم تو بگو دگر چہ چارہ
۳- چہ شود اگر خرامی بسرائے کاروانے — کہ متاعِ ناروانش دلکے است پارہ پارہ
۴- غزلے زدم کہ شاید بنوا قرارم آید — تپ شعلہ کم نگردد زگسستنِ شرارہ
۵- دلِ زندہ ے کہ دادی بہ حجاب درنسازد — نگہے بدہ کہ بیند شررے بسنگِ خارہ
۶- ہمہ پارۂ دلم را ز سرورِ او نصیبے — غمِ خود چساں نہادی بدلِ ہزار پارہ
۷- نکشد سفینۂ کس بہ یمے بلند موجے — خطرے کہ عشق بیند بسلامتِ کنارہ
۸- بشکوہِ بے نیازی زخدایگاں گذشتم — صفتِ مہ تمامے کہ گذشت برستارہ

۱- (اے محبوب حقیقی) میرا دل اور میری نگاہ سراپا لذتِ نظارہ سے سرشار ہے، لہٰذا اس خاطر اگر میں سخت پتھر سے کوئی بت تراش لیتا ہوں تو اس میں میرا کیا گناہ ہے۔ محبوب حقیقی پردوں میں ہے، سامنے نہیں ہے جبکہ ایک عاشق صادق اس کے دیدار کے لیے

سراپا آرزو بنا ہوا ہے' اسی خاطر وہ اس کا ایک تصوراتی بت تراش کر دراصل اس کے نظارے میں محو ہونا چاہتا ہے' اپنے جذبہ عشق کی بنا پر وہ اپنے اس عمل کو گناہ نہیں سمجھتا۔

۲۔ تو جلوے میں ہوتے ہوئے بھی نقاب میں یعنی پوشیدہ ہے' اس لیے کہ تو عاشق کی نگاہ کی تاب نہیں لاتا' سوائے میرے چاند (محبوب حقیقی) اگر اس صورتِ حال پر میں نالہ وفریاد نہ کروں تو پھر تو ہی بتا کہ اس کے سوا اور کیا چارہ ہے۔ عاشق کی سب سے بڑی آرزو محبوب کا دیدار ہے لیکن محبوب حقیقی کا جلوہ یوں تو کائنات کے ذرے ذرے میں ہے جبکہ وہ خود پنہاں ہے اور یہ صورت حال ایک عاشق کو رونے اور نالہ و فریاد پر مجبور کرتی ہے۔

۳۔ اے محبوب! اگر تو اس کارواں سرا میں چل کر آ جائے تو کیا ہو جائے گا (تیرا کیا بگڑے گا) یہ سرا ایسی ہے جس کی نہ چلنے والی دولت یا کھوٹا سکہ ایک ٹکڑے ٹکڑے دل ہے یعنی میرے اس چھوٹے سے اور پارہ پارہ دل کی آرزو پوری کر جو تیرے عشق سے سرشار اور تیرے دیدار کے لیے بیقرار ہے۔

۴۔ میں نے ایک غزل چھیڑی کہ شاید میری اس نوا (شاعری) سے مجھے قرار آ جائے لیکن بات یہ ہے کہ چنگاری کے نکلنے سے شعلے کی تپش میں کمی نہیں آتی۔ اس استعارے سے مقصود یہ ہے کہ غزل کی صورت میں اپنے جذبہ وآرزو کے اظہار کے باوجود تیرے عشق میں مجھے قرار نہیں آیا۔

۵۔ (اے محبوب حقیقی) تو نے مجھے جو دل زندہ (جذبہ عشق سے سرشار دل) عطا فرمایا ہے وہ پردے سے موافقت نہیں کرتا' اسے تیرا پردے میں رہنا گوارا نہیں ہے یا اس کے لیے ناقابل برداشت ہے' وہ تجھے سامنے دیکھنے کا آرزومند ہے تو اسے ایسی نگاہ عطا فرما دے جو سخت پتھر میں چنگاری کو دیکھ لے یعنی میری ظاہری آنکھوں کو اپنے جلوے سے نہیں نوازتا' تو ایسی بصیرت سے نواز جو اس کائنات کی اشیا میں تیری جلوہ گری کا نظارہ کر سکے۔

۶۔ میرے دل کا ہر ٹکڑا (تیرے عشق کی شراب) کے سرور سے بہرہ ور ہے (خوب سرشار ہے۔ میرے لیے یہ حیران کن بات ہے کہ) تو نے ایک ہزار ٹکڑوں والے دل میں اپنا غم عشق کیونکر / کیسے ڈال دیا۔

۷۔ کسی کی کشتی بلند موجوں / لہروں والے سمندر میں وہ خطرہ محسوس نہیں کرتی جو خطرہ عشق

سمندر کے ساحل کی سلامتی میں دیکھتا ہے یعنی عشق کی زندگی حرکت وکلفت میں ہے جبکہ سکون وراحت اس کے لیے موت ہے' سوز اور تب وتاب اور درد وداغ ہی اس کا سرمایۂ حیات ہے۔

۸- میں اپنی بے نیازی کی شان میں دنیاوی خداؤں سے بے تعلق رہا' بالکل اسی طرح جس طرح چودھویں کا چاند/ ماہِ کامل ستاروں سے بے پروا گذر جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ میں دنیاوی شان وشوکت' دبدبہ اور دولت وحرص سے بے پروا اور دور رہا۔ دوسرے مصرعے میں تمثیل میں وہی بات کی ہے۔

غزل-۱۱

۱-	گرچہ شاہینِ خرد برسرِ پروازے ہست	اندریں بادیہ پنہاں قدر اندازے ہست
۲-	آنچہ از کارِ فرو بستہ گرہ بکشاید	ہست ودر حوصلہ زمزمہ پردازے ہست
۳-	تاب گفتار اگر ہست شناسائے نیست	وائے آں بندہ کہ در سینۂ او رازے ہست
۴-	گرچہ صد گونہ بصد سوز مرا سوختہ اند	اے خوشا لذتِ آں سوز کہ ہم سازے ہست
۵-	مردہ خاکیم وسزا وارِ دل زندہ شدیم	ایں دل زندہ وما! کارِ خدا سازے ہست
۶-	شعلۂ سینۂ من خانہ فروز است ولے	شعلہ ہست کہ ہم خانہ براندازے ہست
۷-	تکیہ بر عقل جہاں بین فلاطون نکنم	در کنارم دلکے شوخ ونظر بازے ہست

۱- اگرچہ خرد کا شاہین پرواز کے لیے تیار ہے لیکن اس بیابان میں ایک تیر پھینکنے والا بھی چھپا ہوا ہے۔ مراد عشق ہے۔ گویا عشق' خرد کو شکار کر لیتا ہے۔ مطلب یہ کہ جس مقام تک عشق کی رسائی ہے عقل وہاں تک پہنچنے سے قاصر ہے' نہیں پہنچ سکتی۔

۲- وہ شے جو رکے ہوئے کام کی گرہ کھول سکتی ہے' وہ دنیا میں موجود تو ہے لیکن وہ نغمہ الاپنے والے یعنی عشق کے حوصلے میں ہے۔ گویا عشق کے سچے جذبے ہی مشکلات کا حل کر سکتے ہیں اور کسی کے بس کی یہ بات نہیں۔

۳- اگر بات کرنے کی طاقت ہے تو اس کو سمجھنے والا کوئی نہیں ہے۔ افسوس ہے اس بندے کی حالت پر کہ جس کے سینے میں کوئی راز ہے۔ بات کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے والا ہی کوئی نہیں ہے۔ اس صورت میں صاحب راز کے لیے راز کا افشا/ ظاہر کرنا بھی

مشکل اور اس کا چھپائے رکھنا بھی دشوار ہے۔

۴۔ اگر چہ قدرت یا خالق کائنات نے سو طرح سے مجھے سو قسم کے سوز میں جلایا ہے لیکن کیا کہنے ہیں اس سوز کی لذت کے (یا کیسی اچھی ہے وہ لذتِ سوز) کہ جس میں ساز بھی ہے یعنی یہ سوز در حقیقت سوز عشق ہے جو عاشق کی زندگی و بقا کا باعث بنتا ہے اور جس سے وہ لذت حاصل کرتا ہے۔

۵۔ ہم تو ایک مردہ خاک ہیں (بے جان مٹی کے بنے ہوئے) لیکن دل زندہ کے سزاوار/ لائق بن گئے ہیں۔ یہ زندہ دل اور ہم؛ یہ سب اس خالق کائنات یا کام بنانے والے خدا کا ہے یعنی اس گوشت کے ٹکڑے دل میں اپنی معرفت اور عشق کی دولت ڈال دی ہے۔ زندہ دل سے مراد ایسا دل جو عشق حقیقی اور معرفت ایزدی کے جذبے سے سرشار ہو اور ایسا دل اس ذات کے فضل و کرم ہی سے ملتا ہے۔

۶۔ میرے سینے کا شعلہ یعنی عشق کا شعلہ گھر کو روشن کرنے والا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایسا شعلہ ہے جو گھر کو برباد کرنے والا بھی ہے یعنی یہ ایسی نعمت ہے جس کی بدولت انسان کو حق کو پہچاننے اور اپنی معرفت کا نور ملتا ہے اور یوں تاریک سینہ منور ہو جاتا ہے جبکہ مادیت پسندی اور نفسانی خواہشات اس سے ختم ہو جاتی ہیں جو گویا بربادی ہے۔

۷۔ میں افلاطون کی جہاں بیں عقل پر بھروسا نہیں کرتا۔ میرے پہلو میں ایک چھوٹا سا دل ہے جو شوخ بھی ہے اور نظر باز بھی۔ مطلب یہ کہ عقل خواہ افلاطون کی ہو، بھروسے کے لائق نہیں ہے۔ میرا دل عشق سے سرشار ہے جو شوخ ہر طرف حسن کو دیکھنے والا بھی ہے۔ میرے لیے یہی دل سب کچھ ہے کیونکہ جہاں تک اس کی رسائی ہے، عقل کا وہاں تک پہنچنا ممکن نہیں۔

غزل۔۱۲

۱۔ ایں جہاں چیست؟ صنم خانۂ پندارِ من است | جلوۂ او گروِ دیدۂ بیدارِ من است

۲۔ ہمہ آفاق کہ گیرم بنگاہے او را | حلقہ ے ہست کہ از گردشِ پرکارِ من است

۳۔ ہستی و نیستی از دیدن و نادیدنِ من | چہ زمان و چہ مکاں، شوخیِ افکارِ من است

۴- ازفسوں کاری دل، سیر وسکوں، غیب وحضور — ایں کہ غماز وکشایندۂ اسرارِ من است
۵- آں جہانے کہ درو کاشتہ را می دروند — نور و نارش ہمہ از سبحہ وزنارِ من است
۶- سازِ تقدیرم و صد نغمہ پنہاں دارم — ہر کجا زخمہ اندیشہ رسد تارِ من است
۷- اے من از فیض تو پایندہ! نشانِ تو کجاست؟ — ایں دو گیتی اثر ماست، جہانِ تو کجاست؟

۱- یہ جہان کیا چیز ہے؟ یعنی اس کی حقیقت کیا ہے؟ یہ درحقیقت میرے احساس کا ایک بت خانہ ہے۔ اس کا جلوہ میری بیدار آنکھوں کا مرہون منت ہے۔ گویا اس کی اپنی کوئی حقیقت نہیں۔ میں اسے اپنی ظاہری آنکھوں سے دیکھتا ہوں تو اس کا وجود ہے، ورنہ کچھ بھی نہیں ہے۔

۲- تمام آفاق یا پوری کائنات جسے میں ایک نگاہ سے پکڑ لیتا ہوں یعنی جو میری ایک نگاہ میں سمٹ آتی ہے، وہ ایک دائرہ ہے جو میری پرکار کی گردش کے باعث ہے۔ گویا دائرہ جس طرح پرکار سے بنتا ہے، اسی طرح یہ کائنات میرے ادراک کا نتیجہ ہے۔

۳- کائنات کا وجود اور عدم میرے دیکھنے اور نہ دیکھنے کے باعث ہے۔ اسے دیکھوں تو وجود ہے، نہ دیکھوں تو وہ عدم ہے۔ کیا زمان اور کیا مکاں یہ سب میرے افکار کی شوخی کا باعث ہیں۔ گویا میرے افکار نے ان تصورات کو وجود دیا ہے ورنہ ان کی کوئی حقیقت نہیں۔

۴- اس کائنات کا سکون وثبات وحرکت اور غیب وحضور جو کچھ بھی ہے، سب دل کی کرشمہ سازی ہے۔ یہ دل وہ ہے جو میرے رازوں کو ظاہر کرنے اور غمازی کرنے والا ہے یعنی یہ بتاتا ہے کہ اصل حقیقت تو تو (انسان) ہے، باقی جو کچھ خارج میں نظر آتا ہے اس کا کوئی وجود نہیں۔

۵- وہ دنیا کہ جس میں ہم جو بوتے ہیں وہی کاٹتے ہیں، اس کا نور (جنت) اور اس کی آگ (دوزخ) سب میری تسبیح اور زنار کا نتیجہ ہے یعنی جس طرح کے ہمارے اعمال ہوں گے، آخرت میں انہی کے مطابق ہماری جزا وسزا ہوگی۔

۶- میں تقدیر کا ساز ہوں اور مجھ میں سینکڑوں نغمے پوشیدہ ہیں، جہاں کہیں بھی فکر کی مضراب پہنچتی/لگتی ہے، وہ میرے ہی ساز کا تار ہوتا ہے۔ گویا ساری کائنات اور اس کے مظاہر یا عناصر فطرت میرے ہی فکر کا کرشمہ ہیں۔

۷- اے (ذات اقدس) میں تیرے فیض ہی سے صاحب بقا ہوں (جسے روحانی موت

نہیں ہے) لیکن تو خود کہاں ہے؟ یہ دونوں جہان میرے اثر کے باعث میری فکر کے نقش و نگار ہیں لیکن تیرا جہان کہاں ہے؟ (اس کا جواب گویا یہی بنتا ہے کہ وہ عرش سے بھی پرے اور حجاب میں ہے)

غزل-۱۳

۱- فصل بہارایں چنیں، بانگ ہزاراین چنیں	چہرہ کشا غزل سرا بادہ بیار ایں چنیں
۲- اشک چکیدہ ام ببیں ہم بہ نگاہِ خود نگر	ریز بہ نیستان من برق وشرار ایں چنیں
۳- بادِ بہار را بگو پے بخیال من برد	وادی و دشت را دہد نقش و نگار ایں چنیں
۴- زادہٗ باغ و راغ را از نفسم طراوتے	در چمن تو زیستم با گل و خار ایں چنیں
۵- عالم آب و خاک را بر محک دلم بسائے	روشن و تارِ خویش را گیر عیار ایں چنیں
۶- دل بکسے نباختہ با دو جہاں نساختہ	من بحضور تو رسم' روزِ شمار ایں چنیں
۷- فاختہ کہن صفیر نالہٗ من شنید و گفت	کس نہ سرود در چمن نغمہٗ پار ایں چنیں

۱- موسم بہار اس قسم کا اور بلبلوں کا نغمہ/ چہچہا اس طور کا یعنی دونوں میں بڑی دل کشی ہے۔ تو بھی (اے محبوب) اپنے چہرے سے پردہ ہٹا' غزل چھیڑ اور ایسی شراب لا/ پلا جو اس ماحول کے موافق ہو۔ اس دل کش ماحول میں اپنے جلوے سے مجھے نواز کر میرے لیے مزید دل کشی کا سامان کر دے۔

۲- تو میرے ٹپکے ہوئے آنسوؤں کو دیکھ اور اپنی نگاہ/ نگاہ کرم سے بھی دیکھ۔ میرے سرکنڈوں کے جنگل میں اس طرح برق و شرر پھینک' یعنی میری عشق سے خالی خشک اور بے کیف زندگی کو اپنے دیدار یا جلووں سے کچھ اس طرح متاثر فرما کہ میں تیرے عشق میں فنا ہو جاؤں۔

۳- موسم بہار کی ہوا سے فرما کہ وہ میرے خیال کا سراغ لگائے یعنی معلوم کرے اور اس طرح وادی اور بیابان کو نقش و نگار سے آراستہ کرے۔ گویا میرے نظریات و افکار سے دنیا کے باغ کو روشناس کر کے رونق کا سامان کرے۔

۴- باغ اور سبزہ زار میں پیدا ہونے والی ہر شے (پھول اور سبزہ وغیرہ) میں نمی و شادابی میرے دم سے ہے۔ میں نے تیرے چمن (دنیا) میں گل اور کانٹے سے اس طرح

زندگی بسر کی ہے' مطلب یہ کہ ہر اچھے برے سے نباہ کیا ہے اور دوست اور دشمن ہر ایک سے محبت کی ہے۔

۵- اس آب و خاک کی (مادی) دنیا کو میرے دل کی کسوٹی پر لگا اور روشن اور تاریک (اعمال و افکار) کو جانچنے پرکھنے کا اس طرح کا معیار قائم کر۔ مطلب یہ کہ میرا دل ایک مومن کا دل ہے تو حق و باطل اور نیکی و بدی کی جانچ پرکھ اس کے مطابق فرما۔

۶- میں روز قیامت تیرے حضور اس طرح یا اس صورت میں حاضر ہوں گا کہ دنیا میں میں نے نہ تو کسی کو (سوائے تیرے) دل دیا اور نہ دونوں جہانوں سے کوئی موافقت کی یعنی میری تمام تر توجہ تیری ذات کی طرف رہی اور میرا سارا عشق تیری ہی ذات سے رہا۔

۷- (جب باغ میں) ایک پرانی چہچہاہٹ والی فاختہ نے میرا نالہ و فریاد سنا تو بولی کہ چمن میں کسی نے (آج تک) ماضی کا نغمہ اس طرح نہیں گایا یعنی میں نے جو شاعری کی ہے وہ عام ڈگر سے ہٹ کر ہے اور اس میں میں نے اپنے اسلاف کے حقائق و معارف پیش کیے ہیں۔

غزل-۱۴

۱- بروں کشید ز پیچاک ہست و بود مرا | چہ عقدہ ہا کہ مقام رضا کشود مرا

۲- تپید عشق و دریں کشت نابسامانے | ہزار دانہ فرو کرد تا درود مرا

۳- ندانم ایں کہ نگاہش چہ دید درخاکم | نفس نفس بعیار زمانہ سود مرا

۴- بانے از خس وخاشاک درمیاں انداخت | شرارۂ دلکے دادو آزمود مرا

۵- پیالہ گیرز دستم کہ رفت کار از دست | کرشمہ بازی ساقی زمن ربود مرا

۱- مجھے تسلیم و رضا کے مقام نے ہستی اور نیستی کے چکر سے نکال دیا۔ اس (مقام) نے میری کیسی کیسی گتھیاں کھول دیں' میری مشکلات حل کر دیں۔ خدا کی ہر بات کو برضا و رغبت قبول کرنے سے میں دنیاوی جھنجٹوں سے نجات پا گیا۔

۲- عشق تڑپا اور اس نے اس بے سروسامان کھیت (جس میں کوئی فصل نہیں اگتی) میں کوئی ہزار بیج بوئے تب کہیں جا کر میری فصل کاٹی یا مجھے کاٹا۔ تخلیق آدم و کائنات کی

طرف اشارہ ہے۔ پہلے صرف خدا تھا' اس نے کائنات تخلیق کی اور اس میں زندگی نے جمادات' نباتات اور حیوانات کی صورت میں کئی مرحلے طے کیے۔ تب کہیں یہ زندگی آدم کی صورت میں نمایاں ہوئی۔

۳۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس (محبوب) کی نگاہ نے میری خاک (جسم) میں کیا دیکھا کہ اس نے میرے ہر ہر سانس پر مجھے زمانے کی کسوٹی پر پرکھا جانچا یعنی یہ جاننے کے لیے کہ میں (انسان) اس کا عظیم شاہکار ہونے کے لائق بھی ہوں یا نہیں' اس خالق نے مختلف صورتوں میں میری آزمایش کی۔ گویا انسان کی زندگی کا ہر ہر لحہ اس کے لیے امتحان و آزمایش کا لحہ ہے۔

۴۔ اس خالق نے خس و خاشاک کا ایک جہان درمیان میں رکھ دیا اور پھر مجھے ایک چھوٹے سے دل کی چنگاری دے کر مجھے آزمایا۔ یہ دنیا گویا کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتی گویا خس و خاشاک کے برابر ہے۔ مجھے دل دے کر یوں آزمایا کہ یہ اس جہان کو تسخیر کرتا اور اپنے تابع کرتا یا خود اس میں کھو جاتا اور اس کا تابع ہو جاتا ہے۔

۵۔ میرے ہاتھ سے پیالہ پکڑ لے کیونکہ میرا معاملہ ہاتھ سے نکل گیا ہے (مجھے خود پر قابو نہیں رہا) اس لیے کہ ساقی کے ناز و ادا نے مجھے مجھ سے اچک/اڑا لیا ہے۔ گویا محبوب حقیقی کے جلووں نے مجھے کچھ اس طرح محو کر رکھا ہے کہ مجھے اپنا کوئی ہوش نہیں۔ بقول سوداؔ:

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ
ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

غزل-۱۵

۱۔ خیز و بخاکِ تشنہ ئے بادۂ زندگی فشاں | آتش خود بلند کن آتش ما فرونشاں

۲۔ میکدۂ تہی سبو حلقۂ خود فراموشاں | مدرسۂ بلند بانگ بزم فسردہ آتشاں

۳۔ فکر گرہ کشا غلام دیں برواتے تمام | زانکہ درونِ سینہ ہا دل ہدفے است بے نشاں

۴۔ ہر دو بمنزلے رواں ہر دو امیر کارواں | عقل بحیلہ می برد عشق برد کشاں کشاں

۵۔ عشق زپا در آورد خیمۂ شش جہات را | دست دراز می کند تا بہ طناب کہکشاں

۱- اٹھ اور ایک پیاسی مٹی (جسم انسانی) پر زندگی کی شراب چھڑک۔ اپنی آگ کو تیز کر اور ہماری آگ بجھا دے یعنی ہمیں اپنے عشق کے جذبوں سے سرشار کر دے اور ہمیں نفس کی آگ سے نجات دلا کر حقیقی زندگی سے نواز۔

۲- آج کے میخانے کی صراحیاں خالی اور اس میں موجود رندوں کا حلقہ اپنی معرفت/خودی سے بے خبر ہے جبکہ آج کا مدرسہ (علم وفن اور خرد سے آگاہی کے) بلند بانگ دعوے کرتا ہے لیکن اس کی محفل بجھی ہوئی آگ والوں کی محفل ہے۔ گویا آج کے صوفیوں کی خانقاہیں معرفت کی شراب سے خالی ہیں اور مدرسہ ایک ایسی محفل ہے جس میں شریک لوگ جذبہ عشق سے خالی ہیں۔

۳- (اس دور کے مسلمانوں کی) فکر یا فلسفہ دوسری قوموں کا غلام ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان سینوں میں دل ایک ایسا ہدف ہے جس کا کوئی نشان نہیں۔ مطلب یہ کہ وہ مغربی فکر وتہذیب سے متاثر ہو کر اسی کی پیروی میں لگے ہوئے ہیں اور یوں وہ اپنے اسلامی تشخص اور فکر سے دور ہو گئے ہیں اور وہ اس جذبہ عشق سے محروم ہو چکے ہیں جن سے ان کے دل کبھی معمور رہتے تھے۔

۴- دونوں (عقل اور عشق) ایک منزل کی طرف چل رہے ہیں اور دونوں اپنے اپنے قافلہ کے سالار ہیں لیکن اس فرق کے ساتھ کہ عقل تو حیلوں بہانوں اور مصلحتوں سے آگے بڑھتی ہے جبکہ عشق ان سب باتوں سے بے نیاز ہو کر آدمی کو منزل (محبوب حقیقی تک رسائی) کی طرف تیزی سے لیے جاتا ہے۔

۵- عشق تو چھ طرفوں والے خیمہ یعنی زمان ومکان کے خیمے کو گرا دیتا ہے۔ وہ کہکشاں کی رسی تک اپنا ہاتھ لے جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ عشق نہ صرف اس کائنات کو تسخیر کر کے اپنے تابع کرتا ہے بلکہ اس سے ماورا عالم علوی کو بھی مسخر کر لیتا ہے۔

غزل-۱۶

۱- تو بایں گماں کہ شاید سرِ آستانہ دارم ‏ ‏ بطوافِ خانہ کارے بخدائے خانہ دارم

۲- شررِ پریدہ رنگم مگذر زجلوۂ من ‏ ‏ کہ بتاب یک دو آنے تب جاودانہ دارم

۳- نگنم دگر نگاہے بہ رہے کہ طے نمودم ‏ ‏ بسراغ صبح فردا روشِ زمانہ دارم

۴- یم عشق کشتی من، یم عشق ساحل من   نہ غم سفینہ دارم، نہ سرِ کرانہ دارم
۵- شررے فشاں ولیکن شررے کہ وانسوزد   کہ ہنوز نونیازم، غم آشیانہ دارم
۶- بامید ایں کہ روزے بشکار خواہی آمد   زکمند شہریاراں رم آہوانہ دارم
۷- تو اگر کرم نمائی بمعاشراں بہ بخشم   دوسہ جامِ دل فروزے زمے شبانہ دارم

۱- (مجھے کعبہ کے طواف میں مصروف دیکھنے والے) تو اس گمان میں ہے کہ شاید میری آرزو کا ہدف/مقصد بیت اللہ ہے یعنی یہ گمان غلط ہے۔ اس لیے کہ میرا بنیادی مقصد خدا کا گھر نہیں بلکہ خود خدا ہے۔ اس تک رسائی میرا اصل مقصد ہے۔

۲- میں ایک اُڑے ہوئے رنگ والی چنگاری ہوں (جس کا باعث تیری جدائی ہے) تو مجھے اپنا جلوہ دکھائے بغیر آگے مت جا، اس لیے کہ تیرے دیدار کے ایک دو لمحوں کی گرمی و حرارت سے میں سوزِ دوام حاصل کرلوں گا۔

۳- میں جو راستہ (ایک مرتبہ) طے کرلیتا ہوں، پھر پلٹ کر اس پر نگاہ نہیں ڈالتا (ادھر نہیں آتا) آنے والی صبح کے سراغ میں میری روش بالکل زمانے کی سی ہے۔ گویا جس طرح زمانہ آگے بڑھتا اور کبھی پیچھے نہیں ہٹتا (جو دن گذر گیا سو گذر گیا، وہ پھر نہیں آئے گا) میں بھی ماضی کی فکر کرنے کی بجائے مستقبل پر نظر رکھتا ہوں۔

۴- عشق کا سمندر ہی میری کشتی اور بحرِ عشق ہی میرا ساحل ہے (چنانچہ مجھے نہ تو کشتی ہی کا کوئی غم ہے اور نہ کنارے/ساحل ہی کی مجھے کوئی آرزو ہے۔ میرا سب کچھ عشق ہی ہے۔

۵- اے محبوب حقیقی تو مجھ پر (اپنے جلوے کی) چنگاری پھینک لیکن ایسی چنگاری جو مجھے بالکل ہی نہ جلا دے، اس لیے کہ میں ابھی تیرا نیا نیا نیاز مند بنا ہوں اور مجھے اپنے آشیانے کا غم ہے۔ میں تیرے عشق میں نو آموز ہوں، تو مجھے اپنے عشق میں فنا ضرور کر لیکن چونکہ میں ابھی دنیا سے بالکل بے نیاز نہیں ہوا، اس سے بھی کچھ تعلق رکھے ہوئے ہوں، اس لیے میری ہمت کو پیش نظر رکھتے ہوئے مجھے آہستہ آہستہ فنا کر۔

۶- اس امید پر کہ تو ایک نہ ایک روز مجھے شکار کرنے آئے گا، میں بادشاہوں کی کمند سے ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرتا ہوا نکل آیا ہوں یعنی اے محبوب حقیقی میری یہ آرزو ہے کہ میں تیرا غلام/عاشق بن جاؤں۔ مجھے بادشاہوں اور ان کے درباروں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے دنیاوی شان و شوکت کی کوئی خواہش نہیں۔ اس شعر کا پہلا مصرع

امیر خسرو کا ہے۔ پورا شعر یوں ہے:

ہمہ آہوانِ صحرا سر خود نہادہ برکف
بامید ایں کہ روزے بشکار خواہی آمد

(صحرا کے تمام ہرنوں نے اپنے سر ہتھیلیوں پر رکھے ہوئے ہیں......)

۷- اے خدا! اگر تو مجھ پر کرم فرمائے تو میں اپنی رات کی محفل سے بچی ہوئی شراب کے دلفروز دو تین پیالے اپنے دوستوں اور ہم صحبتوں کو بھی عطا کر دوں یعنی میں نے اپنے اسلاف کی اقدار کی جو دولت بچا رکھی ہوئی ہے وہ میں اپنی شاعری کے ذریعے آج کے لوگوں میں یا دوستوں میں بھی بانٹ دوں (ان کو ان اقدار سے آگاہ کر دوں) تاکہ وہ پہلے مسلمانوں کی سی معاشرتی زندگی بسر کریں جو لاجواب اور انسانیت سے بھرپور تھی۔

غزل-۱۷

۱- نظر بہ راہ نشیناں سوارہ می گذرد — مرا بگیر کہ کارم زچارہ می گذرد
۲- بہ دیگراں چہ سخن گسترم ز جلوۂ دوست — بیک نگاہ مثال شرارہ می گذرد
۳- رہے بمنزلِ آں ماہ سخت دشوار است — چناں کہ عشق بدوش ستارہ می گذرد
۴- ز پردہ بندیٔ گردوں چہ جائے نومیدی است — کہ ناوک نظر ماز خارہ می گذرد
۵- یمے است شبنم ما کہکشاں کنارۂ اوست — بیک شکستن موج از کنارہ می گذرد
۶- بخلوتش چو رسیدی نظر باو مکشا — کہ آں دمے است کہ کار از نظارہ می گذرد
۷- من از فراق چہ نالم کہ از ہجوم سرشک — زراہِ دیدہ دلم پارہ پارہ می گذرد

۱- گھوڑے پر سوار محبوب، راستے میں بیٹھے ہوئے عاشقوں پر بے نیازانہ نظر ڈالتے ہوئے گذر رہا ہے۔ مجھے سنبھالو کہ میرا کام میرے بس میں نہیں رہا۔ عاشق پر مدہوشی طاری ہو رہی ہے۔ سوداؔ نے یوں کہا ہے:

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ
ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

۲- میں دوسروں سے محبوب کے جلوے کی کیا بات کروں کہ وہ تو ایک نگاہ میں چنگاری کی

طرح گذر جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ محبوب حقیقی کا جلوہ کائنات میں کچھ اس کثرت اور انداز میں ہے کہ انسانی نگاہ اس کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔ جیسا کہ بقول سعدی شیرازی:

برگِ درختانِ سبز پیش خداوند ہوش
ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

۳- اس چاند/محبوب حقیقی تک رسائی کا راستہ بہت دشوار ہے، بس یوں سمجھو کہ اس مقصد کے لیے عشق کو ستاروں کے کندھوں پر سے گذرنا پڑتا ہے یا یہ کہ عشق کی منزل ستاروں سے بھی ماوراء ہے۔ علامہ ہی کے بقول:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
مگر عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

۴- (محبوب کو چھپانے کی خاطر) آسمان نے جو پردہ بندی کر رکھی ہے، وہ عاشق کے لیے ناامیدی کی بات نہیں، اس لیے کہ ہماری نظروں (نگاہ عشاق) کا تیر تو سخت پتھر سے بھی گذر جاتا ہے، گویا یہ پردے کیا ہیں، عاشق تو اس محبوب کو عرش پر، جوان آسمانی پردوں کے اس پار ہے، دیکھ سکتا ہے یا دیکھ لے گا۔

۵- ہماری شبنم ایک سمندر ہے اور کہکشاں اس سمندر کا ساحل ہے۔ وہ موج کی ایک شکست (ٹوٹ جانا) سے ساحل سے گذرتی ہے۔ غالباً یہ مراد ہے کہ انسان گویا ایک قطرۂ شبنم ہے، اگر وہ عشق اختیاری سے خود کو سمندر یعنی محبوب حقیقی سے ملا دے تو اس میں سمندر کی سی کیفیت پیدا ہو جائے، یعنی وہ خدائی صفات کا مظہر بن جائے۔

۶- جب تو اس (محبوب حقیقی) کی خلوت میں پہنچے تو اس پر نگاہ نہ ڈال، اس لیے کہ یہ وہ موقع/لمحہ ہے جب کام نظارے سے گذر جاتا ہے۔ گویا اس خلوت میں پہنچنے پر عاشق پر ایک عجیب کیفیت و مستی چھا جاتی ہے اور اسے محبوب پر نظر ڈالنے کا ہوش نہیں رہتا۔

۷- میں اس محبوب کے ہجر پر کیا نالہ و زاری کروں/ روؤں کہ آنسوؤں کی کثرت کے باعث میرا دل آنکھوں کے راستے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گذر رہا ہے یا گذر جاتا ہے۔ اس صورت حال میں ہجر و فراق پر نالہ و زاری کرنے کی بات ہی نہیں بن پاتی۔

غزل-۱۸

۱- بر عقل فلک پیما ترکانہ شبیخوں بہ | یک ذرۂ دردِ دل از علم فلاطوں بہ
۲- دی مغ بچۂ با من اسرارِ محبت گفت | اشکے کہ فرو خوردی از بادۂ گلگوں بہ
۳- آں فقر کہ بے تیغے صد کشورِ دل گیرد | از شوکت دارابہ، از فر فریدوں بہ
۴- در دیر مغاں آئی مضمون بلند آور | در خانقہ صوفی افسانہ و افسوں بہ
۵- در جوئے روانِ ما، بے منت طوفانے | یک موج اگر خیزد آں موج زجیحوں بہ
۶- سیلے کہ تو آوردی در شہر نمی گنجد | ایں خانہ برانداز ے درخلوت ہاموں بہ
۷- اقبال غزل خواں را کافرنتواں گفتن | سودا بدماغش زد از مدرسہ بیروں بہ

۱- آسمانوں پر چلنے والی عقل پر بہادروں کا ساشبخوں مارنا ہی بہتر ہے۔ دل کے درد کا ایک ذرہ افلاطون جیسے فلسفی کے علم سے زیادہ اچھا ہے یعنی ضروری ہے کہ عقل کو عشق کے تابع کیا جائے کیونکہ اس کے مقابلے میں معمولی یا ذرا سا عشق بھی بہتر ہے۔

۲- کل ایک مغ بچہ نے مجھ سے محبت کے اسرار بیان کیے اور وہ یہ کہ وہ آنسو جو تو غم عشق میں پیتا ہے وہ گلاب کے رنگ کی (سرخ) شراب سے بہتر ہیں۔ گویا عاشق کے لیے محبوب کے غم میں بھی ایک خاص لذت و سرشاری ہے۔

۳- وہ فقر جو کسی تلوار کے بغیر ہی سینکڑوں دلوں پر قبضہ کر لیتا ہے/ فتح کر لیتا ہے، وہ بادشاہ دارا کی شان وشوکت اور فریدوں بادشاہ کی شان سے افضل ہے۔ انسانوں سے پیار محبت کر کے ان کے دل جیتنا ہی سب سے بڑی انسانیت ہے۔ مولانا رومی نے تو اس عمل کو حج اکبر کا نام دیا اور ایک دل کو ہزاروں کعبوں سے بہتر کہا ہے:

دل بدست آور کہ حج اکبر است
از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

ایک پنجابی صوفی کے بقول:

ع یار دی گلی دے کُتے سینے نال لانداں جائیں

یعنی اللہ کی مخلوق سے پیار کرو۔

۴- اگر تو کسی مغاں کے مندر میں آئے یعنی کسی مردِ حق کی صحبت تجھے میسر آئے تو بلند مقصد اور حوصلے لے کر آ۔ البتہ اگر کسی صوفی کی خانقاہ میں تو آئے تو وہاں الٹی سیدھی اور

جنتر منتر کی باتیں ہی بہتر ہیں۔ گویا مردِ حق کی صحبت میں حق پرستی اور عشق حقیقی کا ماحول ہوتا ہے جبکہ آج کل کے کاروباری اور فریب کار صوفی کی خانقاہ میں مادیت پرستی پر ہی زور ہوتا ہے۔

۵- ہماری بہتی ہوئی ندی میں اگر کسی طوفان کا احسان اٹھائے بغیر ایک لہر بھی اٹھ جائے تو وہ دریائے جیحوں کی موج سے افضل ہے یعنی دوسروں کا احسان اٹھا کر اپنے معمولی کام یا معمولی حالت کو بڑا بنانے سے بہتر ہے کہ آدمی اپنی ہمت سے ایک چھوٹا سا کام ہی کر لے۔ غالب نے اس انداز میں بات کی ہے:

تشنہ لب برساحل دریا ز غیرت جاں دہم
گرگماں افتد بہ موجش چین پیشانی مرا

شاد عظیم آبادی کا یہ شعر گویا غالبؔ کے شعر کا ترجمہ ہے:

خوش ہیں گر تشنہ لبی نے یونہی مارا ہم کو
چین ابرو نہیں دریا کی گوارا ہم کو

یا:

کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں
احسان ناخدا کا اٹھائے مری بلا

۶: وہ سیلاب جو تو لایا ہے وہ شہر میں نہیں سماتا/ سما سکتا۔ یہ گھر ویران/ برباد کرنے والا سیلاب صحرا ہی میں رہے/ چلے تو بہتر ہے۔ علامہ نے اپنے حوالے سے بات کی ہے۔ مطلب یہ کہ ان کی شاعری کو دنیادار قسم کے لوگ سمجھنے یا برداشت کرنے سے قاصر ہیں' اس لیے بہتر یہی ہے کہ یہ سیلاب/ شاعری تیرے دل کی وسعت میں سمایا رہے/ سمائی رہے۔

۷- غزل گو اقبال کو کافر نہیں کہا جا سکتا (یعنی اس کی شاعری میں کوئی کافرانہ پیغام نہیں ہے) پھر بھی بہتر یہی ہے کہ وہ مدرسے سے باہر رہے۔ اس لیے کہ اس کے دماغ میں عشق کا سودا/ جنون سمایا ہوا ہے اور اہل مدرسہ عشق کی بات کو کہاں سمجھ سکتے ہیں یعنی اہل عقل وخرد عشق کے جذبوں سے خالی اور انہیں سمجھنے سے قاصر ہیں۔

غزل-۱۹

۱- یا مسلماں را مدہ فرماں کہ جاں برکف بنہ یا دریں فرسودہ پیکر تازہ جانے آفریں
یا چناں کن یا چنیں

۲- یا برہمن رابفرما نو خداوندے تراش یا خود اندر سینۂ زناریاں خلوت گُزیں
یا چناں کن یا چنیں

۳- یا دگر آدم کہ از ابلیس باشد کمترک یا دگر ابلیس بہر امتحانِ عقل و دیں
یا چناں کن یا چنیں

۴- یا جہانے تازہ ے یا امتحانے تازہ ے می کنی تا چند باما آنچہ کردی پیش ازیں
یا چناں کن یا چنیں

۵- فقر بخشی؟ با شکوہِ خسروِ پرویز بخش یا عطا فرما خرد یا فطرتِ روح الامیں
یا چناں کن یا چنیں

۶- یا بکش در سینہ من آرزوئے انقلاب یا دگرگوں کن نہاداِیں زمان واِیں زمیں
یا چناں کن یا چنیں

۱- (اے ذاتِ حق) یا تو تو مسلمان کو یہ فرمان/حکم نہ دے کہ تو (مسلمان) جان ہتھیلی پر رکھ یا پھر اس کمزور/گھسے پٹے پیکر میں نئی جان پیدا کردے۔ یا تو ویسا کر یا پھر ایسا کر یعنی مسلمانوں میں جہاد کا جذبہ پھر سے پیدا کردے اور ان کے اندر پھر سے وہ پہلے والا جوش وولولہ پیدا کردے، جو آج ان میں نہیں ہے۔

۲- یا تو برہمن سے فرما کہ وہ اپنا ایک نیا خدا/بت تراش لے، یا پھر تو (خدا) ہی کافروں/ہندوؤں کے سینے میں خلوت اختیار کرلے۔ یا ویسا کر یا ایسا کر۔ گویا آج کے مسلمان اگر جذبۂ جہاد وغیرہ سے دور ہو گئے ہیں تو غیر مسلم بھی اپنے خداؤں یا خود تراشے ہوئے بتوں سے بیزار نظر آتے ہیں یا تو ان میں پھر سے بت پرستی کا خلوص پیدا فرما دے یا پھر ان کے سینوں میں اتر کر کچھ ایسی کیفیت پیدا کردے کہ وہ بت پرستی کی بجائے توحید پرستی اختیار کرلیں۔

۳- یا تو کوئی نیا آدم تخلیق کر جو ابلیس سے کمتر ہو، یا پھر عقل ودیں کی آزمائش کے لیے کوئی نیا ابلیس تخلیق کر۔ یا ویسا کر یا ایسا کر یعنی آج کا انسان اپنے کردار کی بنا پر ابلیس سے

آگے نکل گیا ہے جبکہ دین اور عقل کی باتوں کو بھی نئے انداز سے جانچا جا رہا ہے جو ابلیسی انداز سے بھی بڑھ کر ہے۔

۴- یا کوئی نئی دنیا تخلیق کر یا کوئی نئی آزمایش اس (جہان) کے لیے رکھ۔ آخر تو ہمارے ساتھ کب تک وہ کچھ کرتا رہے گا، جو اس سے پہلے تو نے کیا ہے۔ یا ویسا کر یا ایسا کر۔ مطلب یہ کہ ہر زمانے میں انسان اور شیطان کی آویزش کچھ ایک ہی ڈھب کی رہی ہے۔ تو یا تو آزمایش کا طریقہ بدل یا پھر دنیا ہی کو بدل دے۔

۵- کیا تو فقر بخشے گا؟ یا اگر تو فقر بخشتا ہے تو ایسا فقر عطا کر جس میں خسرو پرویز کی سی شان وشوکت ہو یا پھر ہمیں ایسی خرد عطا فرما جس میں حضرت جبرئیل کی فطرت کا انداز ہو، جو اللہ کے نازل کردہ پیام قرآن سے رہنمائی حاصل کرے۔

۶- یا تو تو میرے سینے میں انقلاب کی جو آرزو ہے اسے ختم کر دے یا پھر اس زمین و زماں کی فطرت بدل دے۔ یا ویسا کر یا ایسا کر یعنی آج کے دور میں جو انسانیت سے دور ہے، زبردست تبدیلی کی ضرورت ہے جس کی میں آرزو لیے ہوئے ہوں، اگر میری یہ آرزو پوری نہیں ہوتی تو پھر آج کے اس دور ہی کو بدل ڈال۔

غزل-۲۰

۱- عقل ہم عشق است واز ذوق نگہ بیگانہ نیست ... لیکن این بیچارہ را آں جرأت رندانہ نیست

۲- گرچہ می دانم خیال منزل ایجاد من است ... در سفر از پا نشستن ہمت مردانہ نیست

۳- ہر زماں یک تازہ جولانگاہ می خواہم ازو ... تا جنوں فرمائے من گوید دگر ویرانہ نیست

۴- باچنیں زورِ جنوں پاس گریباں داشتم ... در جنوں از خود نرفتن کارِ ہر دیوانہ نیست

۱- عقل بھی عشق ہی ہے اور وہ بھی ذوقِ نگاہ سے بیگانہ نہیں ہے لیکن اس بیچاری میں عشق کی سی جرات رندانہ نہیں ہے یعنی وہ دلیلوں ہی میں کھوئی رہتی ہے اور کوئی بڑا اقدم نہیں اٹھاتی۔ علامہ ہی کے بقول:

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

۲- اگر چہ مجھے یہ علم ہے کہ منزل کا خیال میرا اپنا ایجاد کردہ ہے لیکن سفر میں تھک ہار کر بیٹھ

جانا دلیروں کی ہمت کے خلاف ہے۔ منزل کی تلاش اور اس کے لیے سفر جاری رہنا چاہیے، رکنا کم ہمتی ہوگی۔ یا یہ کہ جہد و عمل جاری رہنا چاہیے۔

۳۔ میں ہر گھڑی/لمحہ اس (خدا) سے ایک نئی جولاں گاہ کی آرزو کرتا ہوں، تا آنکہ مجھے جنون عطا فرمانے والا یہ کہہ دے کہ اب کوئی ویرانہ نہیں رہا۔ میں اس خالق سے جنون کی انتہا کا آرزومند ہوں۔

۴۔ ایسے جنون کی شدت کے باوجود میں نے اپنے گریباں کا لحاظ رکھا/خیال کیا یعنی گریبان نہیں پھاڑا۔ جنون کی حالت میں اپنے ہوش وحواس نہ کھونا ہر کسی دیوانے کا کام نہیں ہے۔ غالباً یہ مراد ہے کہ جذبۂ عشق کی سرشاری میں بھی میں نے عقل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور یہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔

غزل-۲۱

۱۔ سوز و گدازِ زندگی لذت جستجوئے تو | راہ چو مار می گزد گر نروم بسوئے تو
۲۔ سینہ کشادہ جبرئیل از بر عاشقاں گذشت | تا شررے باوفتد آتشِ آرزوئے تو
۳۔ ہم بہوائے جلوہ ے پارہ کنم حجاب را | ہم بنگاہِ نارسا پردہ کشم بروئے تو
۴۔ من بتلاش تو روم یا بتلاش خود روم | عقل و دل و نظر ہمہ گم شدگانِ کوئے تو
۵۔ از چمن تو رستہ ام قطرۂ شبنمے بہ بخش | خاطر غنچہ واشود کم نشود ز جوئے تو

۱۔ زندگی میں جو سوز و گداز ہے، وہ تیری (خدا کی) تلاش و جستجو کی لذت کے باعث ہے۔ اگر میں تیری طرف نہ چلوں تو راستہ سانپ کی طرح مجھے ڈستا ہے۔ گویا تجھ تک رسائی کے لیے کوشش کرنے میں بہت لذت ہے، بصورت دیگر یہ زندگی کاٹنے کو دوڑتی ہے۔

۲۔ جبرئیلؑ اپنا سینہ کھولے ہوئے عاشقوں کے پہلو سے گذر گیا تا کہ اس میں تیری آرزو کی آگ کی ایک چنگاری پڑ جائے، گویا انسانوں میں آرزو کی شدت ہے جبکہ فرشتے اس آرزو سے محروم ہیں/خالی ہیں۔

۳۔ میں تیرے ایک جلوے کی خواہش میں تیرے چہرے پر پڑے پردے کو بھی پھاڑ رہا ہوں اور ساتھ ہی اپنی نارسا نگاہ سے تیرے چہرے پر پردہ ڈال بھی رہا ہوں یعنی

عاشق کو اس محبوب حقیقی کے دیدار کی خواہش تو ہے لیکن اس میں وہ تاب نہیں کہ اسے کھل کر دیکھ سکے۔

۴- میں تیری تلاش میں نکلوں/ جاؤں یا اپنی تلاش میں جاؤں (کچھ سمجھ نہیں آتا کیونکہ) میری عقل و دل اور نگاہ سبھی تیرے کوچے میں گم ہو کے رہ گئے ہیں یعنی تیرے دیدار کی خواہش میں مجھے اپنا ہوش نہیں رہتا۔

۵- میں تیرے ہی (اے خدا) چمن سے اگا ہوا ہوں' مجھے شبنم کا ایک قطرہ عطا فرما دے (اس سے یہ ہوگا کہ) غنچہ کا دل تو کھل جائے گا لیکن تیری ندی/ نہر کے پانی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔ میں تیرا بندہ ہوں مجھ پر نظر کرم فرما' اس سے تیرا کیا بگڑ جائے گا۔

غزل-۲۲

۱- دریں محفل کہ کارِ او گذشت از بادہ و ساقی — ندیمے کو کہ در جامش فرو ریزم مے باقی

۲- کسے کو زہر شیریں می خورد از جام زرینے — مے تلخ از سفال من کجا گیرد بہ تریاقی

۳- شرار از خاک من خیزد' کجا ریزم' کرا سوزم — غلط کردی کہ در جانم فگندی سوزِ مشتاقی

۴- مکدر کرد مغرب چشمہ ہائے علم و عرفاں را — جہاں را تیرہ تر سازد چہ مشائی چہ اشراقی

۵- دل گیتی! ''انا المسموم انا المسموم'' فریادش — خرد نالاں کہ ما عندی بتریاق ولا راقی

۶- چہ ملائی' چہ درویشی' چہ سلطانی چہ دربانی — فروغ کار می جوید بسالوسی و زراقی

۷- بیازارے کہ چشم صیرفی شوراست و کم نوراست — نگینم خوارتر گردد چو افزاید بہ براقی

۱- اس محفل میں کہ جس میں معاملہ شراب اور ساقی سے گذر چکا ہے (کوئی پینے والا نہیں رہا) کوئی ایسا ہمدم/ ساتھی کہاں ہے جس کے پیالے میں میں بچی ہوئی شراب ڈالوں یعنی میں اس عشق کے جذبوں سے سرشار ہوں جس سے کبھی ہمارے اسلاف سرشار تھے۔ افسوس کہ آج ایسا کوئی انسان یا ایسی شراب کا خواہشمند نظر نہیں آتا جسے میں پلاؤں' اس میں عشق کے جذبے پیدا کروں۔

۲- وہ شخص جو سونے کے پیالے میں شیریں/ میٹھا زہر پیتا ہے' وہ بھلا میرے مٹی کے پیالے سے ایسی تلخ شراب کیونکر لے گا جو زہر کا اثر دور کرتی ہے۔ پہلے مصرعے میں آج کے لوگوں کی نفس پرستی اور عیش و عشرت کے حوالے سے بات کی ہے جو گویا

سونے کے پیالے میں میٹھے زہر کی صورت ہے یعنی انسانیت کے جذبوں کو ختم کر دینے والا زہر۔ اپنی شاعری کو مٹی کا پیالہ اور اس میں موجود پیام عشق کو' جو اسلاف کی سب سے بڑی دولت تھا' بچی ہوئی شراب کے استعارے میں بیان کیا ہے یعنی آج کے انسان جو بری طرح مادیت پرستی میں کھو چکے ہیں' وہ عشق کے جذبوں کو ابھارنے والی میری شاعری پر کیا توجہ دیں گے' ایک طرح سے اظہار مایوسی ہے۔

۳- میری خاک سے (عشق کی) چنگاریاں اٹھ رہی ہیں' میں انہیں کہاں ڈالوں/گراؤں اور کسے جلاؤں۔ (اے خدا) تو نے غلط کیا کہ جو میری جان میں سوز مشتاقی پیدا کر دیا یعنی مجھ میں تو نے جو عشق کا سوز ڈالا ہے یا مجھے عشق کے جن جذبوں سے سرشار کیا ہے' آج کوئی بھی انہیں سننے اور اپنانے والا نہیں ہے۔ میری ایسی شاعری کا اثر لینے والا کوئی نہیں۔

۴- مغرب/یورپ نے علم و عرفاں کے چشمے کو آلودہ کر دیا ہے' چنانچہ خواہ وہ مشائی ہے یا اشراقی' دونوں قسم کے افکار و علوم دنیا میں (جذبوں کی) تاریکی پھیلا رہے ہیں یعنی ان سے دماغ تو روشن ہو رہے ہیں (اگرچہ یہ روشنی باطل اوہام کی ہے) لیکن دل عشق کے جذبوں سے خالی ہو گئے ہیں۔

۵- یزید ابن معاویہؒ کا ایک شعر ہے جس میں وہ کہتا ہے کہ عشق کا زہر میرے اندر سرایت کر چکا ہے' میرے پاس نہ تو اس کا کوئی تریاق ہے اور نہ کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا ہی ہے' اس لیے اے ساقی جام شراب کو گردش میں لا اور مجھے شراب پلا تا کہ' یہ زہر دور ہو۔ علامہ کے اس شعر میں اسی حوالے سے بات ہوئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اہل مغرب نے آج کے دور کی یہ حالت کر دی ہے کہ دنیا کا دل ''انا المسموم' انا المسموم'' کی فریاد کر رہا ہے (یعنی مجھے اس زہر سے نجات دلاؤ) جبکہ عقل رو رہی ہے کہ میرے پاس نہ تو ایسا تریاق ہے جو اس زہر کا اثر دور کر دے اور نہ کوئی جھاڑ پھونک کر کے ہی اس زہر کا اثر دور کرنے والا ہے۔ گویا آج مغربی تہذیب و علم و فنون نے مادیت و نفس پرستی کا جو زہر پھیلایا ہے' اس کا اثر دور کرنا عقل کے بس کی بات نہیں۔ صرف عشق اور جذبہ صادق ہی اس کا توڑ کر سکے گا۔

۶- کیا ملائی' کیا درویشی اور کیا سلطانی اور کیا دربانی' یہ سبھی یعنی آج کے دور میں ہر کوئی اپنے اپنے کاروبار کو فروغ دینے کے لیے فریب کاری اور منافقت سے کام لے رہا ہے۔

۷۔ اس بازار میں، جہاں صیرفی کی آنکھ بیمار اور روشنی سے محروم ہے، میرا نگین جب اپنی چمک دمک بڑھاتا ہے تو وہ اور بھی خوار ہو جاتا ہے۔ اپنی شاعری کے حوالے سے بات کی ہے جو اپنے پیغام عشق حقیقی کے باعث بڑی قدر و قیمت والی ہے لیکن آج اسے سمجھنے اور اس کا اثر لینے والا کوئی نہیں ہے۔

غزل-۲۳

۱۔ ساقیا برجگرم شعلہ نمناک انداز ‌ ‌ ‌ دگر آشوبِ قیامت بکفِ خاک انداز

۲۔ او بیک دانہ گندم بزمینم انداخت ‌ ‌ ‌ تو بیک جرعہ آب آں سوئے افلاک انداز

۳۔ عشق رابادۂ مرد افگن و پر زور بدہ ‌ ‌ ‌ لائے ایں بادہ بہ پیمانۂ ادراک انداز

۴۔ حکمت و فلسفہ کرد است گراں خیز مرا ‌ ‌ ‌ خضرِ من! از سرم ایں بارِ گراں پاک انداز

۵۔ خرد از گرمی صہبا بگدازے نرسید ‌ ‌ ‌ چارۂ کار بآں غمزۂ چالاک انداز

۶۔ بزم در کشمکش بیم و امید است ہنوز ‌ ‌ ‌ ہمہ را بے خبر از گردشِ افلاک انداز

۷۔ می تواں ریخت در آغوش خزاں لالہ و گل ‌ ‌ ‌ خیز و بر شاخِ کہن خونِ رگِ تاک انداز

۱۔ اے ساقی! میرے جگر پر نمناک شعلہ ڈال (مجھے شراب پلا اور اس طرح) پھر میری خاک کی مٹھی یعنی جسم میں قیامت کا ہنگامہ برپا کر دے یعنی مجھے اس عشق و ایمان والی شراب پلا (مجھ میں ایسے جذبے پیدا کر دے) جو کبھی تو (خدا) نے پہلے مسلمانوں کو پلائی تھی (ان میں پیدا کیے تھے) تا کہ مجھ میں ایسا یا ان جیسا کردار و عمل پیدا ہو۔

۲۔ اس نے مجھے گندم کا ایک دانہ کھانے پر زمین پر پھینک دیا۔ تو (خدا) مجھے پانی کا ایک گھونٹ یا اپنے عشق کی شراب کا ایک گھونٹ پلا کر افلاک سے اس پار پھینک دے یعنی مجھے اپنا قرب عطا فرما۔ حضرت آدم نے جنت میں گندم کا دانہ کھا لیا تھا جس کی سزا کے طور پر انہیں زمین پر بھیج دیا گیا۔ اسی حوالے سے علامہ نے بات کی ہے۔ پاکستان بننے سے بہت پہلے ایک مزاح گو شاعر نے راشننگ سسٹم نافذ ہونے پر انجمن حمایت اسلام لاہور کے ایک سالانہ جلسے میں ''راشننگ'' پر مزاحیہ نظم کہی تھی، اس کا یہ شعر اسی واقعہ سے متعلق ہے:

ہوگا تب افسوس کیوں جنت میں گیہوں کھا لیا
حضرتِ آدم نے ناحق مول یہ جھگڑا لیا

حافظ شیرازی نے بھی دانہ گندم کے حوالے سے خوب کہا ہے۔ کہتے ہیں: میرے باپ نے روضۂ رضواں گندم کے دو دانوں کے عوض بیچ دیا۔ میں ناخلف ہوں گا اگر میں ایک جو کے عوض نہ بیچوں:

پدرم روضۂ رضواں بدو گندم بفروخت
ناخلف باشم اگر من بجوے نفروشم

دوسرا مصرع بعض ایرانی نسخوں میں یوں ہے:

''من چرا ملک جہاں راجوے نفروشم''

چونکہ علامہ کے دوسرے مصرعے میں خدا سے خطاب ہے اس لیے پہلے مصرعے میں لفظ ''او'' آدمؑ ہی سے متعلق ہوگا یعنی اس/ ان کی وجہ سے میں یعنی انسان زمین پر اتارا گیا۔

۳۔ عشق کو مردافگن اور پرزور شراب عطا کر اور اس کی تلچھٹ کو ادراک یعنی عقل کے پیانے میں ڈال دے۔ مطلب یہ کہ آج کا مسلمان بے حوصلہ و ناموس ہو چکا ہے تو پھر سے اپنے ایسے عشاق پیدا کر جو سابق مسلمانوں کے سے کارنامے انجام دیں اور عقل بھی کسی قدر جذبہ عشق سے آشنا ہو جائے۔

۴۔ حکمت اور فلسفہ نے مجھے کاہل اور آرام طلب بنا دیا ہے۔ اے میرے خضر! تو میرے سر سے یہ بوجھ پورے طور پر اتار پھینک یعنی مجھ میں جذبہ عشق پیدا کر دے تا کہ میری زندگی جہد و عمل میں گذرے۔

۵۔ عقل کی صراحی شراب کی گرمی سے نہیں پگھلی' تو اپنے خاص ناز و ادا سے اس نقصان کی تلافی کر دے یعنی عقل میں تجھ تک رسائی کی اہلیت نہیں ہے' تیری توفیق شامل حال ہو تو تجھ تک رسائی کی بات بن سکتی ہے یا مجھ میں عشق کا جذبہ پیدا کر دے تا کہ میں تجھ تک رسائی حاصل کرنے میں لگ جاؤں۔

۶۔ تیری محفل امید و بیم کی کشمکش میں ہے۔ تو سب اہل محفل کو آسمانوں کی گردش سے بے خبر کر دے یعنی مسلمانوں کو خوف اور امید کی کھینچا تانی کی فضا سے نکال کر انہیں ایمان اور یقین کی دولت سے سرفراز فرما دے۔

۷۔ خزاں کی آغوش میں لالہ اور گلاب کے پھول ڈالے جا سکتے ہیں یعنی خزاں کو بہار میں تبدیل کرنا ممکن ہے تو اٹھ اور پرانی یعنی خزاں رسیدہ شاخ پر رگِ تاک کا خون ڈال

یعنی اپنی نگاہِ کرم سے مسلمانوں میں پھر سے جذبہ عشق کی سرشاری و مستی پیدا کر دے اور وہ مادیت و نفس پرستی سے جان چھڑا کر صرف تیری محبت میں محو ہو جائیں۔ اسی سے ان کی اجڑی زندگی بہار آشنا ہو سکتی ہے۔

غزل-۲۴

۱- از آں آبے کہ در من لالہ کارد ساتگینے دہ
کفِ خاک مرا ساقی بباد فرودینے دہ

۲- زمینائے کہ خوردم در فرنگ اندیشہ تاریک است
سفر ورزیدۂ خود را نگاہِ راہ بینے دہ

۳- چو خس از موجِ ہر بادے کہ می آید ز جا رفتم
دل من از گمان ہا در خروش آید یقینے دہ

۴- بجانم آرزو ہا بود و نابودِ شرر دارد
شبم را کوکبے از آرزوئے دل نشینے دہ

۵- بدستم خامہ دادی کہ نقش خسروی بندد
رقم کش ایں چنینم کردہ ای لوحِ جبینے دہ

۱- مجھے اس پانی/شراب کا بڑا پیالہ عطا کر جو (میرے سینے میں) لالہ کے پھول بوئے/اگائے۔ اے ساقی (خدا) تو میرے جسم کو بہار کی ہوا کے سپرد کر دے یعنی میرے دل کو جذبہ عشق سے آشنا کر دے اور مجھے پورے طور پر بہار کی صورت دے کر اس قابل بنا دے کہ میں دوسروں کی خزاں کو بدل دوں۔ گویا میری شاعری میں ایسی تاثیر پیدا کر دے جو جذبوں سے عاری انسانوں میں عشق کا جذبہ پیدا کر دے۔

۲- میں نے یورپ میں جس صراحی کی شراب پی تھی اس سے میری فکر تاریک ہو گئی۔ تو اپنے سفر کرنے والے اس مسافر کو راستہ دیکھنے والی نگاہ عطا کر۔ یورپ کے علم و فن نے مجھے انسانیت سے دور کر دیا اور مادہ پرست بنا دیا۔ میں مذہب سے دور ہو گیا۔ میرے مولا! مجھے اپنے اس سابقہ عمل (یورپی علم و فن اپنانے) پر افسوس ہے، تو مجھ میں ایسی بصیرت پیدا کر دے جس سے میں تیری راہ پر آ کر عشق حقیقی کی منزل پا لوں۔

۳- جس طرح تنکا ہوا کے ہر جھونکے سے اڑ اڑ جاتا ہے میں بھی اسی طرح اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ میرا دل گمانوں کے ہاتھوں فریاد کر رہا ہے تو اسے یقین عطا فرما۔ زمانے کے غلط افکار و نظریات سے متاثر ہو کر میں اپنے اصل مقصد و مقام کو بھول گیا اور اب دل ان افکار کے ہاتھوں بے چینیوں کا شکار ہے۔ اس کے سکون و اطمینان کے لیے مجھے یقین کی دولت سے نواز۔

۴- میری جان میں آرزوؤں (یعنی دنیاوی عیش و راحت اور ساز و سامان) ہونے یا نہ ہونے کی چنگاریاں موجود ہیں تو میری رات کو ایک دل نشین آرزو کا ستارہ عطا فرما۔ میں ہر وقت اسی چکر میں رہتا ہوں کہ میرے پاس فلاں دنیاوی سامان ہے' فلاں نہیں ہے۔ تو مجھے اس چکر سے نکال کر اپنی طلب اور اپنے عشق کی آرزو عطا کر۔

۵- (اے خدا) تو نے میرے ہاتھ میں ایسا قلم دیا جو شاہانہ نقش کھینچے/ بنائے اگر تو نے مجھے ایسا تحریر کرنے والا بنایا ہی ہے تو پھر مجھے اس کے لیے کسی پیشانی کی تختی بھی عطا فرما جس پر نقش تحریر کرسکوں یعنی میری قوم میں ایسی صلاحیت پیدا کردے کہ وہ میرے شاعرانہ پیغام کو سمجھے اور اس پر عمل سے اپنی بقا اور سربلندی کا سامان کرے۔

غزل-۲۵

۱-	زہر نقشے کہ دل از دیدہ گیرد پاک می آیم	گدائے معنیٔ پاکم تہی ادراک می آیم
۲-	گہے رسم و رہِ فرزانگی ذوقِ جنوں بخشد	من از درسِ خردمنداں گریباں چاک می آیم
۳-	گہے پیچد جہاں بر من' گہے من بر جہاں پیچم	بگرداں بادہ تا بیروں ازیں پیچاک می آیم
۴-	نہ ایں جا چشمک ساقی نہ آنجا حرف مشتاقی	ز بزم صوفی و ملا بسے غمناک می آیم
۵-	رسد وقتے کہ خاصانِ ترا با من فتد کارے	کہ من صحرائیم پیش ملک بیباک می آیم

۱- میں ہر اس نقش سے جو دل پر آنکھوں کے راستے بنتا ہے' پاک رہتا ہوں۔ میں معنیٔ پاک کا گدا ہوں (اے خدا میں تیرے پاس) ہر طرح کے فکر و خیال سے خالی ہو کر آیا ہوں (یا آرہا ہوں) یعنی میں نے دنیا میں رہتے ہوئے بھی دنیاوی آرزوؤں' خواہشوں سے اپنے دل و نگاہ کو پاک رکھا ہے اور صرف تیرے پیام یا قرآن و حدیث کے پیام کا آرزومند رہا ہوں۔ دیگر ہر طرح کے افکار و نظریات سے پاک رہ کر تیرے حضور آرہا ہوں۔

۲- کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عقل و ہوش کے طور طریقے جنوں کا ذوق بخشتے ہیں' چنانچہ میں عقل مندوں کی درس گاہ سے گریباں چاک آیا ہوں۔ مطلب یہ کہ بعض اوقات اہل عقل و دانش کی محفل میں کچھ اس قسم کی باتیں ہوتی ہیں جن سے متاثر ہو کر کوئی صاحب خرد' عقل سے تائب ہو کر راہِ عشق پر گامزن ہو جاتا ہے یا جنون اختیار کر لیتا ہے۔

۳۔ کبھی تو یہ دنیا مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے اور کبھی میں اس دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہوں یعنی کبھی میں دنیا کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہوں اور کبھی عشق حقیقی مجھ پر غالب آجاتا ہے (اے ساقی) شراب کا ایسا پیالہ گردش میں لا جسے پی کر میں اس لپیٹ / چکر سے باہر آسکوں یعنی صرف خدا کی محبت یا عشق حقیقی پر ثابت قدم رہ سکوں۔

۴۔ نہ تو اس جگہ (آج کے صوفیوں کی خانقاہوں میں) ساقی کی آنکھوں کے اشارے ہیں اور نہ وہاں (آج کے ملاؤں کی درس گاہوں میں) عشق اور ذوق وشوق کی باتیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان محفلوں سے میں بہت غم ناک آیا ہوں۔ گویا خلوت اور جلوت دونوں جگہ حقیقت و اصلیت نام کو نہیں' بس صرف دکھاوا اور بناوٹ ہی ہے۔ چنانچہ صوفی و ملا کے کردار و عمل نے مجھے افسردہ کر دیا ہے۔

۵۔ وہ وقت آرہا ہے جب (اے خدا) تیرے خاص بندوں کو مجھ سے واسطہ پڑے گا/ مجھ سے کام پڑے گا کیونکہ میں تو صحرائی ہوں اس لیے بادشاہ کے سامنے بے خوف ہو کر آتا ہوں۔ گویا میں اپنے گرد صرف تیرے لیے جینے مرنے والے بندوں کا حلقہ بنا لوں گا۔ میں ایک عاشق ہوں' اسی لیے بے خوف ہو کر اپنی شاعری کے ذریعے تیرے شیدائیوں کا حلقہ بناؤں گا۔

غزل-۲۶

۱۔ دلِ بے قیدِ من با نورِ ایماں کافری کردہ — حرم را سجدہ آوردہ بتاں را چاکری کردہ

۲۔ متاعِ طاعتِ خود را ترازوئے برافرازد — ببازارِ قیامت با خدا سوداگری کردہ

۳۔ زمیں و آسماں را بر مرادِ خویش می خواہد — غبارِ راہ و با تقدیرِ یزداں داوری کردہ

۴۔ گہے با حق در آمیزد گہے با حق در آویزد — زمانے حیدری کردہ زمانے خیبری کردہ

۵۔ بایں بے رنگی جوہر از و نیرنگ می ریزد — کلیمے بیں کہ ہم پیغمبری ہم ساحری کردہ

۶۔ نگاہش عقل دور اندیش را ذوقِ جنوں دادہ — و لیکن با جنونِ فتنہ ساماں نشتری کردہ

۷۔ بخود کے می رسد ایں راہ پیمائے تن آسانے — ہزاراں سال منزل در مقامِ آزری کردہ

۱۔ میرے بے قید دل نے نورِ ایمان کا انکار کیا ہے (محبوب حقیقی کی محبت میں گرفتار نہیں ہے) اس نے حرم / کعبہ کو تو سجدہ کیا ہے اور بتوں کی غلامی کر رہا ہے۔ مطلب یہ کہ میرا

کردار و عمل مسلمانوں کا سا نہیں ہے۔ نفس پرستی یعنی حرص و ہوس' فریب و فساد اور اسی قسم کی خرابیوں میں ڈوبا ہوا ہوں۔ علامہ نے اگرچہ یہ بات اپنے حوالے سے کہی ہے لیکن درحقیقت یہ پورے مسلم معاشرے کے کردار کی عکاسی ہے۔ ساری غزل میں دل کے حوالے سے باتیں کی ہیں جو اس معاشرے کی مختلف کیفیتوں کے متعلق ہیں۔

۲۔ وہ اپنی عبادت و ریاضت کو ترازو میں تولتا ہے اور قیامت کے بازار میں خدا کے ساتھ تجارت کرتا ہے۔ اس کی عبادت صرف اس لیے ہے کہ اسے جنت ملے گی۔ عبادت خدا کا حکم اور فرض ہے' اسے کسی غرض اور لالچ کے تحت ادا کرنے کی بجائے کسی صلے کے بغیر ادا کرنا چاہیے۔ (یہ نام نہاد زاہد و عابد کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ وہ محض صلے کی خاطر عبادت کرتا ہے)

۳۔ وہ اس زمین و آسماں کو اپنی مراد کے مطابق دیکھنے کی خواہش رکھتا ہے حالانکہ وہ (میرا دل' مراد بندہ) راستے کا ایک غبار ہے اور خدا کی تقدیر/قدرت کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے۔ کائنات کا خالق تو خدا ہے وہ جس طرح چاہے اس کا نظام چلائے' انسان کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ فانی ہونے کے باوجود وہ یہ مقابلہ کرنے کی جرأت کرتا ہے حالانکہ وہ اس خالق و مالک کا محتاج ہے' خالق اس کا محتاج نہیں ہے۔ اس بنا پر اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے آقا کی اطاعت کرے۔ اس اطاعت کا صلہ کیا ملے گا' یہ وہی جانتا ہے۔

۴۔ کبھی وہ حق میں سما جاتا ہے اور کبھی وہ اس (حق) سے الجھ پڑتا ہے یا اس کے خلاف ہو جاتا ہے۔ کبھی تو وہ حیدری کرتا ہے اور کبھی وہ خیبری کرنے لگتا ہے۔ وہ ثابت قدم نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ وہ پورے طور پر حق کا بندہ نہیں ہوتا۔ اسی بنا پر اس میں یہ تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ اگر وہ عشق حقیقی کے جذبوں سے سرشار ہو تو اس میں پورے طور پر ثابت قدمی آجائے۔

۵۔ اس کی حالت اس جوہر کی سی ہے جس کا کوئی رنگ نہیں لیکن اس بے رنگی کے باوصف اس میں سے رنگ اور عجائبات ٹپکتے رہتے/نکلتے رہتے ہیں۔ اس کلیم کو دیکھو کہ وہ ایک ایسے کلیم (حضرت موسیٰ کا لقب' کلیم اللہ' اللہ سے باتیں کرنے والا) کی مانند ہے جو ایک طرف تو پیغمبری کرتا (خدا کا پیغام سناتا ہے) اور دوسری طرف جادوگری میں ملوث ہے۔ گویا یہ دو متضاد کیفیات اس بات کی مظہر ہیں کہ ہم آج کے مسلمان

اپنے خالق و مالک سے مخلص نہیں ہیں۔

۶- اس کی نگاہ نے دور کی سوچ رکھنے والی عقل کو جنون کا ذوق عطا کیا لیکن ساتھ ہی ہنگامے پیدا کرنے والے جنون پر نشتر بھی چلاتا رہتا ہے۔ مطلب یہ کہ وہ عقل و خرد میں عشق و محبت حقیقی کا ذوق و شوق پیدا کرتا ہے اور اس ذوق و شوق کو ختم کرنے کے بھی مختلف حیلے بہانے کام میں لاتا ہے۔

۷- ایسا تن آسان یا سست رو کیونکر خود تک پہنچ سکتا ہے کہ جس نے ہزاروں سال بت پرستی کے گھر کو اپنا گھر بنا رکھا ہو۔ گویا ایسی متضاد یا منافقانہ سوچوں اور عادتوں والا جس کی تمام تر زندگی مادیت پرستی میں گذری ہو، نہ تو اپنی معرفت ہی سے آگاہ ہو سکتا ہے اور نہ اسے خالق و مخلوق میں اپنے مقام ہی کی خبر ہو سکتی ہے۔

غزل-۲۷

۱-	زشاعر نالۂ مستانہ در محشر چہ می خواہی	تو خود ہنگامہ ای، ہنگامۂ دیگر چہ می خواہی
۲-	بہ بحرِ نغمہ کردی آشنا طبع روانم را	زچاکِ سینہ ام دریا طلب، گوہر چہ می خواہی
۳-	نمازِ بے حضور از من نمی آید نمی آید	دلے آوردہ ام دیگر ازیں کافر چہ می خواہی

۱- (اے خدا) تو محشر میں شاعر سے نالۂ مستانہ کس لیے چاہتا ہے، تو تو خود ہنگامہ ہے، پھر اور ہنگامہ کس لیے چاہتا ہے۔ گویا ساری کائنات کا ہنگامہ اس خالق کی تخلیق کا نتیجہ ہے۔ محشر میں بھی ہر طرف ہنگامہ ہو گا، اس حوالے سے یہ پوچھا جا رہا ہے کہ اس صورتِ حال میں اے خدا تو کس لیے مجھے یہ کہہ رہا ہے کہ میں اپنی شاعری کے ذریعے اس ہنگامہ میں اضافہ کروں۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ شاعر جو ہنگامہ اپنی شاعری کی وساطت سے برپا کر سکتا ہے وہ ہنگامہ محشر سے گویا بڑھ کر ہے۔ اسی لیے اس سے یہ ہنگامہ برپا کرنے کو کہا جا رہا ہے۔

۲- تو نے میری طبع رواں کو نغمہ کے سمندر سے آشنا کیا تو میرے سینے کے چاک سے دریا طلب کر تو گوہر کس لیے چاہتا ہے۔ علامہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اے خدا! مجھے تو نے شاعری کے لیے پیدا کیا ہے۔ تیرا عطا کردہ یہی تحفہ میں روزِ محشر تیرے حضور لے کر آیا ہوں۔ تو ایسی صورت میں مجھ سے عمل کی توقع کیونکر کرتا ہے یعنی میری شاعری عملوں

ہی کی صورت ہے۔

۳- (اے خدا) مجھ سے ایسی نماز ادا نہیں ہوتی، نہیں ہوتی جس میں تیرے حضور میری حضوری نہ ہو۔ میں تو دل لے کر تیرے حضور آیا ہوں، پھر تو اس کافر سے اور کیا چاہتا ہے یعنی میرا دل تیرے عشق و محبت سے سرشار ہے، بس میرے پاس یہی کچھ ہے، اسے ہی قبول فرمالے۔ اردو میں ایک جگہ کہا ہے:

ہے یہی میری نماز ہے ہی میرا وضو
میری نواؤں میں ہے میرے جگر کا لہو

غزل-۲۸

۱- نہ در اندیشۂ من کارزارِ کفر و ایمانے نہ در جانِ غم اندوزم ہوائے باغِ رضوانے
۲- اگر کاوی درونم را خیالِ خویش را یابی پریشاں جلوہ ے چوں ماہتاب اندر بیابانے

۱- نہ تو میری فکر میں کفر اور ایمان کی جنگ برپا ہے اور نہ میری غم کی ماری جان ہی میں کسی باغِ رضوان یعنی جنت کی خواہش ہے۔ مطلب یہ کہ میں عشق حقیقی سے سرشار ہونے کے باعث کفر و ایمان کی بحث میں نہیں پڑتا اور میرا یہ عشق بھی خلوص کا حامل ہے جسے بہشت کی کوئی خواہش نہیں ہے۔

۲- اگر تو میرے اندر/ سینے کو کھودے یعنی میری باطنی حالت پر نظر کرے تو اس میں تجھے (اے خدا) اپنا ہی خیال ملے گا (تیرے سوا مجھے کسی اور کا خیال نہیں) میری یہ حالت کچھ اس طرح ہے جیسے کسی بیابان میں چاندنی کی چاندنی بکھری ہوئی ہو یعنی میرے دل یا سینے میں تیرا خیال اسی طور جلوہ فرما ہے۔

غزل-۲۹

۱- مرغِ خوش لہجہ و شاہین شکاری از تست زندگی را روشِ نوری و ناری از تست
۲- دل بیدار و کفِ خاک و تماشائے جہاں سیر ایں ماہ بشب گونہ عماری از تست
۳- ہمہ افکارِ من از تست چہ در دل چہ بلب گہر از بہر برآری نہ برآری از تست

۴۔ من هماں مشت غبارم که بجائے نرسد　　لاله از تست و نم ابر بهاری از تست
۵۔ نقش پرداز توئی ما قلم افشانیم　　حاضر آرائی و آینده نگاری از تست
۶۔ گله هاداشتم از دل بزبانم نرسید　　مهرو بے مهری وعیاری ویاری از تست

۱۔ اے خالق و مالک! اچھی آواز/ چہچہے والا پرندہ یعنی بلبل اور شکار کرنے والا شاہین دونوں تیرے ہیں' تیری تخلیق ہیں۔ زندگی میں موجود نوری اور ناری کی روشیں بھی تیرے باعث ہی ہیں یعنی دنیا میں جمال اور جلال اور زندگی میں نور اور نار' جو کچھ بھی ہے وہ سب تیری تخلیق ہے اور سب میں تیری ہی جلوہ گری ہے۔

۲۔ بیدار دل' مٹی کی مٹھی (جسم) اور دنیا کا تماشا نیز رات کی طرح تاریک ڈولی میں اس چاند کی سیر تیرے باعث ہے۔ گویا انسانی جسم میں چاند سا روشن بیدار دل ہے جو جسم کی تاریکی میں ہوتے ہوئے بھی ساری دنیا کی سیر کر سکتا ہے یعنی اس میں موجود جذبے اسے دور دور تک لے جاتے ہیں۔

۳۔ میرے تمام افکار و خیالات' خواہ وہ دل میں ہیں اور خواہ ہونٹوں پر' سبھی تیرے باعث ہیں (میرے افکار کے) سمندر سے تو موتی نکالے یا نہ نکالے' یہ تیرا ہی کام ہے یا تیری ہی مرضی ہے یعنی میرے پوشیدہ اور ظاہر افکار اور میرا وجود سب تیرے ہی محتاج ہیں۔ یہ سب تیرا ہی عطیہ ہے۔ میرے اپنے بس میں کچھ نہیں۔

۴۔ میں تو غبار کی وہی ایک مٹھی ہوں نہ جس کی کسی جگہ رسائی نہیں (کہیں بھی نہیں پہنچتی) یہ لالہ کے پھول تیرے ہیں اور بہار کے بادل کی نمی بھی تیری ہے یعنی انسان میں کوئی قدرت و طاقت نہیں ہے کہ وہ اپنے طور پر کچھ کر سکے۔ وہ اور اس کی کوشش محض ایک سبب بنتی ہے نیز کائنات کی ہر شے کا اصل فاعل و خالق تو ہی ہے۔

۵۔ نقش بنانے والا تو اصل میں تو ہی ہے' ہم انسان تو محض قلم چلانے والے ہیں، گویا اس قلم میں نقش نگاری کی کیفیت پیدا کرنا تیرا ہی کام ہے۔ جو کچھ ہمارے سامنے ہو رہا ہے اور جو کچھ مستقبل میں ہوگا' سب کا باعث تیری ہی ذات ہے۔ ہر شے کا اصل فاعل تو ہی ہے۔

۶۔ میرے دل میں (دنیا اور اہل دنیا سے متعلق) بہت سے شکوے تھے جو میری زبان پر نہ آئے' میں نے ان کا اظہار نہ کیا' اس لیے کہ مجھ پر یہ بات واضح ہوگئی کہ دنیا میں محبت' دشمنی' عیاری اور مکاری اور یاری سب کچھ تیری ہی طرف سے ہے' اس لیے

کسی سے گلہ کیونکر کیا جا سکتا ہے۔ بقول شاعر:

درد جب تیری عطا ہے تو گلہ کس سے کریں

غزل-۳۰

۱- خوشتر ز ہزار پارسائی گامے بطریق آشنائی
۲- در سینہ من دمے بیاسائے از محنت و کلفت خدائی
۳- ما را ز مقام ماخبر کن مائیم کجاو تو کجائی
۴- آں چشمک محرمانہ یاد آر تا کے بتغافل آزمائی
۵- دی ماہِ تمام گفت بامن "در ساز بداغِ نارسائی"
۶- خوش گفت ولے حرام کردند در مذہب عاشقاں جدائی
۷- پیش تو نہادہ ام دلِ خویش شاید کہ تو ایں گرہ کشائی

۱- ہزار طرح کی پارسائی کی نسبت عاشقی کے راستے پر ایک قدم رکھنا زیادہ اچھا ہے۔ گویا پارسائی میں نمود و نمائش ہے جبکہ عاشقی محبوب کی ذات میں پوری طرح محو ہو جانا ہے۔

۲- اے خدا تو پوری کائنات کے امور نپٹانے میں مصروف ہونے کے باعث چونکہ محنت و کلفت اٹھا رہا ہے' اس لیے کچھ دیر کے لیے میرے سینے میں آرام فرما۔ عاشق محبوب کو سکون و راحت میں دیکھنے کا خواہاں ہے۔ ظاہر ہے اس تخلیق و تنظیم سے خدا ہر طرح کی محنت وغیرہ سے محفوظ ہے لیکن عاشق نے اس بہانے اسے اپنے سینے میں آرام کرنے کو کہا ہے۔ بقول غالب:

تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

۳- اے ذاتِ باری! تو ہمیں ہمارے مقام سے آگاہ فرما کہ ہم کہاں ہیں اور تو کہاں ہے؟ یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ ہم میں ایسے جذبہ ہائے عشق پیدا کر دے کہ جن سے ہمیں اپنی اور تیری معرفت حاصل ہو جائے۔

۴- تو اس چشمک محرمانہ کو یاد کر جس نے شروع میں مجھے لوٹا تھا' آخر تو کب تک اپنے تغافل سے مجھے آزماتا رہے گا۔ گویا وہ نگاہِ راز جو تو نے مجھ پر شروع میں ڈالی تھی' اس سے کب تک پرہیز کرتا رہے گا' نہیں ڈالے گا۔

۵- کل رات چودھویں کے چاند نے مجھ سے کہا کہ تو نارسائی کے داغ / زخم سے موافقت کر لے۔ اس لیے کہ ایک عاشق کے لیے جدائی ہی میں بھلائی ہے (اگلے شعر اس کے ساتھ قطعہ بند ہیں)

۶- (چاند نے تو) ٹھیک کہا' لیکن میں کیا کروں کہ عاشقوں کے مذہب میں جدائی کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ ایک عاشق کے لیے محبوب سے دوری وجدائی نا قابل برداشت ہے۔

۷- میں نے اپنا دل تیرے سامنے رکھ دیا ہے' شاید تو یہ مشکل حل فرما دے یعنی شاید جدائی سے متعلق مسئلہ حل فرما کر میرے دل کو مطمئن کر دے۔

غزل-۳۱

۱- برجہانِ دلِ من تاختنش رانگرید   کشتن و سوختن و ساختنش رانگرید

۲- روشن از پرتو آں ماہ دلے نیست کہ نیست   باہزار آئینہ پرداختنش رانگرید

۳- آنکہ یک دست بردملکِ سلیمانے چند   بافقیراں دوجہاں باختنش رانگرید

۴- آنکہ شبخون بدل ودیدۂ دانایاں ریخت   پیش ناداں سپر انداختنش رانگرید

۱- میرے دل کی دنیا پر اس کا حملہ آور ہونا تو دیکھو۔ اس کا مجھے مارنے' جلانے اور بنانے کا عمل بھی دیکھو۔ یہ کہنا چاہا ہے کہ خالق کا مجھے مارنا یا جلا کر خاک کرنا درحقیقت میری زندگی میں سوز وجذبہ عشق پیدا کر کے میری بقا کا سامان کرنے کے لیے ہے۔

۲- کوئی ایسا دل نہیں ہے جو اس چاند کی روشنی / جلوے سے منور نہ ہو۔ اس کا ہزاروں آئینوں کے سامنے اپنے بناؤ سنگھار کے عمل کو دیکھو یعنی کائنات کی ہر ہر شے میں اس محبوب حقیقی کا جلوہ کارفرما ہے۔ بقول بہادر شاہ ظفرؔ:

شعلہ ہے وہی' شمع وہی' ماہ وہی ہے   خورشید وہی' نور سحر' گاہ وہی ہے
مجنون و خراباتی و دیوانہ و ہشیار   درویش وگدا' شاہ وشہنشاہ وہی ہے
خارا میں شرر ہے وہ' ظفرؔ لعل میں وہ رنگ   واللہ! وہی سب میں ہے' باللہ وہی ہے

۳- وہ محبوب جو اپنے ایک اشارے یا وار سے حضرت سلیمان کے ملکوں جیسے کئی ملکوں کو لوٹ لیتا ہے' اسے فقیروں کے حضور دو جہانوں کو ہارنے یا انہیں پیش کرنے کے عمل کو دیکھو۔ درویشوں کی اس محبوب سے وابستگی کی بنا پر بڑے بڑے شان وشکوہ والے

ان کے آگے جھک جاتے ہیں۔

۴- وہ محبوب جس نے صاحبان عقل وخرد کے دل و دیدہ پر شبخون مارا' اس کا ناد انوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے کا عمل دیکھو یعنی ان (داناؤں) کی عقل و بصارت کو بے اثر کر دیا ہے جبکہ عاشقوں کی طرف وہ سراپا توجہ بن جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ اس محبوب تک رسائی عشق ہی سے ممکن ہے' عقل و دانش سے نہیں۔

غزل-۳۲

۱- مرا براہِ طلب بار در گل است ہنوز — کہ دل بقافلہ و رخت و منزل است ہنوز

۲- کجاست برق نگاہے کہ خانماں سوزد — مرا معاملہ باکشت و حاصل است ہنوز

۳- یکے سفینہ ایں خام رابطوفاں دہ — زترسِ موج نگاہم بساحل است ہنوز

۴- تپیدن و نرسیدن چہ عالمے دارد — خوشا کسے کہ بدنبالِ محمل است ہنوز

۵- کسے کہ از دو جہاں خویش رابروں نشناخت — فریب خوردۂ ایں نقش باطل است ہنوز

۶- نگاہِ شوق تسلی بجلوہ ے نشود — کجابرم خلشے را کہ در دل است ہنوز

۷- حضورِ یار حکایت دراز تر گردید — چنانکہ ایں ہمہ نا گفتہ در دل است ہنوز

۱- ابھی تک طلب کی راہ میں میرا بوجھ کیچڑ میں پھنسا ہوا ہے۔ اس لیے کہ ابھی تک میرا دل' قافلہ' سامان اور منزل میں اٹکا / پھنسا ہوا ہے یعنی مجھ میں طلب یا اس محبوب تک رسائی کی خواہش تو ہے لیکن میں مادی ساز و سامان کی تلاش میں لگا ہوا ہوں جبکہ طلب کے لیے جذبہ عشق کا ہونا بنیادی ضرورت ہے۔

۲- اس (محبوب کی) نگاہ کی بجلی کہاں ہے جو میرے گھر بار کو جلا دے۔ میرا معاملہ تو ابھی تک کھیتی اور اس کی پیداوار تک محدود ہے۔ گویا میرے عمل میں ابھی تک خلوص و جذبہ کی بجائے معاوضہ طلبی کی حالت موجود ہے۔ میری یہ آرزو ہے کہ وہ محبوب اپنی نگاہِ لطف و کرم سے میری اس حالت یا میرے فکر و خیال کو ختم کر دے۔

۳- (اے خدا) اس ناپختہ ملاح کی کشتی کو ذرا طوفان میں ڈال دے۔ اس لیے کہ موجوں کے خوف سے میری نگاہیں ابھی تک ساحل پر لگی ہوئی ہیں۔ گویا عشق کی راہ ڈر خوف سے طے نہیں ہوتی بلکہ مشکلات اور طوفانوں سے' بے خوف ہو کر ٹکرا کر آگے بڑھنے

سے طے ہوتی ہے۔ وہی علامہ والی بات:

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق

۴- (محبوب تک رسائی کے لیے) تڑپنا اور مقصود نہ پانا بھی ایک عجیب لذت وسرور رکھتا ہے۔ وہ (عشق) بڑا خوش بخت ہے جو ابھی تک محمل کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا ہے۔ یہ کہنا چاہا ہے کہ راہ عشق میں وصل سے شوق مر جاتا ہے اور ہجر اس شوق کو برقرار رکھتا ہے۔ مومن خان مومن نے یوں کہا ہے:

مرگ ہے انتہائے شوق' یاں رہی ابتدائے عشق
زندگی اپنی ہو گئی رنجش بار بار میں

۵- وہ انسان جس نے اپنے آپ کو دونوں جہانوں سے باہر/ ماورا یا بلند نہیں سمجھا وہ ابھی تک اس باطل نقش/ مٹ جانے والے نقش کا فریب کھائے ہوئے ہے۔ گویا ایسا انسان اس دنیا کو فانی نہیں بلکہ ہمیشہ رہنے والی سمجھتا ہے جبکہ وہ اشرف المخلوقات ہونے کے ناطے اس سے زیادہ صاحب بقا ہے یا صاحب بقا بن سکتا ہے لیکن دنیا نہیں بن سکتی۔

۶- میری نگاہِ شوق کو (اے محبوب حقیقی) تیرے ایک جلوے سے تسلی نہیں ہوتی' میں اپنی اس خلش کو جو ابھی تک میرے دل میں ہے' کہاں لے جاؤں یعنی میرا دل ہر لمحہ تیری نئی سے نئی تجلیات کا مشتاق رہتا ہے' اس کی تسلی کے لیے مجھے اپنے جلووں سے نوازتا رہ۔

۷- دوست کے سامنے میری داستانِ عشق طویل سے طویل تر ہوتی گئی لیکن اس کے باوجود میں نے یہ محسوس کیا کہ یہ ہنوز میرے دل میں اسی طرح موجود ہے اور میں نے محبوب سے گویا کچھ بھی نہیں کہا۔ عاشق کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ محبوب کے سامنے مسلسل اپنے عشق کی بات کرتا رہے' چنانچہ بہت کچھ کہنے کے باوجود وہ یہی سمجھتا ہے کہ ابھی اس کی بات ادھوری رہ گئی ہے۔

غزل-۳۳

۱- زمستاں را سر آمد روزگاراں نواہا زندہ شد در شاخساراں
۲- گلاں را رنگ و نم بخشد ہوا ہا کہ می آید زطرفِ جویباراں
۳- چراغ لالہ اندر دشت و صحرا شود روشن تراز بادِ بہاراں

۴- دِلم افسردہ تر در صحبت گل　　گریزد ایں غزال از مرغزاراں
۵- دمے آسودہ بادرد و غم خویش　　دمے نالاں چو جوئے کوہساراں
۶- زبیم ایں کہ ذوقش کم نگردد　　نگویم حالِ دل با رازداراں

۱- موسم سرما ختم ہوااور درختوں کی شاخوں پر نغمے زندہ ہوگئے۔ موسم بہار آگیا ہے جس کی وجہ سے پرندے درختوں پر خوب چہچہانے لگے ہیں۔

۲- ہوائیں (اس موسم بہار میں) پھولوں کو رنگ اور تازگی/ شادابی/ دے رہی ہیں' اس لیے کہ یہ ہوائیں نہروں کی طرف سے آرہی ہیں۔ موسم بہار میں پھول کثرت سے کھلتے اور تروتازہ ہوتے ہیں۔

۳- دشت وصحرا میں لالہ پھول کا چراغ موسم بہار کی ہوا سے اور بھی روشن ہو رہا ہے۔ چراغ ہوا کے چلنے سے بجھ جاتا ہے لیکن یہاں مراد لالہ کی سرخی ہے جو بہار کی ہوا سے اور بھی چمک اٹھتی ہے۔

۴- میرا دل پھولوں کی صحبت سے زیادہ ہی افسردہ ہوگیا ہے۔ گویا یہ ایسا ہرن ہے جو سبزہ زاروں سے بھاگتا ہے۔ اس موسم میں عاشق پر ایک عجیب کیفیت گذرتی ہے جسے اس استعارے میں بیان کیا ہے۔ انشا نے کچھ اس طرح اس حالت کی عکاسی کی ہے:

نہ چھیڑ اے نکہت بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

۵- میرا دل کسی وقت تو اپنے درد وغم سے سکون پاتا اور لذت اٹھاتا ہے اور کسی لمحے پہاڑوں سے آتی ہوئی ندی کی طرح رونے یا شور مچانے لگتا ہے۔

۶- میں اس خوف سے کہ کہیں میرے دل کا ذوق ختم نہ ہو جائے' میں رازداروں سے بھی دل کا حال بیان نہیں کرتا۔ گویا عاشق چاہتا ہے کہ وہ راز کی خلش کو برقرار رکھے کہ اس میں اس کے لیے ایک خاص لذت ہے۔

غزل-۳۴

۱- ہوائے خانہ و منزل ندارم　　سرِراہم غریب ہر دیارم
۲- سحرمی گفت خاکستر صبارا　　فسرد از بادِ ایں صحرا شرارم

۳- گذر نرمک پریشانم مگرداں زسوزِ کاروانے یادگارم"
۴- زچشم اشک چوں شبنم فرو ریخت کہ من ہم خاکم و در رہگذارم
۵- بگوشِ من رسید از دل سرودے کہ جوئے روزگار از چشمہ سارم
۶- ازل تاب و تب پیشینۂ من ابد از ذوق و شوقِ انتظارم
۷- میندیش از کف خاکے میندیش بجانِ تو کہ من پایاں ندارم

۱- مجھے گھر اور منزل کی خواہش نہیں ہے۔ میں تو راستے میں ہوں اور ہر شہر میں اجنبی ہوں یعنی میں عاشق ہونے کے ناطے ایک جگہ پر ٹک کر نہیں رہتا۔ کبھی یہاں بیٹھ جاتا ہوں، کبھی وہاں یہ بیقراری کی بھی علامت ہے۔

۲-۳: صبح سویرے راکھ صبح کی نرم ولطیف ہوا سے کہہ رہی تھی کہ اس صحرا کی ہوا سے میری چنگاری بجھ گئی ہے تو مجھ پر سے آہستگی سے گذر اور مجھے نہ بکھیر کیونکہ میں کسی قافلے کے سوز/ جلن کی یادگار ہوں۔

۴- میری آنکھوں سے شبنم کی طرح آنسو ٹپک پڑے، کیونکہ میں بھی خاک ہوں اور راستے میں پڑا ہوں یعنی میری زندگی بھی گویا راکھ ہی کی طرح یا دوسرے لفظوں میں فانی و بے ثبات ہے۔

۵- (لیکن) میرے کان میں میرے دل کا یہ نغمہ پہنچا کہ زمانے کی ندی میرے چشموں کے سلسلے سے قائم ہے (انسان کا دل اس ندی کا سرچشمہ ہے) مطلب یہ کہ انسان کا دل ہی سب کچھ ہے اور خالق نے یہ کائنات اس کے لیے یا اس سے تخلیق کی ہے۔

۶- ازل (کیا ہے؟) وہ میری سابقہ تب و تاب ہے جبکہ ابد میرے انتظار کے ذوق و شوق کا نتیجہ ہے۔ گویا انسان ازلی اور ابدی ہے۔

۷- تو میری مٹی کی مٹھی سے مت ڈر، مت ڈر، تیری جان کی قسم میرا کوئی اختتام (میری کوئی حد) نہیں ہے۔ یہ گویا دل کی زبان سے کہا گیا ہے کہ میں ایک لامحدود شے ہوں تو مجھے کف خاک سمجھتے ہوئے مجھ سے بیگانہ نہ رہ۔

غزل-۳۵

۱- از چشم ساقی مست شرابم بے مے خرابم، بے مے خرابم

۲- شوقم فزوں تر از بے حجابی بینم نہ بینم در پیچ و تابم
۳- چوں رشتۂ شمع آتش بگیرد از زخمۂ من تارِ ربابم
۴- از من بروں نیست منزلگہ من من بے نصیبم راہے نیابم
۵- تا آفتابے خیزد ز خاور مانند انجم بستند خوابم

۱- میں ساقی کی آنکھوں کی شراب پی کر مست ہو گیا ہوں۔ میں شراب پیے بغیر ہی نشے میں چور ہوں، نشے میں چور ہوں۔ تقریباً ہر شاعر نے محبوب کی آنکھوں کو شراب سے تشبیہ دی ہے۔ مثلاً عراقی:

نخستین بادہ کاندر جام کردند
زچشم مست ساقی دام کردند

(سب سے پہلی شراب جو جام میں ڈالی گئی وہ ساقی کی چشم مست سے ادھار لے کر ڈالی گئی)

محتشم کاشی:

تمام از گردشِ چشم تو شد کارِ من اے ساقی
زدستِ من بگیر ایں جام راکز خویشتن رفتم

سودا نے گویا اس شعر کا ترجمہ کیا ہے:

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودؔا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

۲- محبوب کے بے پردہ ہو کر سامنے آنے سے میرا جذبۂ شوق کم ہونے کی بجائے اور بڑھ جاتا ہے۔ غرض میں اسے دیکھوں تو بھی اور نہ دیکھوں تو بھی دونوں صورتوں میں مجھ پر بیقراری طاری رہتی ہے۔

۳- جس طرح شمع/موم بتی کا دھاگا آگ دکھاتے ہی جلنے لگتا ہے، اسی طرح میرے مضراب سے میرے ساز کے تار جلنے/بھڑکنے لگتے ہیں، گویا فریاد کرنے لگتے ہیں۔ میری آہ وفغاں سے میرے جذبات میں اور شدت آجاتی ہے

۴- میری منزل اگرچہ مجھ سے باہر نہیں ہے لیکن میں ایسا بے نصیب ہوں کہ مجھے اس کا کوئی راستہ ہی نہیں ملتا۔ غالباً یہ کہنا چاہا ہے کہ میں اپنی معرفت یا خودی اور اپنی مخفی صلاحیتوں سے بے خبر ہوں۔

۵- اس وقت تک کہ سورج مشرق سے طلوع ہو‘ قدرت نے مجھے ستاروں کی طرح بیدار کر رکھا ہے۔ سورج طلوع ہونے کے بعد ستارے بے روشن ہو جاتے ہیں۔ اس حوالے سے یہ کہا ہے کہ جب مجھے معرفتِ ذات حاصل ہو جائے گی تو میں جسمانی طور پر تو موجود ہوں گا لیکن روحانی طور پر اس محبوب حقیقی کی ذات میں فنا ہو جاؤں گا (فنا فی اللہ ہو جاؤں گا)

غزل-۳۶

۱- شب من سحر نمودی کہ بہ طلعت آفتابی — تو بطلعت آفتابی سزد ایں کہ بے حجابی

۲- تو بدردِ من رسیدی‘ بضمیرم آرمیدی — ز نگاہِ من رمیدی بچنیں گراں رکابی

۳- تو عیارِ کم عیاراں تو قرارِ بے قراراں — تو دوائے دل فگاراں مگر ایں کہ دیر یابی

۴- غم عشق و لذت او اثر دوگونہ دارد — گہے سوز و دردمندی گہے مستی و خرابی

۵- ز حکایت دل من تو بگو کہ خوب دانی — دل من کجا کہ او را بکنارِ من نیابی

۶- بجلالِ تو کہ در دل دگر آرزو ندارم — بجز ایں دعا کہ بخشی بکبوتراں عقابی

۱- تو نے میری رات کو صبح میں بدل دیا ہے۔ اس لیے کہ تو آفتاب کے چہرے والا ہے (بے حد روشن چہرے والا ہے) اور چونکہ تو آفتابی چہرے والا ہے اس لیے یہ مناسب ہوگا کہ تو بے حجاب ہو جائے۔ مطلب یہ کہ محبوب حقیقی کا جلوہ یوں تو کائنات کی ہر ہر شے میں ہے لیکن خود اس کی ذات پردے میں ہے۔ اگر وہ پردے سے باہر آ جائے تو عاشقوں پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جائے۔

۲- (اے محبوب حقیقی) تو نے چونکہ میرے درد کو پا لیا/سمجھ لیا اور میرے دل میں آرام فرمانے لگا (مجھ پر یہ تیرا کرم تھا) لیکن تو اپنی اس قدر ثابت قدمی کے باوجود میری نگاہوں سے دور ہے۔ مطلب یہ کہ یوں تو تو میرے دل میں بسا ہوا ہے لیکن ساتھ ہی میرے سامنے جلوہ فرما ہونے کی بجائے میری نظروں سے دور اور پردے میں ہے۔

۳- اے محبوب تو بے قدر و اہمیت انسانوں کی قدر و قیمت اور بیقرار انسانوں کا قرار ہے‘ تو زخمی دلوں کی دوا تو ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ تو جلد ہاتھ نہیں آتا۔ تیری ذات تک رسائی کے لیے بڑے مرحلوں سے گذرنا پڑتا ہے۔

۴- عشق کے غم اور اس کی لذت میں دو طرح کے اثر ہیں۔ کبھی تو (یہ اثر) سوز اور دردمندی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور کبھی مستی اور خرابی کی حالت میں، عشق میں ایک عاشق پر جو بھی کیفیت گذرے، وہ اس کے لیے بڑے ہی سرور و مستی کا باعث بنتی ہے۔

۵- تو (اے محبوب) میرے دل کی حکایت سے چونکہ خوب آگاہ ہے اس لیے ذرا بیان فرما دے کہ میرا دل کہاں ہے، تو اسے میرے پہلو میں نہیں پائے گا یعنی میرا دل تو تیرے پاس ہے، مجھے کیا خبر کہ اس کا کیا حال ہے؟ یہ محبوب سے انتہائی محبت و وابستگی کی علامت ہے۔

۶- مجھے تیرے جلال کی قسم ہے کہ میرے دل میں سوائے اس کے اور کوئی آرزو نہیں ہے کہ تو (اپنے فضل و کرم سے) کبوتروں کو عقابی طاقت عطا فرما دے۔ کبوتروں کا استعارہ آج کے مسلمانوں کے لیے ہے جو آج ہر لحاظ سے پست اور کمزور زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اے خدا! تو ان میں ایسی قوت و ہمت پیدا فرما دے کہ وہ ایک باوقار اور بلند مرتبہ زندگی بسر کرنے لگیں (آمین)

غزل-۳۷

۱- دریں مے خانہ اے ساقی ندارم محرمے دیگر — کہ من شاید نخستیں آدمم از عالمے دیگر

۲- دمے ایں پیکر فرسودہ را سازی کف خاکے — فشانی آب و از خاک آتش انگیزی دمے دیگر

۳- بیار آں دولتِ بیدار و آں جام جہاں بیں را — عجم را دادہ ای ہنگامہ بزم جمے دیگر

۱- اے ساقی! اس مے خانے میں میرا کوئی ہم راز نہیں ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ میں کسی اور جہان کا پہلا آدمی ہوں۔ علامہ نے اپنی شاعری کے حوالے سے بات کی ہے یعنی ان کے عظیم پیغام پر آج کا کوئی بھی مسلمان توجہ نہیں دے رہا جیسے وہ انہیں ان کے خیالات و افکار کی بنا پر اجنبی سمجھتا ہے۔

۲- ایک وقت میں تو تو اس گھسے پٹے جسم کو خاک کی مٹھی بنا دیتا ہے اور ایک دوسرے وقت میں اس پر پانی چھڑک کر اس مٹی سے آگ بھڑکا دیتا ہے۔ مطلب یہ کہ کبھی تو تو اس انسانی جسم کو بے سوز اور معرفت سے خالی رکھتا ہے اور وہ محض مٹی کا جسم رہتا ہے اور کبھی اس میں عشق و مستی کا سوز و گداز پیدا کر دیتا ہے۔

۳- تو وہ دولت بیدار اور جام جہاں بیں لے آ' اس لیے کہ تو نے عجم کو پھر جمشید کی بزم کا ہنگامہ عطا کر دیا ہے۔ مطلب یہ کہ غیر عرب مسلم ملکوں میں جہاں تو نے ان کو آزادی کی نعمت سے نوازا اور وہاں کی حکومت پر سرفراز فرمایا ہے' ان میں ایسی عظیم صلاحیتیں بھی پیدا فرما دے جن سے وہ صحیح اور حقیقی حکمرانی کے آداب سے آگاہ ہو جائیں۔

غزل-۳۸

۱- بجہانِ دردمنداں تو بگو چہ کار داری؟ تب وتاب ماشناسی؟ دل بیقرار داری؟

۲- چہ خبر تراز اشکے کہ فرو چکدز چشمے تو بہ برگ گل زشبنم در شاہوار داری؟

۳- چہ بگویمت زجانے کہ نفس نفس شمارد دم مستعار داری؟ غم روزگار داری؟

۱- تو (محبوب حقیقی) یہ بتا تجھے اہل درد/ عاشقوں سے کیا کام ہے؟ کیا تو ہم (عاشقوں کی) تب و تاب/ سوز اور تڑپ کو جانتا پہچانتا یا اس سے آگاہ ہے؟ کیا تیرا دل بھی بیقراری سے دوچار ہے؟ اگر ان سوالوں کا جواب نفی میں ہے تو پھر تیرا ہم سے اور ہماری دنیا سے کیا واسطہ؟ خدا سے اس قسم کے جرأت مندانہ سوال علامہ ہی کر سکتے ہیں۔ یہ دراصل ان کے خلوص و محبت کی علامت ہیں۔

۲- تجھے ان آنسوؤں کی کیا خبر جو کسی آنکھ سے (غم و درد کے باعث) ٹپکتے ہیں۔ تیرے پاس تو پھول کی پتی پر شبنم کا شاہانہ موتی ہے۔ وہی بات کہ تجھے ہم دردمندوں کی حالت و کیفیت کی کیا خبر کہ تیری ذات تو سراپا بے نیاز ہے۔

۳- میں تجھے اس جان کے بارے میں کیا بتاؤں جو اپنا ایک ایک سانس گن کر وقت گذار رہی ہے۔ کیا تیری زندگی عارضی ہے؟ کیا تجھے غم روزگار سے پالا پڑا ہوا ہے؟ مطلب یہ کہ انسانی زندگی عارضی و فانی ہے اور مشکلات سے دوچار رہتی ہے۔ (علامہ نے ممکن ہے اپنی زندگی کے حوالے سے بات کی ہو) جبکہ اس خالق کائنات کی ذات ازلی و ابدی اور ہر طرح سے بے نیاز ہے اور مذکورہ احساسات سے دور ہے۔

غزل-۳۹

۱- اگر نظارہ از خود رفتگی آرد حجاب اولے نگیرد با من ایں سودا بہا از بس گراں خواہی

۲- سخن بے پردہ گو با ما' شد آں روزِ کم آمیزی — کہ می گفتند تو ما را چنیں خواہی چناں خواہی
۳- نگاہِ بے ادب زد رخنہ ہا در چرخ مینائی — دگر عالم بنا کن گر حجابے درمیاں خواہی
۴- چناں خود را نگہ داری کہ با ایں بے نیازی ہا — شہادت بر وجودِ خود ز خونِ دوستاں خواہی
۵- مقام بندگی دیگر' مقام عاشقی دیگر — ز نوری سجدہ می خواہی ز خاکی بیش ازاں خواہی
۶- مس خامے کہ دارم از محبت کیمیا سازم — کہ فردا چوں رسم پیش تو از من ارمغاں خواہی

۱- (اے محبوب حقیقی) اگر تیرے نظارے/ دیدار سے مجھ پر بے خودی طاری ہو جاتی ہے تو پھر میرے لیے تیرا پردے ہی میں رہنا بہتر ہے۔ میرے لیے یہ سودا موافق نہیں ہے کیونکہ تو اس کی بہت بھاری قیمت مانگ رہا ہے یعنی تیرے دیدار سے اگر میں اپنی پہچان/ معرفت کھو بیٹھوں تو اس سے بہتر ہے کہ تو پردے ہی میں رہے۔

۲- تو ہم سے کھل کر بات کر (پردے سے باہر آ کر بات کر) وہ تیرے نہ ملنے کے دن اب لد گئے جب یہ کہا جایا کرتا تھا کہ تو ہم کو اس طرح چاہتا ہے' اس طرح چاہتا ہے۔ گویا پہلے شعر میں کہی گئی بات کے برعکس بات کی ہے۔

۳- انسان کی گستاخ نگاہ نے اس نیلے آسمان میں کئی رخنے ڈال دیئے ہیں' لہٰذا اگر تو اپنے اور انسان کے درمیان پردہ رکھنے کا خواہاں ہے تو پھر کوئی نئی دنیا/ کائنات تخلیق کر لے یعنی تو اب ہماری نگاہ سے آسمان کے اس پار پردے میں نہیں رہ سکتا' ویسے بھی کائنات کی ہر شے میں تیرا جلوہ کارفرما ہے' اس صورت میں تیرا پردے میں رہنا کیا معنی رکھتا ہے؟

۴- تو اپنی حفاظت کچھ اس انداز میں کرتا ہے کہ اپنی بے نیازیوں کے باوجود اپنے وجود کی گواہی دوستوں کے خون سے چاہتا ہے یعنی تو پردوں میں رہتا ہے تاکہ ہم تجھے دیکھ نہ سکیں' دوسری طرف اپنے محبت کرنے والوں کے خون کا طالب ہوتا ہے تاکہ وہ جان دے کر تیرے وجود کو ثابت کر سکیں۔ عاشقانِ توحید نے باطل قوتوں سے ٹکرا کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس خالق کائنات کا وجود ہے۔

۵- بندگی کا مقام اور ہے' عاشقی کا مقام اور ہے (دونوں میں بڑا فرق ہے) فرشتے/ فرشتوں سے تو تو سجدوں کی خواہش رکھتا ہے جبکہ خاکی یعنی انسان سے اس سے زیادہ کی خواہش رکھتا ہے۔ گویا فرشتہ تو صرف سجدہ کرتا ہے جبکہ انسان سجدے میں سر کٹوا لیتا ہے' جو وہ محبوب حقیقی کی رضا کی خاطر کٹواتا ہے۔

۶- میرے پاس جو کچا تانبا ہے اسے میں محبت سے کیمیا بناتا ہوں تاکہ جب میں قیامت کے روز تیرے حضور پیش ہوؤں تو تو مجھ سے تحفے کا تقاضا کرے۔ کچے تانبے سے مراد عام یا محبت سے خالی دل' کیمیا سے مراد محبت بھرا دل یعنی تیرے حضور تیری محبت سے سرشار دل کے ساتھ پیش ہوں گا۔

غزل-۴۰

۱- نورِ تو وانمود سپید و سیاه را دریا و کوه و دشت و در و مهر و ماه را
۲- تو در ہوائے آں کہ نگہ آشنائے وقت من در تلاش آں کہ نتابد نگاه را

۱- تیرے نور نے سفید اور سیاہ کو ظاہر کر دیا' نیز دریا اور پہاڑ اور بیابان اور وادی اور سورج اور چاند کو ظاہر کر دیا۔ مطلب یہ کہ کائنات کی ہر ہر شے میں تیرا جلوہ کارفرما ہے۔ اگر دوسرے شعر کے حوالے سے اس کا مفہوم لیا جائے تو علامہ نے یہ کہنا چاہا ہے کہ انسان کی عقل و فکر نے فطرت کے رازوں سے پردہ اٹھایا ہے (واللہ اعلم)

۲- تجھے اس چیز کی خواہش ہے جس سے تیری نگاہ آشنا ہے (یعنی دیکھ سکتی ہے) جبکہ میں اس ہستی کی تلاش میں ہوں جو نگاہ کی تاب نہیں لا سکتی۔ اس میں مخاطب' محقق اور صاحب فکر ہے' جو زماں و مکاں کی اشیا کا خواہش مند/ طالب ہے' میں سے مراد خود علامہ یا عاشق ہے جو صرف اس خالق کائنات اور خالق زمان و مکاں کی محبت رکھتا ہے جو نظروں کے سامنے نہیں بلکہ پردے میں ہے۔

غزل-۴۱

۱- بده آں دل کہ مستی ہائے اواز بادۂ خویش است بگیر آں دل کہ از خود رفتہ و بیگانہ اندیش است
۲- بده آں دل' بده آں دل کہ گیتی را فرا گیرد بگیر ایں دل' بگیر ایں دل کہ در بند کم و بیش است
۳- مرا اے صید گیر از ترکش تقدیر کن بیروں جگر دوزی چہ می آید ازاں تیرے کہ در کیش است
۴- نگردد زندگانی خستہ از کارِ جہاں گیری جہانے در گرہ بستم جہانے دیگرے پیش است

۱- (خدا سے خطاب ہے) اے خالق و مولا! مجھے وہ دل عطا کر جس کی مستی اپنی شراب

سے ہو۔ مجھ سے تو وہ دل لے لے جو خود سے بے خبر اور مدہوش ہو اور غیروں کے بارے میں سوچتا ہو یعنی مجھے ایسا دل عطا فرما جو اپنی خودی و معرفت سے آگاہ ہو اور مادہ پرستی یا باطل پرستی سے دور ہو۔

۲- مجھے تو ایسا دل عطا فرما' ایسا دل عطا فرما جو دنیا کو تسخیر کر لے اور مجھ سے یہ دل لے لے' یہ دل لے لے جو نفع اور نقصان کے چکر میں پڑا ہوا ہے۔ دنیا کی تسخیر اسی صورت میں ممکن ہے جب دل سراپا خودی و معرفت بن گیا ہو' بصورت دیگر ایسا دل جو خود سے بیگانہ اور دنیاوی ضرورتوں مین الجھا ہوا ہے' ایسا کرنے سے قاصر ہے یعنی تسخیر کائنات اس کے بس کی بات نہیں۔

۳- اے شکاری تو مجھے تقدیر کے ترکش سے باہر نکال۔ بھلا وہ تیر جو تیردان میں ہے' جگر میں کیونکر پیوست ہو سکتا (اور زخمی کر سکتا ہے) مطلب یہ کہ اے خدا تو مجھے تقدیر کے چکر سے نکال اور اپنی رضا کا طالب بنا لے۔ صحیح معنوں میں مجھے اپنا عاشق بنا لے۔

۴- زندگی اس دنیا/ کائنات کو مسخر کرنے سے نہیں تھکتی۔ میں نے ایک جہان تو اپنی گرہ میں باندھ لیا ہے یعنی اس پر قابو پا لیا ہے اور دوسرا جہان میرے سامنے ہے یعنی مسلسل جہد و عمل سے انسان' جو تقدیر کے چکر میں نہیں پھنستا کائنات کی ہر ہر شے کو یکے بعد دیگرے مسخر کرنے میں لگا رہتا ہے (اور ایسا کرنا چاہیے)

غزل-۴۲

۱- کفِ خاک برگ و سازم بر ہے فشانم اورا — بامید ایں کہ روزے بفلک رسانم اورا

۲- چہ کنم چہ چارہ گیرم کہ زشاخ علم و دانش — نہ دمیدہ ہیچ خارے کہ بدل نشانم اورا

۳- دہد آتش جدائی شررِ مرا نمودے — بہ ہماں نفس بمیرم کہ فرونشانم او را

۴- مے عشق و مستی او نرود بروں زخونم — کہ دل آنچناں ندادم کہ دگر ستانم اورا

۵- تو بلوحِ سادۂ من ہمہ مدعا نوشتی — دگر آں چناں ادب کن کہ غلط نخوانم اورا

۶- بحضورِ تو اگر کس غزلے زمن سراید — چہ شود اگر نوازی بہ ہمیں کہ دانم او را

۱- مٹھی بھر خاک (جسم) ہی میرا سارا ساز و سامان ہے' جسے میں راستے میں اس امید پر بکھیر رہا ہوں کہ ایک روز میں اسے آسمان پر پہنچا دوں۔ یہ کہنا چاہا ہے کہ ہوں تو مٹی

سے تخلیق کیا ہوا انسان لیکن اے محبوب حقیقی! میں اس آس میں ہوں کہ تجھ سے وابستگی پیدا کر کے اور تیری راہ میں فنا ہو کر میں زندگی کا اصل اور عظیم مقصد پا لوں گا۔

۲- میں کیا کروں اور اس امر کا کیا چارہ کروں کہ علم و دانش کی شاخ سے کوئی ایسا کاشانہ پھوٹا جسے میں اپنے دل میں بٹھا لوں۔ علم و دانش یا فلسفہ و حکمت نے مجھے عشق کے جذبوں سے محروم رکھا اور میرا دل عشق سے سرشار دل نہ بن سکا۔ فلسفہ و حکمت تو دلیلوں میں الجھا رہتا ہے جبکہ عشق

ع سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

کا عملی نمونہ ہوتا ہے' لہٰذا اگر دل ایسے جذبے سے سرشار نہیں ہے تو وہ محض گوشت کا ایک لوتھڑا ہے۔

۳- جدائی کی آگ میری چنگاری کو ظاہر کر دیتی یا اس میں چمک کا اظہار پیدا کر دیتی ہے۔ میں اسی لمحے مر جاتا ہوں جب میں اسے بجھا دوں۔ مطلب یہ کہ ایک عاشق کو محبوب کی جدائی میں ایک خاص لذت محسوس ہوتی ہے۔ اگر اس کی یہ لذت ختم ہو جائے تو وہ عاشق نہیں رہتا محض مٹی کا ایک پتلا بن کے رہ جاتا ہے۔ بقول مومن خاں مومنؔ:

مرگ ہے انتہائے شوق یاں رہی ابتدائے عشق
زندگی اپنی ہو گئی رنجش بار بار میں

۴- اس کے عشق کی شراب اور اس کی مستی میرے خون سے باہر نہیں نکلتی' اس لیے کہ میں نے اس محبوب کو دل اس طرح نہیں دیا تھا کہ اسے پھر واپس لے لوں۔ میرا عشق (محبوب حقیقی سے عشق) سچے اور مخلص جذبوں کا حامل ہے' وہ محض دکھاوے کی خاطر نہیں ہے کہ جب دل چاہا اظہار کر دیا۔ جب چاہا پیچھے ہٹ گئے۔

۵- تو (خدا) نے میری سادہ/ خالی تختی پر سارا مدعا تحریر فرما دیا۔ اب تو میری اس طرح تعلیم فرما کہ میں اسے غلط نہ پڑھوں۔ مطلب یہ کہ تو نے مجھے زندگی سے نوازا اور اسے بسر کرنے کے انداز سے آگاہ کیا۔ اب ایسا سلسلہ فرما دے کہ میں تیرے حسب منشا زندگی گذاروں۔

۶- اگر (اے خدا) کوئی تیرے حضور میری کوئی غزل پڑھے/ گائے تو تو یہ فرما کر مجھے نواز دے کہ ''میں اسے (علامہ کو) جانتا ہوں۔'' تو کیا ہو جائے گا' تیرا کیا بگڑے گا۔

مطلب یہ کہ تو اسی بہانے مجھ پر نظر کرم فرما۔

غزل-۴۳

۱- ایں دل کہ مرا دادی لبریز یقیں بادا ایں جامِ جہاں بینم روشن تر ازیں بادا

۲- تلخے کہ فرو ریزد گردوں بسفال من درکام کہن رندے آں ہم شکریں بادا

۱- اے محبوب حقیقی/ خالق تو نے مجھے جو دل عطا فرمایا ہے وہ یقین سے پر/ بھرا رہے۔ میرا یہ جام جہاں بیں یعنی دل اس سے بھی زیادہ روشن رہے۔ جمشید کے جام میں دنیا نظر آتی تھی' میرے دل میں کچھ ایسے جذبے بھر دے کہ مجھے ہر وقت تیرا نظارہ ہوتا رہے۔ بقول شاعر:

دل کے آئینے میں ہے تصویر یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

۲- وہ تلخ شراب جو آسمان میرے مٹی کے پیالے میں ڈال رہا ہے' خدا کرے کہ اس پرانے رند کے حلق میں وہ شکر بن جائے۔ مطلب یہ کہ زندگی میں مجھے جن ناموافق حالات کا سامنا کرنا پڑے میں انہیں تیری رضا جانتے ہوئے خندہ پیشانی سے برداشت کرتا رہوں۔ میں گویا:

''سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے''

کا عملی نمونہ بن جاؤں۔

غزل-۴۴

۱- رمزِ عشق تو بہ ارباب ہوس نتواں گفت سخن از تاب وتب شعلہ بہ خس نتواں گفت

۲- تو مرا ذوقِ بیاں دادی و گفتی کہ بگوے ہست در سینہ من آنچہ بکس نتواں گفت

۳- از نہاں خانہ دل خوش غزلے می خیزد سرِشاخے ہمہ گویم بہ قفس نتواں گفت

۴- شوق اگر زندۂ جاوید نباشد عجب است کہ حدیث تو دریں یک دو نفس نتواں گفت

۱- تیرے عشق کی حقیقت اہل ہوس سے بیان نہیں کی جا سکتی/نہیں کہی جا سکتی۔ (اس کی

مثال بالکل اسی طرح ہے جس طرح) شعلے کی تب وتاب کی بات تنکے سے نہیں کہی جا سکتی۔ گویا تنکا آگ میں جلے تو اسے آگ کی کیفیت معلوم ہوتی ہے ورنہ وہ ایک جگہ پڑا رہتا ہے۔ اسی طرح ایک بوالہوس اس وقت تک عشق کی کیفیت سے نا آشنا رہتا ہے جب تک وہ اس سے دور اور ہوس کا شکار رہتا ہے۔

۲۔ (اے خالق) تو نے مجھے بیان/ شاعری کا ذوق عطا فرمایا اور مجھ سے فرمایا کہ تو کہہ (یعنی جو کچھ تیرے دل میں ہے وہ تو دوسروں کے سامنے بیان کر) لیکن (میں کیا کروں) کہ میرے سینے میں جو کچھ ہے وہ ہر کسی سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ مطلب یہ کہ دل کی بات تو اہل دل ہی سے کی جا سکتی ہے۔ ہر کوئی اس کے سننے کا اہل نہیں' یا اسے سننے کی تاب نہیں لا سکتا اور آج کوئی اہل دل نظر نہیں آ رہا جس سے دل کی بات کہی جا سکے۔

۳۔ میرے دل کے نہاں خانہ سے ایک اچھی غزل ابھر رہی/ پیدا ہو رہی ہے۔ یہ غزل کسی شاخ پر بیٹھ کر (اگر وہ میسر آ جائے تو) کہوں گا' پنجرے میں نہیں کہی جا سکتی۔ مطلب یہ کہ یہ دورِ غلامی ہے۔ اس میں یہ نہیں سنائی جا سکتی۔ ہاں آزاد ماحول ہو اور میرے ہم راز بھی میسر ہوں تو ان کے سامنے کہوں ورنہ اس کے مضامین کو نہ سمجھنے والوں کے سامنے ایسا اظہار کرنا بیکار رہے۔

۴۔ اگر شوق/ عشق ہمیشہ رہنے والا نہیں ہے تو یہ حیران کن بات ہے' اس لیے کہ تیری بات ان دو ایک سانسوں میں بیان نہیں کی جا سکتی۔ عشق کے لیے زندگی جاوید کی ضرورت ہے۔ یہ زندگی تو عارضی و فانی ہے۔ بھلا اس میں محبوب حقیقی سے عشق کی کیفیت مکمل طور پر کیونکر بیان ہو سکتی ہے۔

غزل-۴۵

۱۔ یاد ایامے کہ خوردم بادہ ہا با چنگ و نے — جامِ مے در دست من' مینائے مے در دست وے

۲۔ در کنار آئی' خزانِ ما زند رنگ بہار — ور نیائی فرودیں افسردہ تر گردد ز دے

۳۔ بے تو جانِ من چو آں سازے کہ تارش در گست — در حضور از سینۂ من نغمہ خیزد پے بہ پے

۴۔ آنچہ من در بزم شوق آوردہ ام دانی کہ چیست — یک چمن گل' یک نیستاں نالہ یک خمخانہ مے

۵- زندہ کن باز آں محبت را کہ از نیروئے او   بوریائے رہ نشینے در فتد با تخت کے
۶- دوستاں خرم کہ بر منزل رسید آوارہ ے   من پریشاں جادہ ہائے علم و دانش کردہ طے

۱- مجھے وہ دن یاد آ رہے ہیں' یا یاد ہیں جب میں ساز و آواز اور بانسری کے نغموں کے ساتھ شراب/ شرابیں اس طور پیا کرتا تھا کہ شراب کا پیالہ میرے ہاتھ میں ہوتا تھا اور شراب کی صراحی اس (محبوب) کے ہاتھ میں ہوا کرتی تھی۔ گویا علامہ کی جوانی کا آغاز یا دورِ شباب رنگ رلیوں میں گذرا۔

۲- (پہلا شعر تو مجازی ہی معلوم ہوتا ہے' البتہ اب آنے والے اشعار محبوبِ حقیقی کے حوالے سے ہیں) اگر اے محبوب! تو میرے پہلو میں آ جائے تو میری خزاں میں بہار کا سماں آ جائے اور اگر تو نہ آئے تو میری بہار' خزاں سے بھی زیادہ بجھی بجھی سی ہو جائے یعنی میری زندگی کی رونق تیرے ہی دم سے اور تیری ہی توجہ سے ہے' بصورت دیگر یہ ایک بیکار زندگی ہوگی۔

۳- تیرے بغیر میری جان کی حالت بالکل اس ساز کی طرح ہے جس کا تار ٹوٹ گیا ہو' جبکہ تیرے حضور میرے سینے/ دل سے مسلسل نغمے پھوٹنے لگتے ہیں۔ دوسرے شعر والی بات نئے استعارے میں کہی ہے۔

۴- میں جو کچھ بزم شوق میں لایا ہوں' کیا تجھے کچھ خبر ہے کہ وہ کیا ہے؟ (وہ ہے) بیشمار پھول' نالوں/ آہ و فریاد کی کثرت اور شراب سے بھرا مے خانہ۔ مطلب یہ کہ میں تیرے حضور عشق و محبت کے تمام لوازمات کے ساتھ حاضر ہوا ہوں۔

۵- تو پھر سے وہ محبت زندہ/ تازہ کر دے جس کی طاقت سے ایک راہ نشین کا بوریا کیکاؤس یا کیخسرو جیسے بادشاہِ ایران کے تخت سے الجھ پڑے۔ مطلب یہ کہ تیری محبت سے سرشار درویش باطل قوتوں یا مادی قوتوں سے بے خوف و خطر ٹکراتا اور ان کا نام ونشان مٹانے میں لگا رہے۔

۶- دوست خوش ہیں کہ ایک آوارہ منزل پر پہنچ گیا ہے جبکہ میں نے علم و حکمت کے پریشان راستے طے کیے ہیں۔ مطلب یہ کہ دوستوں کو تو مجھ (اقبال) آوارہ منش کی علمی قابلیت یا اعلیٰ تعلیمی/ علم و فلسفہ کی ڈگری ملنے پر خوشی ہوئی ہے لیکن خود مجھے خوشی نہیں ہے' اس لیے کہ علم و حکمت محبوب تک رسائی کی منزل پر پہنچانے سے قاصر ہیں (دوسرے مصرعے کا یہ ترجمہ بھی ہوسکتا ہے کہ میں علم و حکمت کے راستے طے کر کے پریشان ہوں)۔

غزل-۴۶

۱- انجم بگریباں ریخت ایں دیدۂ ترمارا — بیروں زسپہر انداخت ایں ذوقِ نظر مارا
۲- ہر چند زمیں سائیم' برتر زثریا ایم — دانی کہ نمی زیبد عمرے چو شرر مارا
۳- شام و سحر عالم از گردشِ ما خیزد — دانی کہ نمی سازد ایں شام و سحر مارا
۴- ایں شیشہ گردوں را از بادہ تہی کردیم — کم کاسہ مشو ساقی' مینائے دگر مارا
۵- شایانِ جنونِ ما پہنائے دوگیتی نیست — ایں راہ گذر مارا' آں راہ گذر مارا

۱- ہماری ان گیلی/ بھیگی ہوئی آنکھوں نے ہمارے گریبان میں ستارے گرا دیئے' گویا حالت عشق میں آنکھوں سے بہنے والے آنسو قدر و قیمت کے لحاظ سے ستاروں سے بھی بڑھ کر ہیں۔ چنانچہ اس طرح ہم میں جو ذوقِ نظر پیدا ہوا اس نے ہمیں آسمانوں سے اس پار پھینک دیا۔ اس عشق کی بدولت ہم زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہو گئے۔

۲- اگرچہ ہم زمین پر چلنے والے ہیں لیکن در حقیقت ثریا ستارے سے بھی بلند مرتبہ/ بلند تر ہیں۔ تجھے یہ علم ہے کہ ہمیں چنگاری کی سی عارضی زندگی زیب نہیں دیتی۔ ہم سے مراد عشاق ہو سکتے ہیں جو عشق حقیقی کے باعث حیات جاوید پا لیتے ہیں۔

۳- زمانے کے صبح و شام ہماری ہی گردش سے وجود پذیر ہوتے ہیں۔ تجھے یہ علم ہے کہ یہ شام و سحر ہمارے موافق نہیں ہیں۔ گویا زمانے/ کائنات کا وجود ہم انسانوں ہی کے وجود کے باعث ہے۔

۴- ہم نے اس آسمان کے پیالے میں پڑی ہوئی شراب پی کر اسے خالی کر دیا ہے۔ اے ساقی! تو تھوڑی شراب والا نہ بن' تو ایک صراحی اور ہمیں دے یعنی ایک حقیقی عاشق بلند سے بلند تر مرتبہ و مقام کا خواہاں رہتا ہے' ایک ہی مقام پر رہنا اسے گوارا یا پسند نہیں ہوتا۔

۵- دونوں جہانوں کی وسعتیں ہمارے جنون کے لائق/ سزاوار ہیں' یہ (جہان) بھی ہمارے لیے ایک راہ گذر ہے اور وہ (دوسرا جہان) بھی ہمارے لیے ایک راہ گذر ہے۔ مطلب یہ کہ انسان اشرف المخلوقات ہونے کے ناطے ایسی قوتوں اور صلاحیتوں کا مالک ہے جن کی بنا پر اسے دونوں جہانوں پر برتری حاصل ہے۔ وہ دونوں کو اپنی راہ گذر ہی سمجھتا ہے اور یہ سب اس خالق کائنات کے کرم کے باعث ہے۔

غزل-۴۷

۱- خاور کہ آسماں بہ کمند خیال اوست / از خویشتن گسستہ و بے سوزِ آرزوست
۲- در تیرہ خاکِ او تب و تاب حیات نیست / جولانِ موج را نگراں از کنارِ جوست
۳- بت خانہ و حرم ہمہ افسردہ آتشے / پیر مغاں شراب ہوا خوردہ در سبوست
۴- فکر فرنگ پیش مجاز آورد سجود / بینائے کور و مست تماشائے رنگ و بوست
۵- گردندہ تر ز چرخ و ربایندہ تر ز مرگ / از دست او بدامن ما چاک بے رفوست
۶- خاکی نہاد و خو ز سپہر کہن گرفت / عیار و بے مدار و کلاں کار و توبتوست
۷- مشرق خراب و مغرب ازاں بیشتر خراب / عالم تمام مردہ و بے ذوقِ جستجوست
۸- ساقی بیار بادہ و بزم شبانہ ساز / مارا خراب یک نگہ محرمانہ ساز

۱- مشرق یعنی اہل مشرق کہ جن کے خیال کی کمند میں آسمان ہے، خود سے نا آشنا ہو چکے اور سوزِ آرزو سے محروم ہیں۔ وہ محض خیالی پلاؤ پکانے میں لگے رہتے ہیں، جہد و عمل سے بیگانہ ہیں جس کے نتیجے میں غیروں کے محتاج ہو کے رہ گئے ہیں۔

۲- ان کی تاریک مٹی (جسم) میں زندگی کی تب و تاب نہیں ہے (نہیں رہی) وہ (اہل مشرق) ندی کے کنارے ہی سے اس کی موجوں کے اچھلنے کا منظر دیکھتے ہیں۔ ان میں جذبے نہیں رہے اور وہ پوری طرح آرام طلب اور سست الوجود بن گئے ہیں۔

۳- کیا بت خانہ اور کیا کعبہ سب کی آگ ٹھنڈی پڑ چکی ہے یعنی یہاں کے لوگ مذہب سے بھی دور ہو چکے اور الحاد و اوہام کا شکار ہیں اور جو پیر مغاں ہے، اس کے پیالے میں ہوا خوردہ یعنی خراب شراب ہے۔ مطلب یہ کہ مذہبی رہنماؤں کی تعلیمات بھی کچھ اس انداز کی ہیں کہ ان میں کوئی اثر نہیں ہے۔

۴- رہا اہل مغرب/ فرنگ کا معاملہ تو ان کی فکر مجاز کے آگے سر بسجود ہے، وہ سراپا مادہ پرست ہیں اور علم و حکمت ہی کے چکر میں پڑے رہتے ہیں۔ حقیقت کے وہ نزدیک بھی نہیں پھٹکتے۔ وہ ایسے بینا ہیں جو اندھے ہیں کہ حق کو نہیں دیکھ پاتے اور ان کی نگاہیں رنگ و بو کے تماشا میں کھوئی رہتی ہیں۔ گویا دنیا کی ظاہری رونق اور چمک دمک ہی ان کے لیے سب کچھ ہے۔

۵- وہ (اہل مغرب/ یورپ) آسمان سے زیادہ تیز گردش کرنے والے اور موت سے

بڑھ کر لٹیرے ہیں۔ ان کے ہاتھوں سے ہمارے گریبان میں ایسے چاک پڑ گئے ہیں جن کا رفو ہونا/ سیا جانا ممکن نہیں۔ گویا آسمان اپنی گردش سے اتنی تباہی نہیں مچاتا جتنی انہوں نے مچا رکھی ہے اور موت سے بھی بڑھ کر وہ لوگوں کی زندگیاں تباہ کر رہے ہیں۔ اس میں اشارہ ہے ان تباہیوں کی طرف جو یورپی اقوام نے مشرق میں مچائی ہیں اور اہل مشرق کو ان ظالموں نے ایسے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے کہ جس سے ان کا نکلنا محال ہے۔

۶۔ وہ (اہل مغرب) ہیں تو مٹی ہی کی تخلیق (دوسرے انسانوں کی طرح مٹی کے بنے ہوئے ہیں) لیکن ان کی خوخصلت پرانے آسمان سے حاصل کردہ یعنی آسمان کی سی خو خصلت والی ہے۔ وہ مکار' دغا باز' بے اصول' منافق اور چالاک ہیں۔ گویا جس طرح آسمان صدیوں سے اپنی گردش سے' مختلف صورتوں میں تباہی پھیلاتا چلا آرہا ہے' یورپی قومیں بھی اسی انداز میں مشرق میں تباہیاں پھیلانے میں مصروف ہیں۔

۷۔ مشرق خراب ہے اور مغرب اس سے بھی زیادہ خراب ہے۔ پوری دنیا کی حالت مردے کی سی ہے اور وہ ذوق جستجو سے خالی ہے یعنی کسی میں بھی حقیقت یا حق کی تلاش کا ذوق نہیں رہا۔

۸۔ اے ساقی! تو شراب لا اور رات کی محفل کا اہتمام کر' ہمیں اپنی ایک محرمانہ نگاہ سے خراب یا مدہوش کر۔ خدا سے خطاب ہے کہ وہ پھر سے انسانوں کے دلوں میں اپنی محبت کے جذبے پیدا فرما دے تاکہ وہ اپنی تخلیق کے بنیادی مقصد سے آگاہ ہو جائیں اور یوں اپنی موجودہ بیکار اور بے مقصد زندگی سے تائب ہو کر صحیح اور حقیقی انسانی زندگی اختیار کریں۔

غزل-۴۸

۱۔ فرصت کشمکش مده ایں دلِ بیقرار را	یک دو شکن زیاده کن گیسوئے تابدار را
۲۔ از تو درونِ سینه ام برق تجلیی که من	بامه و مهر داده ام تلخی انتظار را
۳۔ ذوق حضور در جهاں رسم صنم گری نهاد	عشق فریب می دهد جانِ امیدوار را
۴۔ تابفراغ خاطرے نغمه تازه ے زنم	بازبه مرغزار ده طائر مرغزار را

۵- طبع بلند دادہ ای بند ز پائے من کشائے — تا بہ پلاس تو دہم خلعت شہریار را
۶- تیشہ اگر بسنگ زد ایں چہ مقام گفتگو است — عشق بدوش می کشد ایں ہمہ کوہسار را

۱- (اے محبوب حقیقی) تو میرے اس بے قرار دل کو کشمکش سے فرصت کا موقع نہ دے، اپنی چمک دمک والی اور بل کھاتی ہوئی زلفوں میں دو ایک شکن اور زیادہ کر دے۔ مطلب یہ کہ مجھے اپنے جلوؤں میں کچھ اس حد تک محو رکھ کہ میں زندگی بھر انہی میں کھویا رہوں۔

۲- تیری محبت کے نتیجے میں میرے سینے کے اندر تجلی کی ایسی بجلی چمک رہی ہے کہ اس کے لیے میں نے چاند اور سورج کو بھی انتظار کی تلخی دے رکھی ہے (عربی ضرب المثل ہے: "الانتظار اشد من الموت" انتظار موت سے بھی زیادہ شدید ہے۔ کچھ اسی حوالے سے تلخی کا لفظ استعمال ہوا ہے) مطلب یہ کہ تجلی کی یہ چمک ایسی ہے کہ چاند اور سورج بذات خود روشن ہوتے ہوئے بھی اس کے دیکھنے کے لیے بیقرار ہیں، انتہائی تجلی کی بات کی ہے۔

۳- (محبوب حقیقی کو) اپنے سامنے دیکھنے کے ذوق وشوق نے دنیا میں بت گری کی رسم ڈالی۔ عشق ایسی امید (سامنے دیکھنا) رکھنے والی جان کو فریب دیا ہی کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ انسانوں نے اپنی اپنی اہلیت ولیاقت اور اپنے جذبوں کے تحت خدا کو بتوں کی صورت دیدی، بت تراش لیے۔ گویا عشق انہیں اس طرف لے آتا ہے کہ اگر محبوب سامنے نہیں ہے تو کیا ہوا، تم اسے بت کی صورت میں اپنے سامنے رکھ لو۔

۴- اس خاطر کہ میں اپنے دل کے سکون واطمینان کے لیے کوئی تازہ نغمہ چھیڑوں، تو سبزہ زار کے پرندے کو پھر سے سبزہ زار کے حوالے کر دے یعنی میرا دل ماسوا اللہ کی محبت میں گرفتار ہے۔ اے خدا تو اسے پھر سے حق شناس بنا دے کہ اسی سے اسے سکون بھی میسر آئے گا اور اسی کی بدولت وہ حق کی طرف بھی متوجہ ہوگا۔

۵- تو (خدا) نے مجھے بلند طبع سے نوازا ہے، تو میرے پاؤں کی زنجیر بھی کھول دے، تاکہ میں تیرے عطا کردہ موٹے کپڑے کی خاطر بادشاہ کی خلعت چھوڑ دوں یعنی میں کسی کا محتاج نہ رہوں اور تیرے عطا کردہ ساز وسامان پر ہی شاکر وصابر رہوں۔

۶- اگر فرہاد نے (کوہ بیستوں پر نہر جاری کرنے کے لیے) تیشہ چلایا ہے تو یہ کون سی ایسی بات ہے جس کا ذکر کیا جائے۔ عشق تو اس تمام پہاڑی سلسلے کو کندھوں پر اٹھا لیتا ہے۔ گویا عشق میں ایسی قوت ہے کہ وہ مشکل سے مشکل اور ناممکن کارنامے کو بہ آسانی انجام دے لیتا ہے۔

غزل-۴۹

۱- جانم در آویخت با روزگاراں جوے است نالاں در کوہساراں
۲- پیدا ستیزد' پنہاں ستیزد ناپایدارے با پایداراں
۳- ایں کوہ و صحرا' ایں دشت و دریا نے رازداراں' نے غم گساراں
۴- بیگانۂ شوق ' بیگانۂ شوق ایں جویباراں ' ایں آبشاراں
۵- فریاد بے سوز' فریاد بے سوز بانگ ہزاراں در شاخساراں
۶- داغے کہ سوزد در سینہ من آں داغ کم سوخت در لالہ زاراں
۷- محفل ندارد ' ساقی ندارد تلخے کہ سازد با بے قراراں

۱- میری جان زمانوں (زمان و مکاں/کائنات) سے الجھ پڑی ہے یا متصادم ہے اور یہ کیفیت بالکل اسی طرح ہے جس طرح پہاڑوں میں کوئی ندی فریاد کر رہی ہو۔ پہاڑ پر پتھروں سے ٹکرانے کے باعث ندی کے پانی میں شور پیدا ہوتا رہتا ہے جسے فریاد یا واویلا کرنے سے تشبیہ دی ہے (اگلا شعر اس کے ساتھ ہے)

۲- یہ کائنات میری جان سے کبھی تو ظاہری طور پر یا کھلم کھلا الجھتی ہے اور کبھی پوشیدہ طور پر الجھتی ہے۔ گویا اس عارضی و فانی کائنات/جہان سے میری بقا والی روح کا ٹکراؤ رہتا ہے۔

۳- یہ پہاڑ اور صحرا اور یہ دشت و دریا (میرے یعنی انسان کے) نہ تو محرم و رازدار ہی ہیں اور نہ غم گسار و ہمدرد ہیں۔ مطلب یہ کہ کائنات کی کوئی بھی شے انسان کی غمزدہ حالت کو نہیں سمجھ سکتی۔ اس لیے کہ وہ سوز و درد سے عاری ہے۔ گویا:

میرے غم کو وہ ہی سمجھے جو ہو خود غموں میں ڈوبا

۴- یہ ندیاں اور یہ آبشاریں بھی شوق سے بیگانہ ہیں۔ شوق سے بیگانہ ہیں' ان میں انسانوں والا جذبہ عشق نہیں ہے۔

۵- شاخوں پر بلبلوں کی آواز بے سوز فریاد ہے' بے سوز فریاد ہے۔ اس میں کوئی اثر نہیں ہے۔ گویا ان شعروں میں علامہ نے کائنات کی دوسری مخلوق کے حوالے سے یہ بتانا چاہا ہے کہ ان میں انسانوں والے عشق کے جذبے اور سوز و درد نہیں ہیں۔

۶- وہ داغ جو میرے سینے میں جل رہا ہے' وہ داغ لالہ زاروں میں نہیں جلا۔ انسان کا

داغ عشق کی علامت ہے۔ لالہ کے پھول میں بھی داغ ہوتا ہے لیکن اس میں وہ کیفیت نہیں ہے جو مذکورہ داغ میں ہوتی ہے۔ شعر ۵ والی بات۔

۷۔ نہ تو محفل میں ایسی تلخ شراب ہے جو بیقراروں کے ساتھ موافقت کرے اور نہ وہ ساقی ہی کے پاس ہے۔ مطلب یہ کہ عشق کا علاج کسی کے پاس نہیں۔ گویا بقول شاعر:

مریض عشق پر رحمت خدا کی
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

ویسے بھی بقول سعدیؔ اگر ایک عاشق کا دل صابر ہے تو وہ پتھر ہے کیونکہ عشق اور صبر کے درمیان ہزار کوس کا فاصلہ ہے:

دِلے کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است
زعشق تابہ صبوری ہزار فرسنگ است

غزل-۵۰

۱- بہ تسلّی کہ دادی نگذاشت کارِ خود را — بتوبازمی سپارم دل بیقرار خود را
۲- چہ دلے کہ محنت او زنفس شماری او — کہ بدست خود ندارد رگِ روزگارِ خود را
۳- بضمیرت آرمیدم تو بجوش خود نمائی — بکنارہ برفگندی دُرِ آب دارِ خود را
۴- مہ و انجم از تو دارد گلہ ہا شنیدہ باشی — کہ بخاک تیرۂ ما زدہ ای شرارِ خود را
۵- خلشے بسینۂ ما ز خدنگِ او غنیمت — کہ اگر بپایش افتد نبرد شکارِ خود را

۱- (اے میرے چارہ گر) تو نے جو میرے بیقرار دل کو تسلی دی ہے، اس سے بھی اس نے اپنے اس عمل (بیقراری) کو نہیں چھوڑا، لہٰذا میں اپنے اس بیقرار دل کو پھر تیرے حوالے کر رہا ہوں، تاکہ تو اب اس کی تسلی کا کوئی اور سامان کرے لیکن بات پھر وہی آتی ہے کہ مریض عشق کا کوئی علاج نہیں، علاج سے الٹا اس مرض میں اضافہ ہوتا رہتا ہے (مریض عشق پر......الخ)

۲- کیسا ہے وہ دل کہ جس کی تکلیف/محنت اس کی نفس شماری کے باعث ہے، چاروناچار زندگی گذارنے میں ہے، اس لیے کہ اس کے ہاتھ میں زمانے کی رگ نہیں ہے یعنی عشق سے خالی دل اس کائنات کی مجبوریوں میں جکڑا رہتا ہے اور یوں اس کی کوئی

قدر و قیمت نہیں رہتی۔

۳۔ میں نے تیرے دل/ضمیر میں آرام کیا لیکن تو نے خودنمائی کے جوش میں اپنے چمکدار موتی کو دریا سے نکال کر کنارے پر پھینک دیا یعنی قرآنی حوالے سے یہ کہنا چاہا ہے کہ یہ کائنات عدم تھی، اس کا کوئی وجود نہ تھا، خدا نے چاہا کہ ''میں پہچانا جاؤں'' اس لیے اس نے یہ کائنات پیدا کر دی۔ یہ گویا اس کا اظہار خودنمائی تھا جو اس کائنات کی تخلیق کا باعث بنا اور وہ عدم سے وجود میں آ گئی۔ یہ عمل ایک طرح سے موتی کو دریا سے نکال کر کنارے پر پھینکنا ہے۔

۴۔ اے خالق کائنات تو نے سنا ہو گا کہ چاند اور ستاروں کو تجھ سے گلے شکوے ہیں، جو کچھ یوں ہیں کہ تو نے ہماری تاریک مٹی/خاکی جسم میں اپنی چنگاری ڈالی ہے۔ یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ ان میں انسانوں کا سا دل اور جذبہ عشق اور سوز و درد نہیں ہے۔

۵۔ ہمارے سینے میں اس کے ایک تیر کی خلش/چبھن بھی غنیمت ہے، اس لیے کہ وہ (محبوبِ حقیقی) ایک ایسا شکاری ہے کہ اگر خود شکار اس کے پاؤں میں آ گرے تب بھی وہ اسے نہ لے جائے، وہ ذات بڑی بے نیاز ہے۔

غزل-۵۱

۱۔	بحرفے می تواں گفتن تمنائے جہانے را	من از ذوقِ حضوری طول دادم داستانے را
۲۔	زمشتاقاں اگر تابِ سخن بردی، نمی دانی	محبت می کند گویا نگاہِ بے زبانے را
۳۔	کجا نورے کہ غیر از قاصدی چیزے نمی داند	کجا خاکے کہ در آغوش دارد آسمانے را
۴۔	اگر یک ذرہ کم گردد ز انگیز وجودِ من	بایں قیمت نمی گیرم حیاتِ جاودانے را
۵۔	من اے دریائے بے پایاں بہ موجِ تو در افتادم	نہ گوہر آرزو دارم نہ می جویم کرانے را
۶۔	ازاں معنی کہ چوں شبنم بجانِ من فرو ریزی	جہانے تازہ پیدا کردہ ام عرضِ فغانے را

۱۔ ایک دنیا کی تمنا ایک حرف میں بیان کی جا سکتی ہے لیکن میں نے تیرے حضور رہنے کے ذوق کی بنا پر اپنی داستان کو طول دیا ہے۔ عاشق کو محبوب کا قرب میسر آ جائے تو اس کے لیے یہ سب کچھ ہے، اس لیے وہ کوشش کرتا ہے کہ اپنی بات کو طول دیتا جائے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ دیر تک اس قرب سے محفوظ ہوتا رہے ورنہ تو بڑی سے بڑی

خواہش بھی چند لفظوں میں بیان کی جا سکتی ہے۔

۲۔ اگر تو (محبوب حقیقی) نے اپنے چاہنے والوں سے بات کرنے کی طاقت چھین لی ہے (تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے تو شاید) نہیں جانتا کہ محبت ایک بے زبان نگاہ کو بھی بولنے والی بنا دیتی ہے یعنی عاشق اپنے دل کا حال اپنی نگاہوں سے بیان کر دیتا ہے۔ ان نگاہوں کے انداز سے پتا چل جاتا ہے کہ اس پر کیا گذر رہی ہے۔

۳۔ کہاں ایک نوری مخلوق یعنی (فرشتے) کہ جسے خدا کی پیغام رسانی کے سوا اور کسی چیز کا علم نہیں اور کہاں ایک مٹی کی مخلوق (یعنی انسان) کہ جس کی آغوش میں ایک آسمان ہے یعنی وہ کائنات کو مسخر کرنا جانتا ہے۔

۴۔ اگر میرے وجود کے ابھار سے ایک ذرہ بھی کم ہو جائے تو میں اس قیمت پر حیاتِ جاوداں بھی نہ لوں گا۔ مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ اصل زندگی یا کائنات تو میں ہوں' کائنات تو میرے وجود کے باعث وجود میں آئی ہے۔

۵۔ اے بے کنار سمندر میں تیری موجوں سے لپٹ گیا ہوں۔ مجھے نہ تو کسی گوہر کی تمنا ہے اور نہ میں ساحل ہی کی تلاش میں ہوں۔ بے کنار سمندر خدا تعالیٰ کے لیے استعارہ ہے یعنی اے محبوبِ حقیقی میں تیرا ہو گیا ہوں اور جب تیرا ہو گیا ہوں تو میرے دل میں کوئی اور آرزو نہیں رہی' مجھے اور کسی چیز کی ضرورت نہیں رہی کہ میرے لیے تو ہی سب کچھ ہے۔

۶۔ ان حقائق سے جو تو نے میری جان میں شبنم کی طرح ڈالے/ نازل کیے ہیں' میں نے اپنی فریاد و فغاں کے اظہار کے لیے ایک نئی دنیا پیدا کر لی ہے۔ مطلب یہ کہ میں مذکورہ حقائق کو اپنی شاعری کے ذریعے دوسروں تک پہنچانے کا فریضہ انجام دے رہا ہوں۔

غزل-۵۲

۱۔ چند بروے خود کشی پردۂ صبح و شام را — چہرہ کشا تمام کن جلوۂ ناتمام را
۲۔ سوز و گداز حالتے است' بادہ ز من طلب کنی — پیش تو گر بیاں کنم مستی ایں مقام را
۳۔ من بسرودِ زندگی آتش او فزودہ ام — تو نم شبنمے بدہ لالۂ تشنہ کام را
۴۔ عقل ورق ورق بگشت عشق بہ نکتہ ے رسید — طائر زیرکے برد دانہ زیرِ دام را

۵- نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست سوے قطار می کشم ناقہ بے زمام را
۶- وقت برہنہ گفتن است من بہ کنایہ گفتہ ام خود تو بگو کجا برم ہم نفسانِ خام را

۱- (اے محبوب حقیقی) تو کب تک اپنے چہرے پر صبح اور شام کا پردہ ڈالے رکھے گا۔ اپنے چہرے سے پردہ ہٹا اور اپنے ناتمام یعنی جو کھل کر نظر نہیں آتا' جلوے کو پوری طرح ظاہر فرما یعنی یوں تو کائنات کی ہر ہر شے میں اس محبوب کا جلوہ کارفرما ہے لیکن عاشق اسے واضح طور پر اپنے سامنے دیکھنے کا آرزومند ہے اور اسی بات کا اظہار کر رہا ہے۔

۲- عشق میں سوز و گداز ایک ایسی حالت ہے کہ جس سے عاشق سرور و مستی میں کھویا رہتا ہے لیکن تو مجھ سے ظاہری شراب طلب کر رہا ہے۔ اگر میں تجھ سے اس مقام یعنی عشق کے سوز و گداز اور مستی کی بات بیان کروں تو تجھ پر کھل جائے گا کہ اس سے بڑھ کر مست کرنے والی کوئی اور شراب نہیں ہے۔

۳- میں نے زندگی کا نغمہ سنا کر اس (لالہ کے پھول) کی آگ کو بھڑکایا ہے تو (اے خالق) اس پیاسے لالہ کو شبنم کی نمی عطا فرما۔ لالہ سے مراد اہل عشق ہو سکتے ہیں (بعض شعروں میں علامہ نے ملت کے لیے یہ استعارہ استعمال کیا ہے) مطلب یہ کہ میں نے ان کی آتش عشق کو تیز کیا ہے' تو ان پر توجہ فرما اور اپنے فیضان کی بدولت ان کو اپنی معرفت سے نواز۔

۴- عقل نے زندگی اور کائنات کی کتاب کا ایک ایک ورق دیکھا/ پڑھا (لیکن پھر بھی وہ زندگی کی رمز سے آگاہ نہ ہو سکی جبکہ) عشق نے یہ رمز پا لی۔ بات یہ ہے کہ ایک زیرک پرندہ ہی جال سے دانہ اڑا لے جاتا ہے۔ عشق کے لیے طائرِ زیرک کا استعارہ استعمال کیا ہے۔ عقل دلیلوں کے جال میں پھنسی رہتی ہے جبکہ عشق جذبوں کی بنا پر کائنات وغیرہ کے اسرار سے آگاہ ہو جاتا ہے۔

۵- کہاں نغمہ اور کہاں میں' شاعری کا ساز تو محض نغمہ پیدا کرنے کا ایک بہانہ ہے' میں تو نغمہ چھیڑ کر بے لگام اونٹنی کو قطار کی طرف لا رہا ہوں۔ بے لگام اونٹنی منتشر ملت اسلامیہ کے لیے استعارہ ہے یعنی میں اپنی اس ملت کو ایک مرکز کی طرف لانے کے لیے شاعری کر رہا ہوں۔

۶- یہ وقت تو بات کو کھل کر اور صاف صاف بیان کرنے کا ہے جبکہ میں اشاروں کنایوں

میں کہہ رہا ہوں۔ تو خود ہی بتا کہ میں جذبوں سے عاری ان ساتھیوں کو کہاں لے جاؤں۔ میں کیا انداز اختیار کروں کہ وہ میری صاف یا تیکھی باتیں سنیں اور ان کا اثر لے کر خود کو جذبوں سے سرشار کر لیں۔

(جملہ معترضہ کے طور پر اگر دیکھا جائے تو انسانی نفسیات کچھ ایسی ہے کہ وہ براہ راست وعظ سے اتنا متاثر نہیں ہوتی جس قدر قصے کہانیوں یا اشاروں کنایوں سے ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا رومی اور شیخ سعدی نے قصہ کہانی کا انداز اپنایا)۔

غزل-۵۳

۱- نفس شمار بہ پیچاکِ روزگارِ خودیم — مثال بحر خروشیم و درکنار خودیم
۲- اگرچہ سطوت دریا اماں بکس ندہد — بخلوت صدف او نگاہدار خودیم
۳- زجوہرے کہ نہان است در طبیعت ما — مپرس صیرفیاں را کہ ما عیار خودیم
۴- نہ از خرابہ ماکس خراج می خواہد — فقیر راہ نشیمیم و شہریار خودیم
۵- درونِ سینہ ما دیگرے! چہ بوالعجبی است — کرا خبر کہ توئی یا کہ ما دوچارِ خودیم
۶- کشائے پردہ زتقدیر آدمِ خاکی — کہ ما بہ رہگذر تو در انتظار خودیم

۱- ہم زمانے کے چکر میں نفس شماری کر رہے ہیں، ہم سمندر کی طرح شور برپا کر رہے ہیں اور اپنے ساحل کے اندر بہہ رہے ہیں یعنی انسان کی زندگی مجبوریوں اور مشکلوں سے دوچار رہتی ہے۔ انسان کتنی بھی روحانی ترقی کر لے وہ بشر ہی رہے گا، خدا نہیں بن سکے گا۔

۲- اگرچہ سمندر کا دبدبہ کسی کو پناہ نہیں دیتا (حفاظت نہیں کرتا) لیکن ہم اس کی سیپی کی خلوت میں اپنے محافظ خود ہیں۔ مطلب یہ کہ اگرچہ زمانے کے حادثات اور مشکلات انسانی زندگی کی تباہی کا باعث ہیں لیکن اللہ پر ایمان کامل رکھنے والے چونکہ اس کی رضا کے آگے سرِ تسلیم خم رکھتے ہیں اس لیے وہ ان حادثات وغیرہ کو اس کی رضا سمجھتے ہوئے ہر طرح کے خوف سے بے نیاز ہوتے ہیں۔

۳- اس جوہر کے بارے میں جو ہماری طبیعت میں چھپا ہوا ہے، تو صرافوں سے مت پوچھ کیونکہ ہم اپنی پرکھ آپ ہیں۔ گویا اگر ایک انسان جذبہ انسانیت سے سرشار ہے تو وہ

فطری طور پر زندگی کے کھرے کھوٹے سے آگاہ ہوگا۔

۴۔ ہمارے ویرانے سے کوئی خراج /محصول وصول کرنا نہیں چاہتا' اس لیے کہ ہم تو ایک راہ نشین ہیں اور اپنے بادشاہ آپ ہیں۔خراج بادشاہ وصول کرتا ہے۔یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ جو اس دنیاوی دولت اور دھندوں سے بے نیاز ہے اور وہ صرف بنیادی ضرورتوں کی خاطر کچھ کماتا ہے۔اس سے خراج کیسا؟ اس لحاظ سے وہ آپ اپنا بادشاہ ہے۔

۵۔ ہمارے سینے میں کوئی اور ہو؟ یہ کیسی عجیب بات ہے' کسی کو کیا خبر کہ ہمارے سینے میں تو سمایا ہوا ہے یا ہم خود ہی سے دوچار ہیں یا آمنے سامنے ہیں۔گویا مسئلہ وحدت الوجود کے حوالے سے یہ کہا ہے کہ دوئی وہم ہے' صرف اس کی ذات ہی کائنات کی ہر شے میں جلوہ گر ہے۔

۶۔ تو مٹی سے تخلیق شدہ انسان کی تقدیر سے پردہ ہٹا (یعنی بتا کہ وہ کیا ہے) کیونکہ ہم تو تیری راہ میں اپنے ہی انتظار میں ہیں یعنی آدمی خدا کی تلاش کرتے کرتے خود کو پالیتا اور اپنی تلاش میں خدا تک رسائی حاصل کر لیتا ہے اور یوں واضح ہو جاتا ہے کہ اس کائنات میں صرف وہ ہی وہ ہے (وحدت الوجود)

غزل-۵۴

۱۔ بہ فغاں نہ لب کشودم کہ فغاں اثر ندارد	غم دل نگفتہ بہتر ہمہ کس جگر ندارد
۲۔ چہ حرم' چہ دیر ہر جا سخنے ز آشنائی	مگر ایں کہ کس ز راز من و تو خبر ندارد
۳۔ چہ ندیدنی است ایں جا کہ شرر جہانِ مارا	نفسے نگاہ دارد نفسے دگر ندارد
۴۔ تو زراہِ دیدۂ ما بضمیر ما گذشتی	مگر آں چناں گذشتی کہ نگہ خبر ندارد
۵۔ کس ازیں نگیں شناساں نگذشت بر نگینم	بتومی سپارم او را کہ جہاں نظر ندارد
قدحِ خرد فروزے کہ فرنگ داد مارا	ہمہ آفتاب لیکن اثر سحر ندارد

۱۔ میں نے آہ و فغاں کے لیے ہونٹ نہ کھولے (فریاد و فغاں نہ کی) اس لیے کہ فغاں کا کوئی اثر نہیں ہے۔سو غم دل کا اظہار نہ کرنا ہی بہتر ہے کیونکہ اس کے سننے کا ہر کسی میں حوصلہ نہیں ہے۔

۲- کیا کعبہ اور کیا بت خانہ، ہر جگہ تیری آشنائی کی باتیں ہیں، گویا ہر کوئی تری معرفت کے دعوے کرتا ہے اور یہ اس وجہ سے ہے کہ کسی کو ''میں اور تو'' کے راز کا علم نہیں ہے۔ گویا خودی سراسر خدا اور خدا سراسر خودی ہے۔

۳- یہاں یہ کیا نہ دیکھنے کے لائق حالت ہے کہ سوزِ عشق ایک پل تو ہمیں نگاہ میں رکھتا ہے یا ہماری نگہداری کرتا ہے اور دوسرے لمحے میں نہیں کرتا۔ تصوف کی اصطلاحوں ''بسط'' اور ''قبض'' کے مطابق کبھی تو سالک پر محبوب حقیقی کا فیضان نازل ہوتا ہے (یہ بسط ہے) اور کبھی نہیں (یہ قبض ہے)

۴- تو ہماری آنکھوں کی راہ سے ہمارے ضمیر/ دل میں گذرا لیکن کچھ اس طور گذرا کہ ہماری نگاہوں کو خبر تک نہیں ہوئی۔ قرآنی تلمیح کے مطابق خدا انسان کی شہ رگ کے قریب ہے' یہ گویا اس کا نگاہ کے راستے دل میں گذرنا یا اترنا ہے لیکن چونکہ وہ روبرو نہیں ہوتا' اس لیے ایسا کہا کہ نگاہوں کو خبر نہ ہوئی۔

۵- ان نگین شناسوں میں سے کسی نے بھی میرے نگین پر توجہ نہیں کی' لہٰذا میں اپنے نگین کو تیرے سپرد کرتا ہوں کیونکہ دنیا والوں میں اس کی پہچان اور شناخت کرنے والی نظر نہیں ہے۔ نگین استعارہ ہے عاشق کے دل کا۔ گویا اہل دنیا مادیت پرست اور دنیاوی دولت کے شیدائی ہیں۔ اس لیے وہ میرے دل کی قدر و قیمت اور اہمیت سے نا آشنا ہیں' اس لیے اے خالق تو اسے واپس لے لے کہ تو ہی اس کی قدر و اہمیت جانتا ہے۔

۶- یورپ نے ہمیں عقل و خرد کو روشن کرنے والی شراب کا جو پیالہ دیا وہ اگرچہ سراسر آفتاب ہے لیکن ایسا آفتاب کہ جس میں صبح کا اثر نہیں ہے۔ سورج طلوع ہوتا ہے تو دنیا روشن ہو جاتی ہے لیکن یورپ کے علم و دانش میں اگرچہ روشنی ہے لیکن یہ ایسی روشنی ہے جو صرف ذہن کو روشن کرتی ہے جبکہ دل جو سوز و جذبہ کا سرچشمہ ہے' اس سے تاریک ہو جاتا ہے۔ اس میں جذبے پیدا ہونے ختم ہو جاتے ہیں۔

غزل-۵۵

۱- ما کہ افتندہ تراز پرتو مہ آمدہ ایم ۔۔۔ کس چہ داند کہ چساں ایں ہمہ رہ آمدہ ایم

۲- بارقیباں سخن از دردِ دل ما گفتی ۔۔۔ شرمسار از اثر نالہ و آہ آمدہ ایم

۳۔ پردہ از چہرہ بر افگن کہ چو خورشید سحر — بہر دیدارِ تو لبریز نگہ آمدہ ایم
۴۔ عزم مارا بہ یقیں پختہ ترک ساز کہ ما — اندریں معرکہ بے خیل و سپہ آمدہ ایم
۵۔ تو ندانی کہ نگاہے سرِ راہے چہ کند — در حضورِ تو دعا گفتہ برہ آمدہ ایم

۱۔ ہم انسان جو چاندکی چاندنی سے بھی زیادہ گرے پڑے روئے زمین پر آئے ہوئے ہیں' کسی کو کیا خبر کہ ہم نے یہ سارا راستہ کیونکر یا کس طرح طے کیا ہے۔ پہلے انسان' روح کی صورت میں اور عالم بالا میں تھا۔ بعد میں خالق نے اسے جسم کی صورت دیدی اور اسے زمین پر اتار دیا گیا۔ گویا ہم عالم علوی سے عالم سفلی میں آگئے۔ یہ سفر کس طرح طے ہوا' اس کی کسی کو خبر نہیں۔

۲۔ تو نے رقیبوں سے ہمارے دردِ دل کا حال بیان کیا' ہم اپنے نالہ و آہ کے اثر سے شرمسار ہوئے ہیں یا آئے ہیں۔ مطلب یہ کہ رقیبوں کو یہ جان کر خوشی ہوئی ہوگی کہ محبوب نے ہمارے نالہ و آہ کا کوئی اثر نہیں لیا' اس بات سے ہم شرمندہ ہو کر اس کی محفل سے اٹھ آئے ہیں۔

۳۔ تو (اے محبوب حقیقی) اپنے چہرے سے پردہ اٹھا دے کیونکہ ہم صبح کے سورج کی مانند تیرے دیدار کے لیے سراپا نگاہ بن کر آئے ہیں۔ سراپا نگاہ بننا انتہائی خواہش دیدار کی علامت ہے۔

۴۔ تو ہمارے ارادے کو یقین سے اور زیادہ پختہ/ مضبوط فرما دے کیونکہ ہم اس معرکہ میں گھوڑوں اور فوج کے بغیر آئے ہوئے ہیں۔ زندگی میں انسان کو مختلف حوادث یا باطل قوتوں سے سامنا رہتا ہے۔ اگر انسان میں قوی ارادے ہوں تو وہ بے سرو سامانی کی حالت میں بھی ان قوتوں سے خوف زدہ ہونے کی بجائے ان سے ٹکرا کر اپنی بقا کا سامان کر لیتا ہے۔ اسی لیے قوی ارادے کے لیے دعا کی گئی ہے۔

۵۔ تجھے خبر نہیں کہ کسی کی سرِ راہ نگاہ کیا کچھ کرتی ہے۔ ہم تیرے حضور دعا مانگ کر راستے میں آگئے ہیں یعنی ایسی نگاہ دیکھنے والے کو لوٹ لیتی یا اپنا شیدائی بنا لیتی ہے اور چونکہ ہمیں اس کیفیت و حالت کا علم ہے اس لیے ہم یہ دعا کر کے چلے ہیں کہ خدا خیر کرے کہیں ہمیں ایسی نگاہ لوٹ نہ لے۔

غزل-۵۶

۱-	اے خدائے مہر ومہ خاک پریشانے نگر	ذرہ ے درخود فرو پیچد بیابانے نگر
۲-	حسن بے پایاں درونِ سینہ ے خلوت گرفت	آفتاب خویش را زیر گریبانے نگر
۳-	بر دل آدم زدی عشق بلا انگیز را	آتش خود را بآغوش نیستانے نگر
۴-	شوید از دامانِ ہستی داغہاے کہنہ را	سخت کوشی ہائے ایں آلودہ دامانے نگر
۵-	خاک ماخیزد کہ سازد آسمانے دیگرے	ذرہ ناچیز و تعمیر بیابانے نگر

۱- اے سورج اور چاند کے خدا ذرا پریشان/منتشر خاک کو دیکھ' ذرا دیکھ کہ ایک ذرے نے کس طرح بیابان کو خود میں سمو لیا ہے۔ انسان مٹی سے بنایا گیا ہے' اسی لیے خود کو منتشر خاک کہا ہے۔ اسی حوالے سے اپنے لیے ذرے کا استعارہ استعمال کیا ہے۔ کہنا یہ چاہا ہے کہ ہوں تو میں مٹی کی تخلیق لیکن تیرے عشق نے مجھ میں تیری (خدائی) صفات پیدا کر دی ہیں۔

۲- لامحدود حسن نے ایک سینے/دل میں تنہائی اختیار کر لی۔ تو (اے محبوب حقیقی) اپنے آفتاب کو ایک گریبان کے نیچے دیکھ۔ ایک سے مراد میرا ہے۔ مطلب یہ کہ انسان تیری یعنی خدا کی صفات کا مظہر ہے۔

۳- تو (محبوب حقیقی) نے انسان کے دل پر اپنا بلا انگیز عشق مارا یعنی پیدا کیا ہے۔ تو ذرا ایک نیستان کی آغوش میں اپنی آگ کو دیکھ۔ جس طرح کسی نیستاں (سرکنڈوں کے جنگل) میں آگ لگ جائے تو وہ پھیلتی ہی چلی جاتی ہے کچھ اسی طرح عشق ایک عاشق کو اپنی آگ میں جلائے رکھتا ہے' تا آنکہ اس کی حالت راکھ کی سی ہو جاتی ہے۔

۴- تو اس آلودہ دامن کی سخت کوشی تو ملاحظہ فرما کہ وہ ہستی کے دامن سے پرانے داغ دھو ڈالتا ہے۔ مطلب یہ کہ انسان جس کا دامن دنیاوی آلودگیوں سے بھرا ہوتا ہے' جب تیرے عشق کے جذبے سے سرشار ہو جاتا ہے تو اس کی دنیا ہی بدل جاتی ہے۔ وہ ایک عظیم اور صاحب بقا انسان بن جاتا ہے۔

۵- ہماری خاک اٹھتی ہے کہ وہ ایک نیا آسمان تعمیر کرے۔ ذرا ملاحظہ فرما کہ یہ ایک ناچیز ذرہ (کس طرح) ایک بیابان کی تعمیر کا سوچ رہا ہے۔ مطلب یہ کہ اے محبوب حقیقی تیرے عشق میں وہ عظیم قوت ہے کہ جس سے تیرے عاشق میں ایسی زبردست صلاحیتیں اور قوتیں پیدا ہو جاتی ہیں جن سے وہ بڑے بڑے معرکے آسانی سے مار لیتا ہے۔

زبورِعجم

حصہ دوم

شاخِ نہالِ سدرہ ای خار و خس چمن مشو
منکر او اگر شدی منکر خویشتن مشو

= تو سدرہ درخت کی شاخ ہے، چمن کا کانٹا تنکا (کوڑا کرکٹ) نہ بن۔ اگر تو اس (خدا) کا منکر ہو گیا ہے تو اپنا منکر نہ بن۔ اس کا مخاطب انسان یا مسلمان ہے۔ شب معراج کی قرآنی تلمیح کے حوالے سے بات کی ہے۔ حضور اکرمؐ تو عرش کی طرف بڑھے لیکن آپؐ کو لے جانے والے جبرئیلؑ سدرہ سے آگے نہ جا سکے۔ گویا بشر کا مقام اعلیٰ ہے۔ علامہ اسی حوالے سے کہتے ہیں کہ تیرا (بشر کا) وجود اس ذاتِ اقدس کی صفات کا مظہر ہے۔ جب تجھ میں یہ صفات (نیک اعمال کی بنا پر) پیدا ہو جائیں گی تو تو خدا کے وجود کا قائل ہو جائے گا اور تجھ پر یہ نکتہ واضح ہو جائے گا کہ بشر کائنات کے لیے نہیں بلکہ کائنات بشر کے لیے وجود میں لائی گئی ہے۔

۱۔ دو عالم را تواں دیدن بمینائے کہ من دارم — کجا چشمے کہ بیند آں تماشائے کہ من دارم
۲۔ دگر دیوانہ ے آید کہ در شہر افگند ہوئے — دو صد ہنگامہ برخیز د ز سودائے کہ من دارم
۳۔ مخور ناداں غم از تاریکی شبہا کہ می آید — کہ چوں انجم درخشد داغِ سیمائے کہ من دارم
۴۔ ندیم خویش می سازی مرا لیکن ازآں ترسم — نداری تاب آں آشوب و غوغائے کہ من دارم

۱۔ شراب کی جو صراحی میرے پاس ہے اس سے دونوں جہانوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ایسی آنکھ کہاں ہے جو اس تماشا کو دیکھ لے جو میرے پاس ہے۔ صراحی سے مراد علامہ کی شاعری ہے جس میں انہوں نے ایسی معرفت کی باتیں بیان کی ہیں جنہیں سمجھ کر

اوران کا اثر لے کر ایک صاحب عقل و دانش دونوں جہانوں کے رازوں سے آگاہ ہوسکتا ہے۔

۲- ایک اور دیوانہ شہر میں آیا ہے تا کہ وہ وہاں ''اللہ ہو'' کا نعرہ لگائے۔ جو جنون مجھ میں ہے اس سے دوصد ہنگامے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ علامہ نے دیوانہ خود کو کہا ہے۔ کہنا یہ چاہا ہے کہ میں نے اپنی شاعری میں اس محبوب حقیقی سے متعلق یا اس کے حوالے سے ایسی باتیں کی ہیں جن سے متاثر ہو کر قاری اس ذات کے عشق کے جذبے سے سرشار ہوسکتا ہے۔

۳- اے نادان! تو راتوں کی تاریکی کا غم نہ کھا یا نہ ڈر جس (غم) سے تو دوچار ہے' اس لیے کہ میری پیشانی میں جو داغ ہے وہ ستاروں کی طرح چمکتا ہے۔ مطلب یہ کہ میں نے اپنی شاعری میں جہد و عمل کا جو پیغام دیا ہے اس پر عمل سے تو اپنی زندگی کی تاریک رات کو روشن کر سکتا ہے۔

۴- تو مجھے اپنا ساتھی/دوست تو بنا رہا ہے لیکن میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ تجھ میں وہ تاب و تواں نہیں ہے کہ جو میرے آشوب اور غوغا کو برداشت کر سکے۔ اپنی شاعری ہی کے حوالے سے بات کی ہے یعنی اس میں دیئے گئے پیغامِ جہد و عمل کو اپنانے اور اس پر عمل کرنے کے لیے بڑے حوصلہ و ہمت کی ضرورت ہے۔ میرے اس پیغام سے صرف اربابِ حوصلہ و ہمت فائدہ اٹھا سکتے ہیں' یہ عام آدمی کے بس کی بات نہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غزل-۱

۱- برخیز کہ آدم راہنگامِ نمود آمد ‏ ‏ ‏ ‏ این مشت غبارے را انجم بسجود آمد

۲- آں راز کہ پوشیدہ در سینۂ ہستی بود ‏ ‏ ‏ ‏ از شوخیِ آب و گِل در گفت و شنود آمد

۱- اٹھ کہ آدم کی نمود کا وقت آ گیا ہے۔ اس مٹھی بھر غبار (آدمی) کو ستارے سجدہ کرنے لگے ہیں یعنی اب انسانوں کی قوتوں اور صلاحیتوں کے اظہار کا وقت ہے۔ انسان ستاروں پر کمند ڈالنے اور چاند سورج کو مسخر کرنے والا ہے۔ یہ قرآنی تلمیح ہے ''انی

جاعل فی الارض خلیفه'' بے شک/تحقیق میں زمین پر یا دنیا میں اپنا خلیفہ/ نائب بنانے والا ہوں۔

۲- وہ راز جو ہستی/ کائنات کے سینے میں مخفی تھا وہ پانی اور مٹی سے بنائے گئے انسان کی شوخی سے گفتگو کرنے والا بن گیا ہے ظاہر ہو گیا ہے۔ گویا جب تک آدمی کی تخلیق نہیں ہوئی تھی' یہ کائنات سراسر ایک راز تھی۔ آدم کی تخلیق اور اس کی تسخیری قوتوں نے یہ راز کھول دیا۔

غزل-۲

۱- مہ و ستارہ کہ در راہِ شوق ہم سفر اند　　کرشمہ سنج و ادا فہم و صاحب نظر اند

۲- چہ جلوہ ہاست کہ دیدند در کف خاکے　　قفا بجانب افلاک سوئے ماںگرند

۱- چاند اور ستارے جو شوق/عشق کی راہ میں ہم سفر ہیں' وہ نگاہ و ابرو کے اشاروں کو پرکھنے والے' ادافہم اور صاحب نظر ہیں۔ مطلب یہ کہ قدرت نے انہیں کئی صفات سے نوازا ہے۔ انہیں اپنی منزل کی پہچان ہے (ان کے طلوع و غروب کے اطراف کے حوالے سے یہ کہا ہے) اور باہم مل کر سفر کر رہے اور زمین کی ہر شے پر ان کی نظر ہے۔

۲- کون کون سے جلوے ہیں جو انہوں (چاند ستاروں) نے اس مٹھی بھر خاک (انسان) میں دیکھے ہیں۔ ان کی پشت تو آسمان کی طرف ہے جبکہ دیکھ وہ ہماری طرف رہے ہیں۔ انسان نائب خدا ہے' اسی لیے کائنات کی ہر شے پر اس کا غلبہ ہے۔

غزل-۳

۱- درونِ لالہ گذر چوں صبا توانی کرد　　بیک نفس گرہ غنچہ وا توانی کرد

۲- حیات چیست؟ جہاں را اسیر جاں کردن　　تو خود اسیر جہانی ' کجا توانی کرد

۳- مقدر است کہ مسجود مہر و مہ باشی　　ولے ہنوز ندانی چہا توانی کرد

۴- اگر ز میکدۂ من پیالہ ے گیری　　زمشت خاک جہانے بپا توانی کرد

۵- چساں بسینہ چراغے فروختی اقبالؔ　　بخویش آنچہ توانی بما توانی کرد

۱- لالہ کے پھول کے اندر صبا کی طرح گذرا جا سکتا ہے۔ ایک سانس سے کلی کی گرہ کھولی جا سکتی ہے یعنی اسے پھول بنایا جا سکتا ہے۔ یہ شعر استعاروں میں ہے، ان کے مطابق غم زدہ دلوں کی غم گساری کر کے اور دوسرے کی مشکلیں حل کر کے انسانیت کی خدمت کی جا سکتی ہے یعنی ''دل بدست آور کہ حج اکبر است'' دوسروں کے دل جیتنا ہی اصل انسانیت ہے۔

۲- زندگی کیا ہے؟ زندگی دنیا کو جان کا قیدی بنانا یعنی دنیا کو اپنا غلام بنانا ہے' نہ یہ کہ انسان خود اس کا غلام بن جائے۔ تو تو خود دنیا کا قیدی ہے تو اسے (دنیا کو) کیونکر غلام بنا سکتا ہے۔ مادیت پرست انسان دنیا کو مسخر نہیں کر سکتا۔

۳- تیرا (انسان کا) یہ مقدر ہے کہ مہر و ماہ تجھے سجدہ کریں لیکن تجھے ابھی تک یہ خبر نہیں کہ تو کیا کیا کچھ کر سکتا ہے۔ اشرف المخلوقات ہونے کے ناطے انسان اس قابل ہے کہ وہ اس کائنات کو تسخیر کر سکے۔ وہ یہ کام کس طرح کرے؟ اس کے لیے کسی صاحب معرفت و حال کی رہنمائی حاصل کرے۔

۴- اگر تو میرے شراب خانے سے ایک جام حاصل کر لے تو تو اپنی مٹھی بھر مٹی سے ایک دنیا بپا کر سکتا ہے۔ مطلب یہ کہ تو میری شاعری میں دیئے گئے پیغام کو اپنا لے تو تو ایک نئی دنیا پیدا کر سکتا ہے جو تیری تسخیر یا غلام ہو' تو اس کی غلامی اختیار نہ کرے۔

۵- اے اقبال تو نے اپنے سینے میں چراغ کس طرح روشن کیا ہے؟ جو کچھ تو خود سے کر سکتا ہے وہ کچھ ہم سے بھی کر سکتا ہے۔ گویا تجھے علم ہے کہ سینہ کس طرح روشن کیا جاتا ہے۔ چنانچہ تو نے اپنا سینہ روشن کر رکھا ہے' تو ہمارے تاریک سینے کو بھی روشن کر سکتا ہے یا روشن کر دے۔

غزل-۴

۱- اگر بہ بحر محبت کرانہ می خواہی — ہزار شعلہ دہی یک زبانہ می خواہی

۲- مرا زلذت پرواز آشنا کردند — تو در فضائے چمن آشیانہ می خواہی

۳- یکے بدامن مردانِ آشنا آویز — زیار اگر نگہِ محرمانہ می خواہی

۴- جنون نہ داری و ہوئے فگندہ ای در شہر — سبو شکستی و بزم شبانہ می خواہی

۵- تو ہم بعشوہ گری کوش و دلبری آموز   اگر زما غزل عاشقانہ می خواہی

۱- اگر تو محبت کے سمندر میں ساحل کی خواہش رکھتا ہے یا ساحل پر آنا چاہتا ہے تو تیری یہ خواہش ایسی ہے جیسے تو ہزاروں شعلے دے کر ایک چنگاری لینی چاہتا ہے۔ محبت تو ایک ایسا سمندر ہے جس میں ایک سچا عاشق ڈوبے رہنے ہی میں لذت پاتا ہے۔ اس میں ساحل کی طلب یا خواہش ناکام محبت کی دلیل ہے۔

۲- قدرت نے مجھے پرواز کی لذت سے آشنا کیا ہے لیکن تو چمن کی فضا میں آشیانہ بنانے کی فکر میں یا اس کی خواہش رکھتا ہے۔ گویا تو بلند مرتبگی کی بجائے پستی، جہد و عمل کی بجائے بے عملی اور سوز و جذبہ کی بجائے راحت و سکون کا خواہاں ہے۔ بالواسطہ اس شعر میں یہ پیغام ہے کہ اپنی یہ بیکار خواہش چھوڑ اور خود کو ذوق وشوق اور سوز و جذبہ عشق سے سرشار کر اور جہد و عمل کی راہ اختیار کر۔

۳- تو کچھ دیر کے لیے مردانِ آشنا یعنی عاشقان و عارفانِ صادق کا دامن تھام۔ اگر تجھے دوست/محبوب کی محرمانہ نگاہ کی خواہش ہے یعنی اگر تیری ایسی خواہش ہے تو مذکورہ عاشقوں کی صحبت اختیار کر کہ انہی کی رہنمائی میں تجھے محبوب حقیقی کی نظر کرم کی توقع ہو سکتی ہے، بصورت دیگر ایسا ممکن نہ ہو گا۔

۴- تجھ میں جنون تو ہے نہیں لیکن شہر میں تو یونہی شور مچانے میں لگا ہوا ہے/مصروف ہے۔ تو نے اپنا جام تو توڑ رکھا ہے لیکن محفل شبانہ کی خواہش رکھتا ہے یعنی تو عشق کے سچے جذبوں سے تو عاری ہے لیکن عاشق ہونے کے بڑے دعوے کر رہا ہے۔ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے کوئی اپنا جام تو توڑ دے لیکن یہ چاہے کہ رات کے وقت کی رندانہ محفل (سچے جذبوں کے حامل عشاق کی محفل) میں وہ بھی شریک ہو۔

۵- اگر تو ہم سے عاشقانہ غزل کا خواہاں ہے تو پھر تو بھی محبوبوں کے سے ناز و ادا اور دلبری سیکھ یعنی خود میں ایسی صفات پیدا کر کہ ہم تیری طرف متوجہ ہو جائیں اور تیرے گن گانے لگیں۔

غزل-۵

۱- زمانہ قاصد طیار آں دل آرام است   چہ قاصدے کہ وجودش تمام پیغام است

۲- گماں مبر کہ نصیبِ تو نیست جلوۂ دوست ——— درونِ سینہ ہنوز آرزوے تو خام است
۳- گرفتم ایں کہ چو شاہیں بلند پروازی ——— بہوش باش کہ صیاد ما کہن دام است
۴- باوج مشت غبارے کجا رسد جبریل ——— بلند نامی او از بلندی بام است
۵- تو از شمارِ نفس زندہ ای نمی دانی ——— کہ زندگی بہ شکست طلسم ایام است
۶- زعلم و دانش مغرب ہمی قدر گویم ——— خوش است آہ وفغاں تانگاہ ناکام است
۷- من از ہلال و چلیپا دگر نیندیشم ——— کہ فتنہ دگرے در ضمیر ایام ہست

۱- یہ زمانہ اس محبوب حقیقی کا اڑتے رہنے والا پیغام رساں ہے۔ کیسا پیغام رساں کہ جس کا سارا وجود ہی پیغام ہے۔ مطلب یہ کہ قرآنی تلمیح کے مطابق محبوب حقیقی کائنات میں ہر لمحہ ایک نئی شان کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ کائنات کی ہر ہر شے میں اس محبوب حقیقی کا جلوہ کارفرما ہے۔

۲- تو یہ خیال مت کر کہ تیرے نصیب میں دوست یعنی محبوب حقیقی کا جلوہ نہیں ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ تیرے سینے میں اس جلوے کی آرزو ابھی خام ہے یعنی تیرے جذبوں میں ابھی وہ صداقت اور پختگی پیدا نہیں ہوئی جوان جلوؤں کے لیے بنیادی شرط ہے۔

۳- چلو میں یہ مان لیتا ہوں کہ تو شاہین کی طرح بلند پرواز ہے لیکن ذرا دھیان سے رہ کیونکہ ہمارا شکاری بڑا تجربہ کار شکاری ہے۔ بلند پرواز سے مراد صاحب عقل وخرد ہے جو خود کو بہت کچھ سمجھتا ہے اور شکاری سے مراد عشق ہے۔ مطلب یہ بنا کہ عشق کے مقابلے میں عقل وخرد کی کوئی قدر و اہمیت نہیں ہے۔

۴- جبرئیل بھلا ایک مشت غبار (انسان) کی بلند نامی تک کیونکر پہنچ سکتا ہے۔ اس کی بلند نامی تو چھت کی اونچائی یعنی آسمان پر ہونے کے باعث ہے۔ انسان جس کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے' اشرف المخلوقات اور زمین پر خدا کا نائب ہے' فرشتے اس کے مقام تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس میں بالواسطہ معراج شریف کے واقعہ کی طرف بھی اشارہ ہے۔ جبرئیل سدرۃ المنتہیٰ سے آگے نہیں جا سکتے تھے جبکہ حضور اکرمؐ اس سے بھی آگے نکل گئے جبکہ وہ انسان تھے۔ ویسے انسان کی بلند نامی اور بلند مقامی اسی صورت میں ممکن ہے کہ وہ صحیح معنوں میں خدائی صفات کا مظہر ہو۔

۵- تو سانسوں کی گنتی کے باعث زندہ ہے' تجھے یہ خبر نہیں کہ حقیقی زندگی تو زمانے کے طلسم

کو توڑنے سے بنتی ہے۔ مطلب یہ کہ تیری زندگی وقت کی مرہون منت ہے اور تیرا نظریہ کچھ ایسا ہی ہے کہ:

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

یا یہ کہ:

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹا دی

جبکہ جہد و عمل سے اور سچے جذبوں کے طفیل بقا حاصل کی جا سکتی ہے یعنی انسان مر کر بھی زندہ رہتا ہے۔

۶- میں یورپ کے علم و دانش کے بارے میں صرف اس قدر کہوں گا کہ اس کی آہ و فغاں تو اچھی ہے جب تک نگاہ ناکام ہے یعنی اہل یورپ نے فکری نگاہ تو پیدا کر لی لیکن وہ حقیقت کو نہیں پا سکی اور اسی نارسائی کی بنا پر ان کے لبوں پر آہ و فغاں ہے۔

۷- مجھے ہلال اور صلیب یعنی مسلمانوں اور عیسائیوں کی آویزش/ تصادم سے اس کے سوا کوئی اور ڈر نہیں ہے کہ زمانے کے دل میں کوئی نیا فتنہ ہے۔ غالباً یہ مراد ہے کہ اگر یہ قومیں باہم برسرِ پیکار رہیں گی تو اشتراکیت قسم کی بے دینی کی قوت دنیا میں پھیل جائے گی جو دونوں کی دشمن ہوگی۔

غزل-۶

۱- دگرز سادہ دلی ہائے یار نتواں گفت — نشستہ بر سر بالین من زدرماں گفت
۲- زباں اگرچہ دلیر است و مدعا شیریں — سخن زعشق چہ گویم جز ایں کہ نتواں گفت
۳- خوشا کسے کہ فرو رفت در ضمیر وجود — سخن مثال گہر برکشید و آساں گفت
۴- خراب لذت آنم کہ چوں شناخت مرا — عتاب زیر لبی کرد و "خانہ ویراں" گفت
۵- غمیں مشو کہ جہاں رازِ خود بروں ندہد — کہ آنچہ گل نتوانست مرغ نالاں گفت
۶- پیامِ شوق کہ من بے حجاب می گویم — بہ لالہ قطرۂ شبنم رسید و پنہاں گفت
۷- اگر سخن ہمہ شوریدہ گفتہ ام چہ عجب — کہ ہر کہ گفت زگیسوے او پریشاں گفت

۱- اپنے محبوب کی سادہ دلی کے بارے میں اس کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ میرے سرہانے بیٹھ کر مجھ سے علاج کے بارے میں پوچھنے لگا (کوئی علاج کیا ہے؟) یعنی میں تو مریض عشق ہوں، اس محبوب کے عشق میں مبتلا ہوں اور وہ اس سلسلے میں بڑے بھولپن کا مظاہرہ کر رہا ہے جیسے اسے کچھ علم نہیں۔ ویسے بھی:

مریض عشق پر رحمت خدا کی
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

۲- اگرچہ میری زبان دلیر ہے اور وہ جو کچھ کہنا چاہتی ہے وہ بات بھی شیریں ہے، پھر بھی میں عشق کے بارے میں اس کے سوا اور کیا کہوں کہ اس (عشق) کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا یعنی عشق تو دل کا معاملہ ہے، اس کے بارے میں کچھ کہنا زباں کے بس کی بات نہیں۔

۳- وہ انسان بڑا ہی خوش بخت ہے یا اچھا ہے جو وجود/ہستی کے دل میں اتر گیا۔ اس نے اس کی تہ سے موتی کی مانند بات نکالی اور بڑی آسانی سے بیان کر دی۔ جس طرح ایک غوطہ خور سمندر کی تہ سے موتی نکال لاتا ہے۔ اسی طرح جو بھی انسان کائنات کے وجود کے سمندر میں غوطہ لگا کر حقائق و معارف کے موتی نکال لاتا ہے وہ بلاشبہ ایک خوش نصیب انسان ہے۔

۴- میں اس لذت کا مارا ہوا ہوں یعنی مجھے اس بات سے لذت ملی ہے کہ جب اس (محبوب) نے مجھے پہچان لیا تو اس نے زیرلب غصے کا اظہار کیا اور مجھے خانہ ویراں کہا۔ محبوب کے عتاب میں بھی عاشق کے لیے لذت کا سامان ہے۔ بقول شاعر:

وہ دشمنی سے دیکھتے ہیں، دیکھتے تو ہیں
میں شاد ہوں کہ ہوں تو کسی کی نگاہ میں

۵- تو اس بات کا غم نہ کر کہ جہان اپنا راز ظاہر نہیں کرتا، وہ ضرور ظاہر کرتا ہے اور وہ اس طرح کہ جو کچھ پھول نہیں کہہ سکا وہ فریاد کرنے والے پرندے نے بیان کر دیا ہے۔ پھول غالباً استعارہ ہے اہل حکمت و فلسفہ کا اور پرندہ عاشق کا۔ گویا ایک عاشق حقیقی ہی اس کائنات کو مسخر کرنے کے باعث اس کے رازوں سے آگاہ ہے۔

۶- میں شوق/عشق کا جو پیام کھل کر یا واضح طور پر بیان کر رہا ہوں، وہ شبنم کے قطرے نے گل لالہ پر پہنچ کر پوشیدہ طور پر کہا۔ شبنم کے قطرے گرنے سے لالہ کا پھول کھل اٹھتا یا اس کے اندر داغ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ گویا شوق کا مخفی پیغام ہے جبکہ عاشق اپنے طرز

عمل سے یہ واضح کر دیتا ہے کہ وہ کسی کے عشق میں گرفتار ہے۔

۷۔ اگر میں نے یونہی الٹی سیدھی یا منتشر سی بات کی ہے تو اس میں حیرانی/تعجب کی کیا بات ہے۔ اس لیے کہ اس کی پریشان زلفوں کے بارے میں جس نے بھی بات کی ہے' ایسی ہی پریشان بات کی ہے۔ محبوب کی پریشان/بکھری ہوئی زلفوں کی دلکشی کا بالواسطہ ذکر ہے۔ بقول غالب:

مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس
زلف سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

غزل-۷

۱۔ خرد از ذوقِ نظر گرم تماشا بود است — ایں کہ جوینده و یابندۂ ہر موجود است

۲۔ جلوۂ پاک طلب' از مہ و خورشید گذر — زانکہ ہر جلوہ دریں دیر نگہ آلود است

۱۔ عقل ذوقِ نظر کے باعث گرم تماشا ہے یعنی اگر وہ کائنات کی رمز و حقیقت سے آگاہی میں محو و مصروف ہے تو یہ سب سماوی/آسمانی فیض کا نتیجہ ہے' وہ عقل جو ہر موجود کی تلاش کرنے اور اسے پا لینے والی ہے' یہ مفہوم بنتا ہے کہ ایسی عقل جس میں عشق کی بھی لذت ہو وہی ایسا کر سکتی ہے ورنہ عشق کے بغیر اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ گویا

ع خرد بے عشق نابینا' خرد با عشق ہے بینا

۲۔ تو پاک جلوے (خدائی جلوے) کا طلب گار بن' چاند اور سورج کے جلوے سے گذر (اس کی بات چھوڑ) اس لیے کہ اس دنیا میں ہر جلوہ نگاہ سے آلودہ ہے یعنی یہاں کی ہر شے ظاہری آنکھ سے نظر آ جاتی ہے جبکہ اس کا جلوہ صرف دل کی آنکھ سے نظر آتا ہے۔ گویا کائنات کی ہر ہر شے میں اس کا جلوہ کارفرما ہے لیکن اسے صرف وہی دیکھ سکتا ہے جس کا دل محبوبِ حقیقی کے جذبہ عشق سے سرشار ہو۔

غزل-۸

۱۔ غلامِ زنده دلانم کہ عاشق سره اند — نہ خانقاه نشیناں کہ دل بکس ندہند

۲- باں دلے کہ برنگ آشنا و بے رنگ است | عیارِ مسجد و میخانہ و صنم کدہ اند
۳- نگاہ از مہ و پرویں بلند تر دارند | کہ آشیاں بگریبانِ کہکشاں نہ نہند
۴- بروں زانجمنے درمیانِ انجمنے | بخلوت اند و لے آں چناں کہ باہمہ اند
۵- بچشم کم منگر عاشقان صادق را | کہ ایں شکستہ بہایاں متاعِ قافلہ اند
۶- بہ بندگاں خطِ آزادگی رقم کردند | چنانکہ شیخ و برہمن شبانِ بے رمہ اند
۷- پیالہ گیر کہ مے را حلال می گویند | حدیث اگرچہ غریب است راویاں ثقہ اند

(یہ مسلسل غزل ہے)

۱- میں ان زندہ دلوں کا غلام ہوں جو سچے/ خالص عاشق ہیں۔ میں ان خانقاہ نشینوں یعنی نام نہاد صوفیوں کا غلام نہیں ہوں جو کسی کو دل نہیں دیتے۔ خالص عاشق اللہ سے تو محبت کرتے ہی ہیں، اس کی مخلوق سے بھی پیار کرتے ہیں کہ اصل انسانیت یہی ہے۔ نام نہاد صوفی تو دنیا پرست اور مفاد پرست ہوتے ہیں۔ خالص عاشق کا تو یہ نعرہ ہوتا ہے:

ڈھا دے مسجد ڈھا دے مندر ڈھا دے جو کجھ ڈھیندا
اک بندے دا دل نہ ڈھائیں رب دلاں وچ رہندا
(مشہور صوفی محمد بخش جہلمی)

بقول شاعر:

یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

یا بقول رومیؒ:

دل بدست آور کہ حج اکبر است
از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

۲- وہ (زندہ دل) عشاق اپنے ایسے دل کے باعث جو دنیا سے آشنا تو ہے لیکن دنیاوی علائق سے آزاد ہے، مسجد/ اہل اسلام، مے خانہ/ اہل دنیا اور بت کدہ/ بت پرستوں سب کے لیے ایک معیار کی حیثیت رکھتے ہیں کہ دنیا میں زندگی اس طور بسر کرنی چاہیے۔

۳- ان زندہ دلوں کی نگاہ چاند اور پروین ستارے سے زیادہ بلند ہے، اس لیے کہ وہ کہکشاں کے گریبان میں بھی آشیانہ نہیں بناتے۔ مطلب یہ کہ وہ اس کائنات اور اس کی اشیا کی محبت کے چکر میں نہیں پھنستے بلکہ ان کی تمام تر توجہ کا مرکز اور ان کا اول و

آخر مقصود محبوبِ حقیقی کی ذات ہے۔

۴۔ وہ محفل میں رہتے ہوئے بھی محفل سے باہر ہوتے ہیں اور خلوت میں ہوتے ہوئے بھی وہ سب کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اگر چہ وہ دنیا والوں کے ساتھ رہتے ہیں لیکن ان کا دل اور ان کی توجہ اس ذات کی طرف ہوتا/ ہوتی ہے جبکہ تنہائی میں انہیں اللہ کی مخلوق سے پیار کا احساس رہتا ہے۔

۵۔ تو ایسے سچے عاشقوں کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھ‘ اس لیے کہ یہ بظاہر مفلس اور خستہ حال لوگ ہی قافلے یعنی قوم کا سرمایہ ہیں۔

۶۔ انہوں نے انسانوں کے لیے آزادی کا پروانہ تحریر کیا ہے اور وہ اس لیے کہ یہ جو شیخ اور برہمن ہیں وہ ایسے گڈریے ہیں جن کا کوئی ریوڑ نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ وہ (سچے عاشق) اپنی گفتار و کردار سے انسانوں پر یہ واضح کرتے ہیں کہ صرف اللہ کی غلامی اختیار کرو اور ان نام نہاد مذہبی رہنماؤں کی پیروی کی بجائے اللہ کے خاص بندوں کی پیروی کرو کہ حقیقی زندگی اسی میں ہے۔

۷۔ تو (شراب پینے کے لیے) پیالہ لے‘ کیونکہ شراب کو حلال قرار دیتے ہیں۔ اگر چہ یہ بات عجیب اور انوکھی ہے لیکن کہنے والے ثقہ اور با اعتبار لوگ ہیں، یہاں شراب سے مراد شراب معرفت ہے یعنی تم معرفت کے حصول میں لگ جاؤ۔

غزل-۹

۱۔ لالۂ ایں چمن آلودۂ رنگ است ہنوز — سپر از دست میند از کہ جنگ است ہنوز
۲۔ فتنہ ے را کہ دو صد فتنہ بآغوشش بود — دخترے ہست کہ در مہد فرنگ است ہنوز
۳۔ اے کہ آسودہ نشینی لب ساحل‘ برخیز — کہ ترا کار بگرداب و نہنگ است ہنوز
۴۔ از سر تیشہ گذشتن زخرد مندی نیست — اے بسا لعل کہ اندر دل سنگ است ہنوز
۵۔ باش تا پردہ کشایم زمقام دگرے — چہ دہم شرح نواہا کہ بچنگ است ہنوز
۶۔ نقش پرداز جہاں چوں بجنونم نگریست — گفت ”ویرانہ بسودائے تو تنگ است ہنوز“

۱۔ اس چمن کا گل لالہ ابھی رنگ میں اٹکا ہوا ہے تو ڈھال ہاتھ سے مت رکھ کیونکہ جنگ ابھی جاری ہے۔ گویا ابھی مسلمان مادہ پرستی میں کھویا ہوا ہے‘ ادھر اسلام دشمن قوتیں

مسلمانوں کو تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ ان سے ابھی ہمیں جنگ کرنا/ ٹکرانا ہے۔

۲- ایک ایسا فتنہ جس کی آغوش میں دو صد فتنے ہیں' وہ گویا ایک ایسی لڑکی ہے جو ابھی اہل فرنگ کے پنگھوڑے میں ہے۔ اس فتنے کے جوان ہونے پر اس کی سینکڑوں قسم کی فتنہ پردازیاں نمودار ہونے کا احتمال ہے۔ یہ غالباً کمیونزم/ اشتراکیت کے فتنے کی طرف اشارہ ہے جو اس وقت ابھی شروع ہوا تھا۔

۳- تو جو سمندر کے کنارے آرام وسکون سے بیٹھا ہوا ہے' اٹھ کھڑا ہو۔ اس لیے کہ ابھی تجھے بھنور اور مگرمچھ سے پالا پڑنا ہے' ان سے ٹکرانا ہے یعنی اے مسلم تجھے بہت سے دشمنوں سے سابقہ پڑا ہوا ہے' اس لیے ان سے ٹکرانے کے لیے خود کو ہر وقت تیار رکھ۔

۴- تیشے سے کام نہ لینا کوئی عقل مندی کی بات نہیں ہے۔ اس لیے کہ ابھی بہت سے لعل پتھر کے اندر پڑے ہیں' بیکار رہنا اور تن آسانی کی زندگی گذارنا سراسر نادانی ہے۔ زندگی کو صحیح معنوں میں زندگی بنانے کے لیے جہد وعمل اور سعی وکوشش بے حد ضروری ہے۔

۵- تو ذرا رک/ ٹھہر تا کہ میں ایک اور راگ سے پردہ اٹھاؤں۔ میں ان نغموں کی کیا شرح بیان کروں جو ہنوز ساز/ باجے کے اندر ہیں۔ وہ حادثات و واقعات جو ابھی وقوع پذیر ہونے ہیں' ان کے بارے میں کیا بتاؤں۔ دوسرے لفظوں میں آج کی جو صورتِ حال ہے اس پر اظہار خیال کیا جاسکتا ہے۔

۶- جہان کے نقش بنانے والے (خالق کائنات) نے جب مجھے حالت جنون میں دیکھا تو کہا/ فرمایا کہ ابھی تیرے جنون کے لیے ویرانہ تنگ/ محدود ہے۔ گویا ابھی حالات ایسے نہیں ہیں کہ ملت کی عظمت و بلند مرتبگی کی تیری آرزو پوری ہو۔ (واللہ اعلم)

غزل-۱۰

۱- تکیہ برحجت و اعجازِ بیاں نیز کنند — کارِ حق گاہ بشمشیر و سناں نیز کنند

۲- گاہ باشد کہ تہ خرقہ زرہ می پوشند — عاشقاں بندۂ حال اند چناں نیز کنند

۳- چوں جہاں کہنہ شود پاک بسوزند اورا — وزہماں آب وگل ایجاد جہاں نیز کنند

۴- ہمہ سرمایہ خود را بنگاہے بدہند — ایں چہ قومے است کہ سودا بزیاں نیز کنند

۵- آنچہ از موجِ ہوا باپرِ کاہے کردند — عجبے نیست کہ باکوہِ گراں نیز کنند

۶- عشق مانند متاعے است ببازارِ حیات گاہ ارزاں بفروشند و گراں نیز کنند

۷- تا تو بیدار شوی نالہ کشیدم ورنہ عشق کارے است کہ بے آہ وفغاں نیز کنند

۱- حق کا کام کرنے کے لیے کبھی دلیل اور اعجازِ بیاں پر بھی بھروسا کیا جاتا ہے اور کبھی حق کا کام تلوار اور نیزے سے بھی کیا جاتا ہے۔ حق کی اشاعت اور دفاع کے لیے دونوں انداز یعنی دلیل و برہان اور قوت سے کام لیا جاتا ہے۔

۲- کبھی ایسا ہوتا ہے کہ گدڑی کے نیچے زرہ بکتر پہن لیتے ہیں' اس لیے کہ اللہ کے عاشق صاحب حال ہوتے ہیں اور وہ کبھی ایسا بھی کر لیتے ہیں۔ گویا وہ خانقاہوں سے نکل کر علامہ ہی کے لفظوں میں رسم شبیریؓ بھی ادا کرتے ہیں۔

۳- جب جہان پرانا ہو جاتا ہے تو وہ (اللہ کے عاشق) اسے پورے طور پر جلا دیتے ہیں اور پھر اسی پانی اور مٹی سے ایک نیا جہان بھی تعمیر کر لیتے ہیں یعنی وہ اسے اپنے فکر و عمل سے ختم کر کے ایک عظیم اور دل کشا جہان وجود میں لاتے ہیں۔

۴- کبھی وہ یعنی خدا کے عاشق ایک نگاہ کے بدلے میں اپنا سارا سرمایہ دے دیتے ہیں۔ یہ کیسے لوگ ہیں کہ نقصان کا سودا بھی کر لیتے ہیں۔ گویا مردانِ حق/مومن ضرورت پڑنے پر اپنا تن من دھن سب اللہ کی راہ میں قربان کر دیتے ہیں۔ یہ محبوب کی ایک نگاہ کی خاطر اپنا سب کچھ لٹانے کے مترادف ہے۔ ان کے لیے یہ نقصان کا نہیں بلکہ نفع کا سودا ہے۔

۵- موجِ ہوا سے کام لیتے ہوئے انہوں نے جو کچھ تنکے کے ساتھ کیا' تعجب کی بات نہ ہوگی۔ اگر وہ بھاری پہاڑ کے ساتھ بھی وہی کچھ کریں۔ مطلب یہ بنتا ہے کہ یہ مردان حق جہاں اپنے ہمدردانہ رویوں سے بے بس اور کمزور لوگوں میں ہمت و حوصلہ پیدا کرتے اور ان کی عزت وآبرو کا سامان کرتے ہیں' وہاں وہ سنگدل طاقت وروں اور سرکشوں کی بھی سرکوبی کرتے ہیں تاکہ معاشرہ سراسر ایک فلاحی معاشرہ بن جائے۔

۶- عشق' زندگی کے بازار میں ایک متاع کی صورت ہے جسے کبھی سستے نرخوں پر بیچا جاتا ہے اور کبھی مہنگے داموں پر بھی فروخت کرتے ہیں۔ مطلب یہ کہ کبھی تو قدرت سعی و کوشش کے بغیر اس سے نوازتی ہے اور کبھی جان کی قربانی دینے سے بھی یہ ہاتھ نہیں آتی۔ گویا یہ خدا کا کرم ہے کہ جسے وہ چاہے اسے اس دولتِ عشق سے نواز دے۔

۷- میں نے اس خاطر نالہ کشی کی ہے تاکہ تو بیدار ہو جائے ورنہ عشق تو ایک ایسا کام ہے جو آہ و فغاں کے بغیر بھی کیا جاتا ہے۔ علامہ نے اپنی شاعری کے حوالے سے بات کی ہے یعنی

میری شاعری تفریحِ طبع کے لیے نہیں ہے بلکہ اس سے میرا مقصد اپنی غلام اور سوئی ہوئی قوم کو بیدار کرنا ہے تاکہ وہ جہد و عمل سے اپنی عظمت و سربلندی کا سامان کرے۔ یہ کام اور طریقوں سے بھی کیا جاسکتا ہے لیکن مجھ سے ایسے ہی طریقے سے کام لینا ممکن تھا۔

غزل-۱۱

۱- چو موج مست خودی باش و سر بطوفاں کش — ترا کہ گفت کہ بنشین و پا بداماں کش

۲- بقصد صید پلنگ از چمن سرا بر خیز — بکوہ رخت کشا خیمہ در بیاباں کش

۳- بہ مہر و ماہ کمند گلوفشار انداز — ستارہ را ز فلک گیر و در گریباں کش

۴- گرفتم ایں کہ شراب خودی بسے تلخ است — بدردِ خویش نگر زہر ما بدرماں کش

۱- تو موج کی مانند خودی میں مست ہو جا اور طوفان سے ٹکرا جا۔ تجھے یہ کس نے کہا ہے کہ تو بیٹھا رہ اور پاؤں دامن میں سمیٹ لے یعنی اپنی مخفی صلاحیتوں اور قوتوں سے آگاہ ہو کر راہِ عمل اختیار کر اور یوں صاحب بقا ہو جا۔

۲- تو چیتے کے شکار کے ارادے سے چمن سرا سے اٹھ۔ اپنا سامان پہاڑ پر کھول یا رکھ اور بیاباں میں جا کر خیمہ لگا۔ گویا سستی اور کاہلی چھوڑ اور سعی و کوشش اور جد و جہد سے اپنے درپیش مسائل و مشکلات کا حل تلاش کر۔

۳- سورج اور چاند پر گلا دبانے والی کمند پھینک اور ستارے کو آسمان سے اتار کر اپنے گریباں میں سجا لے۔ دوسرے شعر والی بات نئے استعارے میں کہی ہے۔

۴- میں یہ مان لیتا ہوں کہ خودی کی شراب بڑی کڑوی ہے' تاہم تو اپنے درد پر نظر کر اور اس کے علاج کے لیے ہمارا زہر پی جا۔ مطلب یہ کہ قوم جس حالت سے دوچار ہے' اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی خودی سے آگاہ ہو اور اس کے لیے میری شاعری سے جو بظاہر تلخ ہے' استفادہ کرے اور اپنا صحیح مقام بنائے۔

غزل-۱۲

۱- خضر وقت از خلوتِ دشت حجاز آید بروں — کارواں زیں وادی دور و دراز آید بروں

۲- من بسیمائے غلاماں فرسلطاں دیدہ ام　　شعلہ محمود از خاک ایاز آید بروں

۳- عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات　　تاز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

۴- طرحِ نوی افگند اندر ضمیر کائنات　　نالہ ہا کز سینۂ اہل نیاز آید بروں

۵- چنگ را گیرید از دستم کہ کار از دست رفت　　نغمہ ام خوں گشت و از رگہائے ساز آید بروں

۱- وقت کا خضر حجاز کے بیابان سے باہر آ رہا ہے' قافلہ اس دور و دراز وادی سے باہر آ رہا ہے۔ مطلب یہ کہ آج کے حالات سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ اسلام کی طرف لوگ پھر آ رہے ہیں اور یوں احیائے اسلام کی کوئی صورت بن رہی ہے۔

۲- میں نے غلاموں کی پیشانی پر سلطان/ بادشاہ کی شان و شوکت دیکھی ہے۔ گویا محمود غزنوی کا شعلہ اس کے غلام' ایاز کی خاک سے باہر آ رہا ہے یا اٹھ رہا ہے یعنی مسلمان جو ایک مدت سے غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں' ان میں جذبہ آزادی کے آثار نظر آ رہے ہیں جو ان کی سربلندی کا باعث بنیں گے۔

۳- زندگی مدتوں کعبہ و بت خانہ میں نالہ وزاری کرتی ہے تب کہیں جا کر بزم عشق سے کوئی دانائے راز باہر آتا ہے۔ مطلب یہ کہ سوئی ہوئی قوموں کو بیدار کرنے اور انہیں صحیح راہ پر چلانے والے کبھی کبھار ہی پیدا ہوتے ہیں۔ یہی بات علامہ نے اردو میں یوں کہی ہے:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

۴- وہ نالے جو اہل نیاز کے سینوں سے باہر نکلتے ہیں' وہ کائنات کے ضمیر میں نئی بنیاد رکھتے ہیں۔ اللہ کے خاص بندے/ ولی جب اپنے من میں ڈوب کر اور صدقِ دل سے اللہ کے حضور معاشرے/ قوم کی فلاح کے لیے گڑگڑاتے ہیں' دعا کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی فریاد قبول فرماتا ہے اور یوں ایک نیا عظیم مرتبہ معاشرہ وجود میں آتا ہے۔

۵- ساز کو میرے ہاتھ سے پکڑ لو کہ معاملہ میرے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ میرا نغمہ خون کی صورت میں ساز کی رگوں سے باہر آنے لگا ہے۔ اپنی شاعری کے حوالے سے بات کی ہے یعنی میں نے قوم میں جذبہ بیداری پیدا کرنے کے لیے اپنی شاعری میں جو پیغام دیا ہے اس کے واسطے میں نے اپنے دل و جگر کو خون کر لیا ہے' میرا کام ختم ہو چکا۔ اب یہ قوم کا کام ہے کہ وہ اس پر عمل پیرا ہو کر اپنی بقا کا سامان کرے۔

غزل-۱۳

۱- زسلطاں کنم آرزوے نگاہے مسلمانم از گل نسازم الٰہے
۲- دل بے نیازے کہ در سینہ دارم گدا را دہد شیوۂ پادشاہے
۳- زگردوں فتد آنچہ برلالۂ من فرو ریزم اُو را بہ برگِ گیاہے
۴- چو پرویں فرو ناید اندیشۂ من بدریوزۂ پرتو مہر و ماہے
۵- اگر آفتابے سوے من خرامد بشوخی بگردانم او را ز راہے
۶- باں آب و تابے کہ فطرت بہ بخشد درخشم چو برقے بہ ابر سیاہے
۷- رہ و رسم فرماں روایاں شناسم خراں برسر بام و یوسف بچاہے

۱- میں صرف اس سلطان یعنی خالق کائنات کی نگاہ کا آرزومند ہوں۔ میں مسلمان ہوں، مٹی سے کوئی معبود نہیں بناتا ہوں۔ میرا معبودِ حقیقی صرف اللہ ہی ہے، میں کسی ماسوااللہ یا غیراللہ کا نہ تو قائل ہوں اور نہ اس سے کسی قسم کی آرزو رکھتا ہوں۔ مسلمان ہونے کے ناطے میں توحید پرست ہوں۔

۲- میرے سینے میں جو بے نیاز دل ہے۔ وہ کچھ اس خوبی کا حامل ہے کہ اس سے ایک گداگر میں بھی شاہانہ انداز/طور طریقے پیدا ہو جاتے ہیں۔ بے نیاز انسان مفلس ہی سہی وہ کسی بڑی سے بڑی طاقت سے بھی مرعوب نہیں ہوتا۔

۳- آسمان سے جو کچھ میرے لالہ پر گرتا ہے، اسے میں گھاس کی پتی پر گرا دیتا ہوں۔ اپنی شاعری کے حوالے سے بات کی ہے یعنی قدرت کی طرف سے جو بھی افکار و خیالات میرے دل پر نازل ہوتے ہیں، انہیں میں شعر کی صورت دے کر عام لوگوں تک پہنچا دیتا ہوں۔

۴- جس طرح پروین ستارہ بلندی پر ہے اسی طرح میری فکر بلندیوں پر رہتی ہے اور سورج اور چاند سے روشنی کی بھیک مانگنے کے لیے نیچے نہیں آتی۔ اپنی بے نیازی کی بات کی ہے یعنی میں جس حال میں بھی ہوں، خوش ہوں۔ کسی کے آگے دست سوال دراز کرنا پسند نہیں کرتا۔

۵- اگر سورج میری طرف آئے تو میں اسے شوخی سے، راستے ہی سے لوٹا دیتا ہوں۔ وہی اپنی بے نیازی کی بات نئے استعارے میں کہی ہے۔

۶۔ میں اس چمک دمک سے، جو قدرت کی طرف سے مجھے عطا ہوئی ہے، سیاہ بادل میں بجلی کی طرح چمکتا ہوں۔ مطلب یہ کہ جس طرح سیاہ بادلوں میں بجلی چمکتی ہے اسی طرح میرے روشن افکار قاری کے دل کو روشن کر دیتے ہیں۔

۷۔ مجھے فرماں رواؤں کے طور طریقوں سے آگاہی ہے۔ وہ کچھ اس طرح کے ہیں کہ ان سے گدھے تو چھت پر ہیں اور یوسفؑ جیسی شخصیت کنوئیں میں ہے یعنی حکمران اپنے چاپلوسوں اور نااہلوں کو تو خوب نوازتے ہیں جبکہ اہل اور لائق انسانوں کی قدر کرنے کی بجائے انہیں خوار کرتے ہیں۔ یہ انداز ہر دور میں رہا ہے۔ چنانچہ بقول حافظ شیرازی:

اسپ تازی شدہ مجروح بزیرِ پالاں
طوقِ زریں ہمہ در گردنِ خری بینم

(عربی یا اصیل گھوڑا تو پالان کے نیچے زخمی ہو گیا ہے جبکہ گدھے کی گردن میں میں سونے کا گلوبند دیکھ رہا ہوں۔)

غزل۔ ۱۴

۱۔ بانشۂ درویشی در ساز و دمادم زن — چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن
۲۔ گفتند جہانِ ما آیا بتومی سازد — گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن
۳۔ درمیکدہ ہا دیدم شایستہ حریفے نیست — بارستم دستاں زن، بامغبچہ ہا کم زن
۴۔ اے لالہ صحرائی تنہا نتوانی سوخت — ایں داغِ جگر تابے بر سینۂ آدم زن
۵۔ تو سوزِ درونِ او، تو گرمی خونِ او — باور نکنی؟ چاکے در پیکر عالم زن
۶۔ عقل است چراغ تو؟ در راہ گذارے نہ — عشق است ایاغ تو؟ با بندۂ محرم زن
۷۔ لختِ دل پرخونے از دیدہ فرو ریزم — لعلے ز بدخشانم بردار و بخاتم زن

۱۔ تو درویشی کے نشے سے موافقت کر اور اسے مسلسل پیتا رہ۔ جب تو پختہ ہو جائے تو پھر جمشید کی سلطنت سے ٹکر لے لے۔ پہلے خود میں حقیقی درویشی کا جذبہ پیدا کر اور جب تو اس میں کامل ہو جائے تو دنیا کی بڑی بڑی باطل قوتوں سے الجھ/ٹکرا کر ان کا خاتمہ کر یا ان سے بے خوف ہو جا۔

۲- قدرت یا قضا و قدر کے کارکنوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا یہ ہمارا جہان تجھ سے موافقت کرتا ہے۔ میں نے جواب میں کہا کہ وہ مجھ سے موافقت نہیں کرتا۔ اس پر انہوں نے کہا کہ پھر تو اسے درہم برہم کر دے یعنی اس میں انقلاب لا اور انسانی فلاح و بقا کے لیے جد و جہد کر۔

۳- میں نے شراب خانوں میں دیکھا کہ کوئی بھی شایستہ میخوار ساتھی نہیں ہے۔ تو رستم دستاں کے ساتھ بیٹھ کر پی اور مغ بچوں کے ساتھ بیٹھ کر نہ پی۔ مطلب یہ کہ عظیم زندگی کے لیے باوقار اور عظیم لوگوں کی صحبت اختیار کر اور نادان گھٹیا قسم کے لوگوں کی صحبت سے بچ۔

۴- اے صحرا کے لالہ تو اکیلا نہیں جل سکتا۔ تو جگر کو سوز و حرارت دینے والے اپنے اس داغ کو انسان کے جسم پر لگا یعنی اگر قدرت نے تجھے (انسان کو) داغِ عشق اور سوز و گداز سے نوازا ہے تو تو اس سے دوسروں میں بھی ویسے جذبے پیدا کر۔

۵- (اے انسان) تو اس کا اندرونی سوز ہے اور تو ہی اس کے خون کی گرمی و حرارت ہے، کیا تجھے اس بات کا یقین نہیں ہے؟ اگر نہیں ہے تو ذرا جہان کے پیکر میں دراڑ ڈال اور اس میں سے جھانک کر دیکھ۔ گویا مخلوقات میں صرف انسان ہی کو سوز و جذبہ اور گرمی و حرارت سے نوازا گیا ہے۔ دوسرے مصرعے سے یہ مفہوم بنتا ہے کہ تو اس پر ذرا غور کر تو تجھ پر واضح ہو جائے گا کہ دوسری مخلوق اس سے محروم ہے۔

۶- کیا عقل تیرا چراغ ہے؟ اگر ایسا ہے تو اسے کسی راستے میں رکھ دے۔ کیا عشق تیرا شراب کا پیالہ ہے؟ اگر ایسا ہے تو محرم حال کے ساتھ بیٹھ کر پی۔ گویا عقل ایک عام چیز اور عام لوگوں کے لیے ہے جبکہ عشق خاص الخاص چیز اور مخصوص انسانوں کے لیے ہے یعنی عقل کی بات ہر کسی سے اور عشق کی بات خاص لوگوں ہی سے کی جاسکتی ہے۔

۷- میں نے اپنی آنکھوں سے اپنے خون سے بھرے دل کا ٹکڑا گرایا۔ تو میرے بدخشاں سے ایک لعل اٹھا لے اور اسے اپنی انگوٹھی میں لگا لے۔ بدخشاں کے لعل مشہور ہیں۔ علامہ نے اپنی شاعری کو ان سے تشبیہ دی ہے اور یہ کہنا چاہا ہے کہ میری شاعری سراسر سوز و جذبہ کی حامل ہے تو اس پر توجہ کر اور اس کا اثر لے کر اپنی بقا کا سامان کر۔

غزل-۱۶

۱- فرشتہ گرچہ بروں از طلسم افلاک است	نگاہِ او بتماشاے ایں کفِ خاک است
۲- گماں مبر کہ بیک شیوہ عشق می بازند	قبا بدوشِ گل و لالہ بے جنوں چاک است
۳- حدیثِ شوق ادا می تواں بخلوتِ دوست	بنالہ ے کہ ز آلایشِ نفس پاک است
۴- تواں گرفت زچشمِ ستارہ مردم را	خرد بدستِ تو شاہینِ تند و چالاک است
۵- کشاے چہرہ کہ آں کس کہ "لن ترانی" گفت	ہنوز منتظرِ جلوۂ کفِ خاک است
۶- دریں چمن کہ سرود است و ایں نواز کجاست؟	کہ غنچہ سر بگریبان و گل عرقناک است

۱- فرشتہ اگرچہ آسمانوں کے طلسم سے محفوظ ہے، تاہم اس کی نگاہ آدمِ خاکی کے نظارے میں محو ہے یعنی فرشتہ نوری ہونے کے باعث انسان کی طرح فطرت کے قوانین کا اگرچہ پابند نہیں ہے لیکن انسان میں عشق کا جو سوز و جذبہ ہے، اس عظیم دولت سے وہ محروم ہے۔

۲- تو یہ خیال مت کر کہ عشق کا کھیل ایک ڈگر پر/ طریقے سے کھیلا جاتا ہے (تو یہ دیکھ کہ) گلاب اور لالہ کے پھولوں کے کندھے پر پڑی ہوئی قبا جنون کے بغیر ہی چاک/ پھٹی ہوئی ہے۔ گویا عشق کی بازی کا تعلق محبوب کے مختلف ناز و ادا سے ہے، عاشق کبھی اس کی ایک ادا پر مرتا ہے تو کبھی دوسری ادا پر۔ مثلاً:

آنکھوں آنکھوں میں پلا دی میرے ساقی نے مجھے
اب نہ شیشے کی ضرورت ہے نہ پیمانے کی

یا مثلاً بقول غالبؔ:

کرنے گئے تھے ان سے تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

۳- شوق کی بات صرف اس نالہ کے ذریعے جو سانس کی ملاوٹ سے پاک ہو، دوست کی خلوت میں بیان کی جا سکتی ہے۔ ایسی بات الفاظ میں نہیں بلکہ اپنے چہرے کے تاثرات ہی سے بیان کی جا سکتی ہے جن سے دوست سمجھ لیتا ہے کہ عاشق کو اس سے سچی محبت ہے۔

۴- ستارے کی آنکھ سے اس کی پتلی نکالی جا سکتی ہے۔ عقل تیرے ہاتھوں میں گویا ایک تند و

تیز اور چالاک شاہین ہے۔ شاہین فضا میں اڑتے ہوئے پرندوں کی آنکھوں کی پتلی نکال سکتا ہے۔ یہی حال انسانی عقل کا ہے کہ اگر اس سے صحیح طور پر کام لیا جائے تو اس میں اتنی قوت ہے کہ وہ اس کائنات کو یا فطرت کے عناصر کو بآسانی تسخیر کر سکتی ہے۔

۵- تو (اے انسان) اپنا چہرہ کھول دے یا بے نقاب کر دے کیونکہ جس ذات نے ''لن ترانی'' فرمایا تھا وہ خود ابھی تک تیرے (انسان کے) جلوے کی منتظر ہے۔ قرآنی تلمیح، حضرت موسیٰؑ کی خدا سے جلوہ دکھانے کی خواہش اور خدا کا جواب کہ تو نہیں دیکھ سکتا۔ مطلب یہ کہ اللہ کے خاص بندے جو خدائی صفات سے بہرہ ور ہیں، اللہ ان سے محبت کرتا اور ان کے دیدار کی خواہش رکھتا ہے۔

۶- اس چمن میں کس نے نغمہ الاپا ہے اور یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے کہ کلی تو سر بگریباں یعنی غور و فکر میں ڈوبی ہوئی ہے جبکہ پھول پسینے میں شرابور ہے۔ اس ذاتِ اقدس کی ہر شے میں جلوہ گری کی بات حیرانی کے ساتھ اور بالواسطہ کی ہے۔ مطلب یہ کہ ہر کوئی اس محبوب حقیقی کے جلوہ کا آرزومند اور تماشائی ہے۔

غزل-۱۷

۱- عرب کہ باز دہد محفل شبانہ کجاست؟ عجم کہ زندہ کند رودِ عاشقانہ کجاست؟

۲- بزیر خرقہ پیراں سبوچہ ہا خالی است فغاں کہ کس نشناسد مے جوانہ کجاست؟

۳- دریں چمن کدہ ہر کس نشیمنے سازد کسے کہ ساز دو وا سوز دآشیانہ کجاست؟

۴- ہزار قافلہ بیگانہ وار دید و گذشت ولے کہ دید بانداز محرمانہ کجاست؟

۵- چو موج خیز و بہ یم جاودانہ می آویز کرانہ می طلبی، بے خبر کرانہ کجاست

۶- بیا کہ در رگِ تاکِ تو خونِ تازہ دوید دگر مگوے کہ آں بادۂ مغانہ کجاست

۷- بیک نورد فرو پیچ روزگاراں را ز دیر و زود گذشتی دگر زمانہ کجاست

۱- وہ عرب جو پھر سے رات کی محفل سجائے، کہاں ہے؟ اور وہ عجم جو عاشقانہ ساز کو پھر سے چھیڑے کہاں ہے؟ مطلب یہ کہ آج کچھ ایسی صورتِ حال پیدا ہوگئی ہے کہ نہ تو عربوں میں وہ پہلا سا جوش و جذبہ ایمانی رہا ہے اور نہ غیر عرب مسلمانوں میں۔

۲- پیروں/صوفیوں کے خرقہ کے نیچے ان کے چھوٹے مٹکے شراب سے خالی ہیں۔ فریاد

ہے کہ (آج) کوئی بھی نہیں جانتا پہچانتا کہ جوکی شراب کہاں ہے؟ نام نہاد صوفیا کے باطن معرفت سے محروم ہیں۔ وہ محض دکھاوے کے صوفی اور پیر ہیں اور یہ بات بھی افسوسناک ہے کہ کوئی بھی ان کی صحیح پہچان نہیں رکھتا۔

۳- اس دنیا کے چمن خانہ میں ہر کوئی آشیانہ بناتا ہے۔ کوئی ایسا انسان جو آشیانہ بنا کر اسے جلا ڈالے کہاں ہے؟ گویا ہر کوئی دنیاوی مال و جاہ کے حصول میں کھویا ہوا ہے لیکن اللہ کی راہ میں جان و مال کی قربانی دینے والا کوئی نظر نہیں آتا۔

۴- اس دنیا میں آغاز سے اب تک ہزاروں قافلے آئے اور اسے غیروں کی طرح دیکھتے ہوئے چلے گئے لیکن وہ قافلہ کہاں ہے جس نے اس دنیا کو محرموں یا اپنوں کی طرح دیکھا ہو۔ گویا اس دنیا میں لاتعداد انسانوں کی آمد و رفت جاری ہے لیکن حقیقی زندگی کیا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے' اس کی طرف کوئی بھی توجہ نہیں کر رہا۔

۵- تو موج کی طرح اٹھ/ بلند ہو اور ہمیشہ سمندر ہی میں گھلا ملا رہ۔ اے بے خبر تو ساحل کا طالب ہے۔ یہاں ساحل کہاں ہے یعنی نہیں ہے۔ موج اٹھتی ہے اور پھر سمندر ہی میں مل جاتی ہے گویا سمندر بن جاتی ہے۔ اسی طرح تو بھی اپنی خودی سے آگاہ ہو جا اور خدا کی معرفت میں ڈوب کر خود میں خدائی صفات پیدا کر لے' اس طرح تو بھی لامحدود ہو جائے گا۔

۶- تو آ کہ تیری انگور کی بیل کی رگ میں تازہ خون دوڑا ہے۔ اب تو یہ مت کہہ یا مت پوچھ کہ وہ شراب فروش والی شراب کہاں ہے۔ اپنی شاعری کے حوالے سے بات کی ہے یعنی میری شاعری میں دیئے گئے پیغام پر عمل پیرا ہو کر تجھ میں خودی اور خودشناسی کا جذبہ پیدا ہوا ہے۔ اب تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ ایسا پیغام کہیں نہیں ہے یا ایسا پیغام دینے والا کوئی نہیں ہے۔

۷- تو ایک ہی چھلانگ میں زمانے کو طے کر لے۔ اس صورت میں جب تو دیر اور جلدی یا زمانے کی ظاہری تقسیم سے آگے نکل گیا تو پھر زمانہ کہاں رہا یعنی زمانے پر تیرا غلبہ ہوگا۔ مطلب یہ کہ اپنے جہد و عمل سے ہر لمحہ آگے بڑھتا چلا جا اور یوں حقیقی زندگی اختیار کر کے زمانے پر چھا جا۔

نظم-۱۸

(یہ نظم کی صورت میں ہے)

۱- مانند صبا خیز و وزیدن دگر آموز دامانِ گل و لالہ کشیدن دگر آموز
اندر دلکِ غنچہ خزیدن دگر آموز

۲- موئینہ بہ بر کردی و بے ذوق تپیدی آں گونہ تپیدی کہ بجائے نہ رسیدی
در انجمنِ شوق تپیدن دگر آموز

۳- کافر! دلِ آوارہ دگر بار باو بند برخویش کشا دیدہ و از غیر فرو بند
دیدن دگر آموز ندیدن دگر آموز

۴- دم چیست؟ پیام است شنیدی نشنیدی درخاک تو یک جلوۂ عام است ندیدی
دیدن دگر آموز شنیدن دگر آموز

۵- ما چشم عقاب و دل شہباز نداریم چوں مرغِ سرا لذت پرواز نداریم
اے مرغ سرا خیز و پریدن دگر آموز

۶- تخت جم و دارا سرِراہے نفروشند ایں کوہ گران است بکاہے نفروشند
باخونِ دلِ خویش خریدن دگر آموز

۷- نالیدی و تقدیر ہمان است کہ بوداست آں حلقۂ زنجیر ہمان است کہ بوداست
نومید مشو' نالہ کشیدن دگر آموز

۸- واسوختہ ای؟ یک شرر از داغِ جگر گیر یک چند بخود پیچ و نیستاں ہمہ درگیر
چوں شعلہ بخاشاک دویدن دگر آموز

۱- تو صبا کی طرح اٹھ/ چل اور نئے انداز میں چلنا سیکھ۔ تو گل و لالہ کا دامن کھینچنے کا دوسرا انداز سیکھ اور کلی کے چھوٹے سے دل میں پھر سے خلش پیدا کرنے کا انداز سیکھ۔ گویا سوئی ہوئی ملت کو پھر سے بیدار کر اور دوسروں میں بھی یہ احساس پیدا کر نیز لوگوں کے باطن کی اصلاح کرنا سیکھ۔

۲- تو نے صوف کا لباس پہنا اور بے ذوق انداز میں تڑپا' اور تو کچھ اس انداز میں تڑپا کہ کسی منزل تک نہ پہنچ پایا۔ تو بزم شوق میں پھر سے تڑپنا سیکھ۔ نام نہاد صوفیوں کی طرف اشارہ ہے جن کا سب وجد و حال محض دکھاوے کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ معرفت ایزدی

سے محروم رہتے ہیں۔ اس حوالے سے اہل عشق کی صحبت اختیار کرنے کا درس دیا ہے۔

۳۔ اے کافر (نام نہاد صوفی یا مسلمان!) تو اپنا آوارہ دل پھر سے اس محبوب حقیقی سے لگا۔ آنکھیں اپنے اوپر کھول اور غیر سے آنکھیں بند کر لے۔ دیکھنے کا اور انداز سیکھ اور نہ دیکھنے کا اور انداز سیکھ۔ گویا تو جو محض نام کا مسلمان ہے' اپنی خودی اور معرفت سے آگاہ ہو' اس ذات ایزدی سے خود کو وابستہ کر اور ماسوا اللہ یا غیر اللہ سے خود کو دور رکھ کہ صحیح دیکھنے کا انداز یہی ہے۔

۴۔ سانس کیا ہے؟ یہ محبوب کا پیام ہے' جو تو نے خواہ سنا ہے یا نہیں سنا۔ تیری خاک (جسم) میں ایک جلوۂ عام ہے جو تو نے نہیں دیکھا۔ تو پھر سے دیکھنا اور پھر سے سننا سیکھ۔ قرآنی تلمیح ہو سکتی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے کہ میں انسان کی شہ رگ کے بھی قریب ہوں۔ گویا تیرے وجود میں اس ذات حق کا جلوہ کارفرما ہے اور یہ سانس یا ہر سانس گویا اس ذات کا پیام ہے' اس سے آگاہی کے لیے تو اپنی معرفت حاصل کر اور یوں اپنے دیدۂ بیدار سے اپنے اندر اس محبوب کے جلوے کا نظارہ کر لے کہ دیکھنے اور سننے کا یہی انداز صحیح ہے۔ گویا:

دل کے آئینے میں ہے تصویر یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

۵۔ ہماری نہ تو آنکھیں عقاب کی آنکھوں کی سی ہیں اور نہ دل ہی شہباز کے دل کے سے ہیں۔ گھریلو یا پالتو پرندے کی طرح ہم لذت پرواز سے محروم ہیں۔ اے پالتو پرندے تو اڑنے کا دوسرا انداز سیکھ یعنی ہم عظیم جذبوں' گہری بصیرت اور زندہ دل سے عاری ہیں۔ بلند مقام و مرتبہ کی ہم میں خواہش ہی نہیں ہے۔ بس دنیاوی اور مادی دھندوں میں کھوئے رہتے ہیں۔ ضروری ہے کہ ہم اپنی اس حالت کو بدلیں اور بلندیوں کی طرف بڑھیں۔

۶۔ جمشید اور دارا کا تخت راستے میں یوں نہیں بکتا۔ یہ تو بھاری پہاڑ ہے جسے تنکے کے عوض نہیں بیچا جاتا تو اسے اپنے خونِ دل کے ساتھ خریدنے کا نیا یا دوسرا انداز سیکھ۔ گویا عظمت و بلند مرتبگی اور بقا کے لیے سخت جدوجہد اور سعی و کوشش کی ضرورت ہے۔

۷۔ تو رویا پیٹا لیکن تیری تقدیر وہی ہے جو پہلے تھی (اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی) زنجیر کا وہ حلقہ ویسا ہی ہے جیسا کہ تھا تو مایوسی کا شکار نہ ہو' نالہ کشی کا دوسرا انداز سیکھ۔ تو

نے خود کو تقدیر کی مجبوری میں جکڑ رکھا ہے' حالانکہ جہد و عمل سے تقدیر بدلی جا سکتی ہے۔ علامہ ہی کے بقول:

عبث ہے شیوۂ تقدیر یزداں
تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے

۸۔ کیا تو جل کر راکھ ہو گیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو تو اپنے سوختہ جگر سے ایک چنگاری لے لے۔ کچھ دیر اپنے گرد لپٹ اور سارے سرکنڈے کے سارے جنگل کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔ تو شعلے کی طرح خشک گھاس پھوس میں دوڑنا سیکھ۔ گویا اپنی خودی کو مضبوط کر' اپنی مخفی قوتوں اور صلاحیتوں کو کام میں لا کر باطل قوتوں سے ٹکرا جا اور یوں اپنی بقا کا سامان کر۔

نظم-۱۹

۱۔ اے غنچۂ خوابیدہ چو نرگس نگراں خیز کاشانۂ مارفت بتاراج غماں خیز
از نالۂ مرغِ چمن' از بانگ اذاں خیز از گرمی ہنگامہ آتش نفساں خیز
از خواب گراں' خواب گراں' خواب گراں خیز
از خواب گراں خیز

۲۔ خورشید کہ پیرایہ بسیمائے سحر بست آویزہ بگوش سحر از خونِ جگر بست
از دشت و جبل قافلہ ہا رختِ سفر بست اے چشم جہاں بیں بہ تماشاے جہاں خیز
از خواں گراں' خواب گراں' خواب گراں خیز
از خواب گراں خیز

۳۔ خاور ہمہ مانند غبار سر راہے است یک نالہ خاموش و اثر باختہ آہے است
ہر ذرہ ایں خاک گرہ خوردہ نگاہے است از ہند و سمرقند و عراق و ہمداں خیز
از خواب گراں' خواب گراں' خواب گراں خیز
از خواب گراں خیز

۴۔ دریاے تو دریاست کہ آسودہ چو صحراست دریاے تو دریاست کہ افزوں نشد و کاست
بیگانۂ آشوب و نہنگ است چہ دریاست از سینہ چاکش صفت موج رواں خیز

از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز
از خواب گراں خیز

۵۔ ایں نکتہ کشایندۂ اسرارِ نہان است ملک است تن خاکی و دیں روح روان است
تن زندہ و جاں زندہ ز ربطِ تن و جان است باخرقہ و سجادہ و شمشیر و سنان خیز
از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز
از خواب گراں خیز

۶۔ ناموسِ ازل را تو امینی تو امینی دارائے جہاں را تو یساری تو یمینی
اے بندۂ خاکی تو زمانی تو زمینی صہبائے یقیں درکش و از دیرِ گماں خیز
از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز
از خواب گراں خیز

۷۔ فریاد ز افرنگ و دل آویزی افرنگ فریاد ز شیرینی و پرویزی افرنگ
عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزی افرنگ معمارِ حرم! باز بہ تعمیرِ جہاں خیز
از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز
از خواب گراں خیز

۱۔ اے سوئے ہوئے غنچے تو نرگس کی طرف دیکھتے ہوئے اٹھ جا، بیدار ہو جا۔ ہمارا گھر غموں نے تباہ کر دیا ہے۔ تو خواہ چمن کے پرندے کے نالہ کی آواز سے اٹھ اور خواہ اذان کی آواز سے اٹھ، خواہ آگ ایسا سانس رکھنے والوں کے ہنگامے کی گرمی سے اٹھ۔ تو غفلت کی/ گہری نیند سے، گہری نیند سے، گہری نیند سے اٹھ، گہری نیند سے اٹھ۔ اس بند میں سوئی ہوئی قوم سے خطاب ہے جو انگریزوں کی غلامی کے باعث ذلت وخواری اور مصیبتوں بھری زندگی گذارنے پر مجبور ہے۔ مطلب یہ کہ تو کسی بھی بہانے یا طریقے سے بیدار ہو کر اپنی آزادی کا اور ان مصیبتوں سے بچنے کا سامان کر۔

۲۔ سورج، جس نے صبح کی پیشانی کو زیور سے آراستہ کیا، اس نے صبح کے کانوں میں خونِ جگر سے بندا/ بالا ڈالا۔ بیابان اور پہاڑ سے قافلوں نے سفر کی خاطر سامان سفر باندھ لیا۔ اے دنیا کو دیکھنے والی آنکھ تو بھی دنیا کے نظارے کے لیے اٹھ/ اٹھ جا۔ تو گہری نیند، گہری نیند، گہری نیند سے اٹھ جا، گہری نیند سے اٹھ جا۔ صبح طلوع ہونے پر شروع میں سورج کی روشنی میں ذرا سی سرخی ہوتی ہے جسے خون جگر کہا گیا ہے اور زیور

سے مراد روشنی ہے۔ مطلب یہ کہ دن چڑھ گیا ہے۔ دنیا اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہوگئی ہے' تو بھی اٹھ اور جہد وعمل کی راہ پر گامزن ہو جا۔

۳- مشرق پورے طور پر راستے کے غبار کی مانند ہے۔ وہ گویا ایک خاموش نالہ اور بے اثر آہ ہے (بے نتیجہ ہے) اس سرزمین کا ہر ذرہ گویا ایک الجھی ہوئی نگاہ ہے۔ تو ہند اور سمرقند اور عراق اور ہمداں سے اٹھ' گہری نیند سے' گہری نیند سے' گہری نیند سے اٹھ' گہری نیند سے اٹھ یعنی اہل مشرق زندگی کے ہر شعبہ میں پس ماندہ ہونے کے باعث ذلت وخواری سے دوچار ہیں۔ ان کا کوئی بھی کام اعلیٰ نتیجہ خیز نہیں ہے۔ اپنی اس ناگفتہ بہ حالت اور یورپ والوں کی عیاری و مکاری پر ان کی نظر نہیں ہے۔ اے اہل مشرق تم جہاں بھی ہو' ہندوستان میں' وسطی ایشیا میں' عراق اور ایران میں...... بیدار ہو جاؤ اور اپنے ملکوں کو سنوارنے میں لگ جاؤ۔

۴- تیری زندگی کا سمندر ایک ایسا سمندر ہے جو صحرا کی طرح آرام کر رہا یا پرسکون اور خاموش ہے۔ گویا تو حرکت وعمل سے نا آشنا ہے۔ تیرا یہ سمندر ایک ایسا سمندر ہے جس میں اضافہ تو نہیں ہوا' کمی ہی ہوئی ہے۔ یہ کیسا سمندر ہے جو طوفان اور مگرمچھ سے نا آشنا ہے۔ تو اس کے پھٹے ہوئے سینے سے موج رواں کی طرح اٹھ' گہری نیند' گہری نیند' گہری نیند سے اٹھ' گہری نیند سے اٹھ یعنی تو عمل سے بیگانہ ہو کر اور اپنی کاہلی کی وجہ سے پہلی حالت سے بھی زیادہ بری حالت کا شکار ہو گیا ہے۔ تیری زندگی جوش و جذبہ' سوز وحرارت اور کردار وعمل سے بیگانہ ہونے کے باعث مصائب و آلام کا مقابلہ کرنے سے قاصر ہے۔ تو زور شور سے بیدار ہو جا اور جہد وعمل کو اپنا کر اپنی سربلندی و بقا کا سامان کر۔

۵- یہ باریک اور گہری بات پوشیدہ رازوں کو افشا کرنے والی ہے کہ ملک اگر مٹی کا جسم ہے تو دین اس کی روح رواں ہے یعنی جو مرتی نہیں ہمیشہ برقرار اور رواں دواں رہتی ہے۔ بدن اگر زندہ ہے اور جان اگر زندہ ہے تو یہ تن اور جان کے باہمی ربط کے باعث ہے تو خرقہ اور سجادہ اور شمشیر وسناں کے ساتھ اٹھ' گویا ملک اور دین میں جسم اور روح کا سا تعلق ہے۔ دین کے لیے خرقہ اور سجادہ کا اور ملک کے لیے شمشیر وسناں کا استعارہ استعمال کیا ہے۔ اسلام سیاست یا دنیا اور دین دونوں کے ربط کا قائل ہے کہ اسی سے انسانیت کا حامل معاشرہ وجود میں آتا ہے تو گہری نیند' گہری نیند' گہری نیند

سے اٹھ، تو گہری نیند سے اٹھ۔ علامہ نے اردو میں یہ بات ذرا بدل کر کہی ہے:

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر

۶- ناموسِ ازل کا تو امانتدار ہے، تو امانتدار ہے۔ تو کائنات کے مالک کا دایاں بازو ہے، تو بایاں بازو ہے۔ اے بندۂ خاکی تو زمان ہے تو زمین ہے تو یقین کی شراب پی جا اور وہم و گمان کے مندر سے اٹھ جا۔ گہری نیند سے، گہری نیند سے، گہری نیند سے اٹھ، گہری نیند سے اٹھ۔ مطلب یہ کہ تو زمین پر خدا کا نائب/ خلیفہ ہے۔ یہ خلافت گویا تیرے پاس امانت ہے اور تو دنیا میں اس خالق کے نظام کو چلانے والا ہے لیکن تو نے اپنے خلافت و نیابت کے منصب اور اس کے فرائض کی انجام دہی کو بھلا دیا اور محض مٹی کا مادھو بن کر رہ گیا ہے اور خود کو مادی دنیا سے وابستہ کر رکھا ہے۔ تو نے ایمان و یقین کی بجائے خود کو بے یقینی کا شکار کر رکھا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تو ایسی فضا سے باہر آ تا کہ تجھ میں ایمان و یقین کی پختگی پیدا ہو اور یوں تو حقیقی زندگی سے آگاہ ہو کر اپنی بقا کا سامان کرنے میں لگ جائے۔

۷- یورپ اور اس کی دل کش فضا کے ہاتھوں فریاد ہے۔ یورپ کے شیریں پن اور پرویز پن کے ہاتھوں فریاد ہے۔ تمام دنیا یورپ والوں کی چنگیزی (ظلم و ستم) کے باعث ویران ہو کر رہ گئی ہے۔ اے حرم کے معمار تو پھر دنیا کی تعمیر کے لیے اٹھ۔ گہری نیند سے، گہری نیند، گہری نیند سے اٹھ، گہری نیند سے اٹھ۔ گویا اہل یورپ میں شیریں (فرہاد کی محبوبہ) کا سا حسن و دل کشی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ خسرو پرویز کی طرح مکار و عیار ہیں، انہوں نے چند صدیوں سے اپنی ابلیسی تہذیب اور دین سے بیگانہ کرنے والے علوم و فنون کی ظاہری چمک دمک سے اہل دنیا بالخصوص مسلمانوں کو دیوانہ بنا رکھا ہے اور وہ اپنے مذہب سے دور ہو چکے ہیں۔ دوسرے شعر میں چنگیز کے ظلم و ستم کے حوالے سے یورپ والوں کی سیاسی اور فکری یلغار کی بات کی ہے۔ چنگیز نے ۶۱۶ھ میں ایران میں قتل عام کر کے ایران کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ کچھ یہی بات یورپ والوں نے مذکورہ انداز میں کی ہے۔ خدا ان سے بچائے۔ آخر میں علامہ نے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے انہیں پھر سے اسلامی تہذیب کو پھیلانے کی بات کی ہے جس (تہذیب) نے اہل دنیا میں انسانیت کے صحیح جذبے پیدا

کیے تھے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ (مسلمان) صحیح معنوں میں مسلمان بنیں اور خود کو دین کی قوت سے طاقت ور بنائیں۔ علامہ نے اردو میں یہی بات اس انداز میں کی ہے:

سبق پھر پڑھ شجاعت کا، عدالت کا صداقت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

غزل-۲۰

۱- جہانِ ما ہمہ خاک است و پے سپر گردد — ندانم ایں کہ نفس ہائے رفتہ بر گردد
۲- شبے کہ گورِ غریباں نشیمن است اورا — مہ و ستارہ ندارد چساں سحر گردد
۳- دلے کہ تاب و تب لایزال می طلبد — کرا خبر کہ شود برق یا شرر گردد
۴- نگاہِ شوق و خیالِ بلند و ذوقِ وجود — مترس ازیں کہ ہمہ خاکِ رہ گذر گردد
۵- چناں بزی کہ اگر مرگِ ماست مرگِ دوام — خدا ز کردۂ خود شرم سارتر گردد

۱- ہماری دنیا یعنی انسانی جسم سراپا مٹی ہے اور یہ مٹی اڑ جائے گی یا فنا ہو جائے گی۔ مجھے یہ خبر نہیں کہ میرے جو سانس جا چکے ہیں وہ واپس بھی آئیں گے یا نہیں آئیں گے۔ انسان مٹی سے بنا اور فانی ہے۔ جسمانی موت کے بعد اس کا اسی حالت میں آنا ناممکن ہے۔ ہاں اگر وہ یہاں جذبوں اور جہد و عمل سے کام لے تو وہ اپنی بقا کا سامان کر سکتا ہے۔ اس کی روح زندہ رہ سکتی ہے۔

۲- وہ رات جس کا ٹھکانا اجنبیوں/ مسافروں کی قبر ہے، چاند اور ستارے کو یہ علم نہیں کہ یہ رات کیونکر صبح میں بدلے گی۔ غریباں سے مراد وہ انسان جو مر کر دوسری دنیا کی طرف سفر کر جاتے ہیں، وہی پہلے شعر والی بات ذرا بدل کر۔ مطلب یہ کہ انسان قبر میں جا کر مٹی کے اندر مٹی ہو جاتا ہے۔ اس کے بارے میں کسی کو یہ علم نہیں کہ وہ پھر یا قیامت کے روز اسی جسمانی صورت میں اٹھے گا یا کسی اور صورت میں۔

۳- وہ دل جو لازوال یا ختم نہ ہونے والی تب و تاب کا خواہاں ہے، کسے خبر کہ وہ بجلی بنے گا یا شرر بن جائے گا۔ گویا دنیا میں رہتے ہوئے سوز و جذبہ اور تڑپ کا طالب دل خدا معلوم قبر میں دوسروں کو جلا کر خود زندہ رہنے والا بنے گا آسمانی بجلی کی طرح یا پھر چنگاری کی طرح ختم ہو جانے والا بنے گا۔ مذکورہ بالا بات نئے استعارے میں کہی ہے۔

۴- تو اس بات کا خوف مت کھا کہ تیری نگاہِ شوق' تیرا بلند خیال اور وجود برقرار رکھنے کا ذوق سب' تیرے مرنے کے بعد راہ گذر کی خاک بن جائیں گے۔ پہلے تین شعروں میں مرنے کے بعد کی کیفیت سے لاعلمی کا اظہار ہے اور اب یہ کہا ہے کہ اگر تجھ میں یہ باتیں پیدا ہو جاتی ہیں تو مر کر بھی تو فنا نہیں ہوگا' تجھے بقا حاصل ہو جائے گی۔

۵- تو اس طرح زندگی بسر کر کہ اگر ہماری موت ہمیشہ ہمیشہ کی موت ہے تو خدا اپنے کیے پر زیادہ شرمسار ہو۔ گویا پہلے تو وہ ہماری بدکرداریوں پر شرمسار ہے کہ میں نے ایسی تخلیق (انسان کا وجود میں آنا) کیوں کی۔ پھر اس سے بھی زیادہ اسے اس بات پر شرم آئے گی کہ ایسے انسان کو' جو اس کی رضا کے مطابق زندگی بسر کرتا اور اس کی صفات کا مظہر ہے' کیوں عام انسانوں کی طرح ہمیشہ کی نیند سلا دیا۔ خلاصہ یہ کہ جو انسان اللہ کے احکام کے مطابق زندگی بسر نہیں کرتا اس کی موت ہمیشہ ہمیشہ کی موت ہے جبکہ دوسرے مذکورہ انسان کو بقا حاصل ہوگی اور اس کی موت نئی زندگی کا سفر بنے گی۔

غزل-۲۱

۱- باز بر رفتہ و آیندہ نظر باید کرد — ہلہ برخیز! کہ اندیشہ دگر باید کرد
۲- عشق برناقہ ایام کشد محمل خویش — عاشقی؟ راحلہ از شام و سحر باید کرد
۳- پیر ما گفت جہاں بر روشے محکم نیست — از خوش و ناخوش او قطع نظر باید کرد
۴- تو اگر ترک جہاں کردہ سر او داری — پس نخستیں ز سر خویش گذر باید کرد
۵- گفتمش در دل من لات و منات است بسے — گفت ایں بت کدہ را زیر و زبر باید کرد

۱- تجھے پھر سے اپنے گذرے ہوئے اور آنے والے واقعات پر نظر کرنی چاہیے۔ خبردار ہو جا' اٹھ کھڑا ہو کہ تجھے پھر سے نئے انداز میں سوچنا چاہیے۔ مطلب یہ کہ اس بات پر غور کر کہ تجھے کیا ہونا چاہیے تھا اور کیا نہیں ہوا۔ اپنی خامیوں' کوتاہیوں پر نظر کر کے اپنی اصلاح کی طرف توجہ کر۔

۲- عشق زمانے کی اونٹنی پر اپنے محمل لگاتا ہے۔ کیا تو عاشق ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر تجھے شام اور صبح کو اپنی سواری بنانا چاہیے۔ گویا ایک عاشق حقیقی جو اس محبوب حقیقی کے عشق کے جذبوں سے سرشار ہوتا ہے' زمان و مکاں پر حاکم یعنی اس کی قید سے آزاد ہوتا

ہے۔ کائنات کو مسخر کرکے اپنے حسب منشا اس سے کام لیتا ہے۔

۳- ہمارے مرشد نے ہم سے فرمایا کہ یہ دنیا ایک ہی روش پر برقرار نہیں ہے، لہٰذا اس کے پسندیدہ یا ناپسندیدہ حالات پر توجہ نہیں کرنی چاہیے۔ مطلب یہ کہ اس دنیا میں رنج وغم بھی آتے ہیں اور خوشی و مسرت بھی انسان کو حاصل ہوتی ہے۔ یہ تغیر و تبدل ایک قدرتی امر ہے جس پر انسان کو راضی رہنا چاہیے کہ یہ سب اس خالق کی رضا ہے۔ فانی بدیوانی نے یوں کہا ہے:

غم بھی گذشتنی ہے خوشی بھی گذشتنی
کر غم کو اختیار کہ گذرے تو غم نہ ہو

۴- (مرشد نے یہ بھی فرمایا کہ) اگر تو یہ خواہش رکھتا ہے کہ ترکِ جہاں کر کے اس محبوب تک رسائی حاصل کرے تو پھر تجھے سب سے پہلے اپنے سر سے گذر جانا چاہیے یعنی اس کی راہ میں ہر طرح کی قربانی ہی سے اس تک رسائی ممکن ہے ورنہ محض دنیا کو ترک کرنے سے بات نہیں بنتی۔

۵- (مرشد کی ان باتوں کے جواب میں) میں نے کہا کہ میرے دل میں تو بہت سے بت ہیں یعنی بڑے الٹے سیدھے اور شیطانی خیالات سے میرا دل بھرا ہوا ہے۔ اس کا جواب یہ دیا کہ اس بت خانے کو تہ و بالا کر دینا چاہیے۔ گویا ایسے خیالات سے پورے طور پر بچو، دور رہو، پھر ہی اس محبوب تک رسائی ممکن ہے یعنی بتوں سے بھی محبت ہو اور محبوب حقیقی تک رسائی کی خواہش بھی ہو تو ایسی صورت میں یہ رسائی ناممکن ہے۔

غزل-۲۲

۱- خیالِ من بہ تماشاے آسماں بوداست — بدوشِ ماہ و بآغوشِ کہکشاں بوداست
۲- گماں مبر کہ ہمیں خاکداں نشیمن ماست — کہ ہر ستارہ جہان است یا جہاں بوداست
۳- بچشمِ مورِ فرومایہ آشکار آید — ہزار نکتہ کہ از چشمِ ما نہاں بوداست
۴- زمیں بہ پشت خود الوند و بیستوں دارد — غبار ماست کہ بردوشِ اوگراں بوداست
۵- زداغِ لالہ خونیں پیالہ می بینم — کہ ایں گسستہ نفس صاحب فغاں بوداست

۱- میرا خیال آسمان کے نظارے میں محو رہا ہے۔ وہ (خیال) چاند کے کندھوں پر اور کہکشاں

کی گود میں رہا ہے۔ یہ بات ایک مردِ حق کے حوالے سے کہی گئی ہے جو خدا کا برگزیدہ بندہ ہونے کے باعث زمین پر رہتے ہوئے بھی آسمان کے اس پار دیکھ سکتا ہے۔

۲- تو یہ خیال مت کر کہ مٹی کا یہ گھر (دنیا) ہی ہمارا ٹھکانا ہے۔ اس لیے کہ ہر ستارہ ایک جہان ہے یا جہان رہا ہے۔ مطلب یہ کہ کیا خبر کہ انسان کون کون سے جہانوں سے ہوتا ہوا اس دنیا میں پہنچا ہے اور اب بھی کس کس جہان میں وہ گھوم پھر رہا ہے۔

۳- ہزاروں ایسی گہری اور باریک باتیں جو ہماری آنکھوں/نظروں سے اوجھل/پوشیدہ ہیں، وہ ایک حقیر چیونٹی کی نگاہوں میں ظاہر ہو رہی ہیں۔ چیونٹی سے مراد ایک صاحب بصیرت انسان ہی ہو سکتا ہے جو اس ناپیدا کنار کائنات میں بحیثیت انسان کے ایک چھوٹی سی مخلوق ہونے کے باوجود بہت سی حقیقتوں اور رمزوں سے آگاہ ہوتا ہے۔ یہ رمزیں اس پر آشکار ہو جاتی ہیں اور یہ ہر انسان کے بس کی بات نہیں۔

۴- زمین اگرچہ الوند اور بے ستوں پہاڑوں یعنی عام پہاڑوں کا بوجھ اپنی پیٹھ پر رکھتی ہے لیکن ایک ہمارا غبار ہے جو اس کے لیے بوجھل ہے۔ غبار سے مراد جسم ہے، یعنی پہاڑ تو زمین پر برقرار رہتے ہیں جبکہ انسان کو یہاں ثبات نہیں ہے۔ وہ یہاں آتا اور کچھ عرصہ زندگی گذار کر رخصت ہو جاتا ہے۔

۵- میں لالہ کے خون بھرے پیالے کے داغ سے دیکھ رہا ہوں کہ یہ ٹوٹے ہوئے سانس والا یعنی خاموش پھول کبھی فریاد کرنے والا رہا ہے۔ لالہ کے اندر جو داغ ہوتا ہے اسے گویا عشق کی علامت قرار دیا ہے۔ اگرچہ یہاں صرف لالہ کا حوالہ آیا ہے تاہم یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ دنیا کی ہر شے میں عشق کسی نہ کسی صورت میں کارفرما نظر آتا ہے۔

غزل-۲۳

۱-	از نوا بر من قیامت رفت و کس آگاہ نیست	پیش محفل جز بم و زیر و مقام و راہ نیست
۲-	در نہادم عشق با فکر بلند آمیختند	ناتمام جاودانم کار من چوں ماہ نیست
۳-	لب فرو بند از فغاں، در ساز با درد فراق	عشق تا آہے کشد از جذب خویش آگاہ نیست
۴-	شعلہ ے می باش و خاشاکے کہ پیش آید بسوز	خاکیاں را در حریم زندگانی راہ نیست
۵-	جرہ شاہینی بمرغانِ سرا صحبت مگیر	خیز و بال و پر کشا پرواز تو کوتاہ نیست

۶- کرم شب تاب است شاعر در شبستانِ وجود　　　در پر و بالش فروغے گاہ ہست و گاہ نیست

۷- در غزل اقبالؔ احوالِ خودی رافاش گفت　　　زاں کہ ایں نو کافراز آئین دہر آگاہ نیست

۱- نغمہ (نغمہ سرائی) سے مجھ پر قیامت گذر گئی لیکن کسی کو خبر نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ اہل محفل کے نزدیک تو یہ محض اونچے نیچے سر تال اور راگ کے پردوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ میری شاعری میں میرا خون جگر شامل ہے لیکن لوگوں نے اسے محض فنی خوبیوں کی حامل عام شاعری سمجھا ہے۔

۲- قضا و قدر نے میری فطرت میں عشق کو بلند فکر کے ساتھ ملایا ہے۔ میں ہمیشہ نامکمل رہنے والا ہوں‘ میرا معاملہ چاند کا سا نہیں ہے یعنی میرا عشق عقل و خرد کی دولت سے بھی مالا مال ہے۔ چاند چودھویں رات کے بعد گھٹنا شروع ہو جاتا ہے جبکہ عشق میں انسان کتنا ہی بڑھ جائے اس کا عشق نامکمل ہی رہتا ہے‘ یوں کہہ لیں کہ وصل عشق کا خاتمہ اور فراق و ہجر اس کی ناتمامی ہے۔ بقولِ مومن خان مومنؔ:

مرگ ہے انتہائے شوق یاں رہی ابتدائے عشق
زندگی اپنی ہو گئی رنجش بار بار میں

۳- تو اپنے ہونٹ بند کر لے اور آہ و فغاں نہ کر اور دردِ فراق سے موافقت کر (اسے برداشت کر) اگر عشق آہ بھرتا یا آہیں بھرتا ہے تو اس سے یہی واضح ہوگا کہ اسے اپنے جذب کی کچھ خبر نہیں۔ گویا عشق اسی وقت صحیح عشق بنتا ہے جب اس میں محبوب کی رضا ہو اور جب محبوب کی رضا بنیادی شرط ہے تو پھر آہ فغاں کس لیے؟

۴- تو ایک شعلہ بن جا اور جو بھی خشک تنکا تیرے سامنے آئے اسے جلا ڈال۔ اس لیے کہ مٹی کے بنے ہوئے انسانوں کے لیے زندگی کی چار دیواری/گھر میں داخل ہونے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ گویا اگر تو اپنے اندر جذبہ و سوز عشق پیدا کر لے تو تو نے زندگی کا اصل مقصد پورا کر دیا۔ بصورتِ دیگر تیری حالت ایک چلتی پھرتی لاش کی سی ہوگی۔

۵- تو ایک نر شاہین ہے‘ پالتو یا گھر کے پرندوں کے ساتھ صحبت نہ رکھ۔ تو اٹھ اور اپنے بال و پر کھول یعنی اڑ کیونکہ تری پرواز تھوڑی بلندی والی نہیں ہے یعنی تیری پرواز سب سے بلند ہے۔ مطلب یہ کہ تو مردِ مسلمان ہے‘ کوتاہی اور آرام طلبی چھوڑ اور جہد و عمل کی راہ پر چل کر اپنی عظمت و سربلندی کا سامان کر۔

۶- وجود کے شبستان میں شاعر گویا ایک جگنو ہے۔ اس کے بال و پر میں کبھی روشنی ہوتی

ہے اور کبھی نہیں ہوتی۔ مطلب یہ کہ شاعر تاریک معاشرے میں روشنی پھیلانے والا ہے۔ اس کے افکار اس کے دل میں قدرت کی طرف سے نازل ہوتے ہیں۔ یہ کبھی نازل ہوتے اور روشنی پھیلاتے ہیں لیکن کبھی نازل نہیں ہوتے۔ یہ کیفیت جگنو کی سی ہے جو اڑتے وقت رات کو کبھی چمکتا ہے اور کبھی نہیں چمکتا۔

۷- اقبال نے اپنی غزل (شاعری) میں خودی کے راز کو کھل کر بیان کر دیا۔ اس لیے کہ یہ نیا نیا کافر ہونے والا مندر کے آئین سے آگاہ نہیں ہے۔ اہل خانقاہ کے نزدیک تو خودی کے معنی غرور اور تکبر کے ہیں اور اسے وہ برا جانتے ہیں جبکہ اقبال اس خانقاہی ماحول سے پوری طرح واقف نہیں ہے، اس نے اس ماحول کی پروا کیے بغیر خودی کی حقیقت بیان کر دی ہے۔

غزل-۲۴

۱-	شرابِ میکدۂ من نہ یادگارِ جم است	فشردۂ جگر من بشیشہ عجم است
۲-	چو موج می تپد آدم بجستجوے وجود	ہنوز تا بہ کمر درمیانۂ عدم است
۳-	بیا کہ مثل خلیل ایں طلسم در شکنیم	کہ جز تو ہر چہ دریں دیر دیدہ ام صنم است
۴-	اگر بسینۂ ایں کائنات در نروی	نگاہ را بہ تماشا گذاشتن ستم است
۵-	غلط خرامی ما نیز لذتے دارد	خوشم کہ منزلِ ما دور و راہ خم بخم است
۶-	تغافلے کہ مرا رخصتِ تماشا داد	تغافل است و بہ از التفات دمبدم است
۷-	مرا اگرچہ بہ بت خانہ پرورش دادند	چکید از لب من آنچہ در دل حرم است

۱- میرے شراب خانے کی شراب ایران کے بادشاہ جمشید کی یادگار نہیں ہے۔ میرے جگر کا نچوڑ تو عجم کی صراحی میں ہے یعنی میری فارسی شاعری میرے اپنے جذبوں اور افکار کی حامل ہے۔ یہ افکار ایرانی شعرا کی شاعری سے اخذ نہیں کیے گئے۔

۲- آدمی وجود کی جستجو میں موج کی طرح تڑپتا ہے۔ ابھی تک وہ 'کمر تک' عدم کے درمیان ہے۔ گویا حقیقی وجود اس واجب الوجود کا ہے۔ آدمی صرف اسی کی بنا پر موجود ہے۔ اس کی خدا کے سے وجود کے لیے تڑپ بے معنی ہے۔ اس لیے کہ وہ کتنی بھی ترقی کر جائے وہ بندۂ خدا ہی رہے گا جسے فنا ہے، وہ خدا نہیں بن سکتا۔

۳- آ کہ ہم خلیلؑ کی طرح اس جادو کا توڑ کریں کیونکہ اس بت کدے میں میں نے تیرے

سوا جو کچھ بھی دیکھا ہے، وہ بت ہی ہے۔ جس طرح حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے کعبہ کے بت پاش پاش کر دیئے تھے اسی طرح ہم اس فانی اور غیر حقیقی وجود والی دنیا سے دل نہ لگائیں کیونکہ یہ بھی ایک طرح سے صنم کدہ ہے۔ اصل وجود اس ذات اقدس کا ہے اور وہی معبود مطلق ہے، اس لیے اسی سے دل لگانا چاہیے۔

۴- اگر تو اس کائنات کے اندر/ سینے میں داخل نہ ہو تو یہ ستم کی بات ہوگی کہ تیری نگاہیں اس کے ظاہری تماشا ہی میں مصروف رہیں۔ ضروری ہے کہ اس کائنات کی حقیقت تک پہنچا جائے اور اس کی تسخیر پر توجہ دی جائے کہ انسانی زندگی کا اصل مقصد یہی ہے۔

۵- ہمارے غلط انداز میں ٹہلنے یا چلنے میں بھی ایک لذت ہے۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ ہماری منزل دور اور راستہ پیچ در پیچ ہے۔ منزل تک رسائی کا جوشوق و جذبہ ہے، وہ منزل پر پہنچنے پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ اس امر کا بھی استعارہ ہے کہ وصل میں جذبۂ عشق مر جاتا جبکہ ہجر وفراق میں برقرار رہتا ہے۔ بقول مومن:

مرگ ہے انتہائے شوق یاں رہی ابتدائے عشق
زندگی اپنی ہوگئی رنجش بار بار میں

۶- اے محبوب تیرا وہ تغافل جس سے مجھے تیرے دیدار کا موقع مل گیا، ایک ایسا تغافل ہے جو تیری ہر لمحہ کی توجہ سے بہتر ہے۔ عاشق نے محبوب سے دیدار کی خواہش کی اس نے ایک خاص معشوقانہ انداز یا کرشمہ وناز سے منہ موڑ لیا۔ اس انداز یا نظارے نے عاشق کے دل کو فریفتہ کر دیا، بصورت دیگر اس محبوب کی توجہ میں ایسا لطف نہ ہوتا۔

۷- اگر چہ میری پرورش بت خانے میں ہوئی ہے، لیکن میرے ہونٹوں سے وہی کچھ نکلا ہے جو حرم کے دل میں ہے۔ بت خانہ سے مراد اس وقت کا ہندوستان ہے (جسے آج کل برصغیر پاک وہند کہا جاتا ہے) گویا علامہ نے یہاں کی غیر اسلامی فضا میں جو کچھ بھی کہا ہے وہ اسلام ہی ہے اور اس کی تعلیمات ہی سے متعلق ہے۔

غزل-۲۵

۱- لالۂ صحرایم از طرفِ خیابانم برید — در ہوائے دشت و کہسار و بیابانم برید
۲- رو بہی آموختم از خویش دور افتادہ ام — چارہ پردازاں! بآغوش نیستانم برید

۳- درمیانِ سینہ حرفے داشتم، گم کردہ ام ۔۔۔ گرچہ پیرم پیش ملائے دبستانم برید

۴- سازِ خاموشم نوائے دیگرے دارم ہنوز ۔۔۔ آں کہ بازم پردہ گرداند بپے آنم برید

۵- درشب من آفتاب آں کہن داغے بس است ۔۔۔ ایں چراغِ زیرِ فانوس از شبستانم برید

۶- من کہ رمزِ شہریاری باغلاماں گفتہ ام ۔۔۔ بندۂ تقصیر وارم پیش سلطانم برید

۱- میں تو صحرا کا لالہ ہوں مجھے کیاری/ باغ سے لے جاؤ اور مجھے دشت وکوہسار اور بیابان کی فضا میں لے جاؤ۔ صحرا سے مراد عالم علوی اور کیاری سے مراد دنیا ہے یعنی انسان کی اصل عالم علوی ہے، اسے پھر وہاں پہنچادو۔

۲- (یہاں دنیا میں آکر) میں نے لومڑی کی سی مکاری وعیاری سیکھ لی۔ اے چارہ گرو! مجھے بانسوں کے جنگل میں لے جاؤ یعنی میں اپنی حقیقت سے غافل ہوگیا، لہٰذا تم پھر مجھے عالم ارواح میں لے جاؤ جہاں میں روح کی صورت میں تھا، ایک طرح سے خود کو بانسری سے تشبیہ دی ہے جو فریاد کر رہی ہے، اسی لیے نیستاں (عالم ارواح کا استعارہ) میں پہنچانے کو کہا ہے۔

۳- میرے سینے/ دل میں ایک بات تھی جو میں گم کر بیٹھا (بھلا بیٹھا) اگرچہ میں اب بوڑھا ہوگیا ہوں، پھر بھی تم مجھے مدرسہ کے مُلاّ کے پاس لے جاؤ۔ خدا نے عالم ارواح میں مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا میں تمہارا خدا نہیں ہوں تو میں/ انسان نے ہاں میں جواب دیا تھا (قالوٰ بلیٰ) لیکن دنیا میں آکر میں یہ بھول گیا۔ اب اگرچہ میں جہاندیدہ اور تجربہ کار اور عمر رسیدہ ہوگیا ہوں لیکن پھر بھی ضرورت اس امر کی ہے کہ مجھے کسی مرشد کے پاس لے جایا جائے۔ جو مجھے میرا بھولا ہوا سبق/ وعدہ یاد دلادے اور یوں میں زندگی کی حقیقت اور مقصد سے آگاہ ہوجاؤں۔

۴- میں ایک خاموش ساز ہوں اور ابھی تک مجھ سے دوسروں کے تاروں سے نکلنے والے نغمے نکل رہے ہیں۔ مجھے تم اس کے پاس لے جاؤ جو پھر سے میرے ساز کے پردوں کو خود ان سے نکلنے والے نغموں سے آشنا کردے۔ تیسرے شعر والی بات نئے استعارے میں کہی ہے یعنی مجھے (انسان کو) جس مقصد کے لیے دنیا میں بھیجا گیا تھا، میں نے وہ تو بھلا دیا اور مادی مقاصد کے پیچھے لگا رہا۔ اب کسی ایسے اہل حق کی صحبت مجھے میسر آجائے جو مجھے مادی چکر سے نکال کر اصل مقصد کی طرف راغب کرے۔

۵- میری رات کو روشن کرنے کے لیے وہ پرانے داغ والا آفتاب ہی کافی ہے۔ میری رات کی

محفل سے فانوس کے نیچے رکھا ہوا چراغ اٹھا لے جاؤ۔ پہلے استعارہ سے مراد عشق اور دوسرے یعنی چراغ سے مراد عقل ہے۔ گویا زندگی کی تاریکیاں عشق ہی سے چھٹتی ہیں' عقل سے نہیں۔

۶- میں کہ جس نے غلاموں کو پادشاہی کی رمز بتائی ہے' ایک قصوروار بندہ ہوں۔ مجھے تم پادشاہ کے پاس لے جاؤ یعنی میں نے لوگوں کو حکمرانوں کے مکر و فریب سے آگاہ کیا اور انہیں آزادی کی زندگی گذارنے کا درس دیا ہے۔ میرا یہ عمل حکمرانوں کے نزدیک ایک لائق سزا جرم ہے۔ مجھے اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔ میں اپنا یہ عمل ہر صورت میں جاری رکھوں گا۔

غزل-۲۶

۱- سخن تازہ زدم کس بہ سخن وا نرسید — جلوہ خوں گشت و نگاہے بہ تماشا نرسید

۲- سنگ می باش و دریں کارگہِ شیشہ گذر — وائے سنگے کہ صنم گشت و بہ مینا نرسید

۳- کہنہ را در شکن و باز بہ تعمیر خرام — ہر کہ در ورطۂ لا ماند بہ اِلاّ نرسید

۴- اے خوش آں جوئے تنک مایہ کہ از ذوق خودی — در دلِ خاک فرو رفت و بدریا نرسید

۵- از کلیمے سبق آموز کہ دانائے فرنگ — جگر بحر شگافید و بہ سینا نرسید

۶- عشق اندازِ تپیدن زدلِ ما آموخت — شررِ ماست کہ برجست بہ پروانہ رسید

۱- میں نے نئے انداز میں شاعری کی' کسی نے بھی میری اس بامقصد شاعری کی طرف توجہ نہیں کی یعنی میری شاعری عام تفریحی قسم کی شاعری سے ہٹ کر ہے۔ جلوہ خون ہو گیا اور ایک بھی نظر اس کے نظارے کے لیے نہیں پہنچی۔ میرے افکار میرے خونِ جگر کا نتیجہ ہیں لیکن کسی نے انہیں کوئی اہمیت نہیں دی۔

۲- تو پتھر بن جا اور شیشے کے اس کارخانے (دنیا) سے گذر۔ افسوس ہے اس پتھر پر جو بت تو بن گیا لیکن اس نے صراحی کی صورت اختیار نہ کی۔ بت صرف ایک خاموش پتھر اور کسی کے کام نہ آنے والی چیز ہے جبکہ صراحی تشنہ لبوں کے کام آتی ہے۔ گویا اس دنیا میں صحیح اور عظیم انسان وہی ہے جو دوسروں کے کام آتا ہے۔

ع دل بدست آور کہ حج اکبر است

۳- پرانی ہر شے کو توڑ دے اور پھر سے اسے تعمیر کرنے کے ارادے سے چل کیونکہ جو کوئی ''لا'' کے بھنور میں پھنس گیا وہ ''الا'' تک نہیں پہنچا۔ مطلب یہ کہ تو پہلے باطل کو توں

اور معبودوں کی نفی کر اور پھر معبودِ حقیقی (الا اللہ) پر ایمانِ کامل لا کر اس پر عمل پیرا ہو جا کہ اسلام کی یہی بنیادی تعلیم ہے۔

۴۔ وہ تھوڑے پانی والی ندی بڑی ہی خوش بخت ہے جس نے اپنے ذوقِ خودی کی بنا پر خاک میں یعنی زمین کے اندر جانا پسند کر لیا لیکن سمندر/ دریا کی طرف نہیں گئی۔ اس استعارے سے قاری کو یہ درس دیا ہے کہ اپنی خودی یا انفرادیت کو برقرار رکھنے ہی میں عافیت و عظمت ہے ورنہ دوسروں کا احسان اٹھانا اور ان کی خوشامدیں کرنا اپنی انفرادیت کھونا ہے جس سے زندگی بے مقصد اور بے آبرو ہو جاتی ہے۔

بقولِ شاعر:

کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں
احسان ناخدا کا اٹھائے مری بلا

۵۔ تو کسی کلیم سے سبق سیکھ۔ اس لیے کہ یورپ کے داناؤں نے سمندر کا جگر تو چیر لیا لیکن طورِ سینا تک نہیں پہنچ پائے یعنی اگرچہ اہلِ یورپ نے سائنس اور علوم و فنون میں بہت ترقی کی ہے اور کائنات کے عناصر پر تصرف کے علم سے وہ آگاہ ہیں لیکن اپنی اور خدا کی معرفت سے ناآشنا ہیں۔ ایسے علوم و فنون بیکار ہیں تو کسی مردِ حق یا مردِ کامل کو تلاش کر کے اس سے مقصدِ حیات سے متعلق رہنمائی حاصل کر۔

۶۔ عشق نے تڑپنے کا انداز ہمارے دل سے سیکھا ہے۔ یہ ہماری ہی چنگاری ہے جو اچھل کر پروانے تک پہنچی ہے۔ گویا دنیا میں جہاں کہیں بھی عشق کا سوز و درد ہے، وہ ہمارے ہی دل کے جذبوں کے باعث ہے۔

غزل-۲۷

۱۔ عاشق آں نیست کہ لب گرمِ فغانے دارد — عاشق آن است کہ بر کف دو جہانے دارد
۲۔ عاشق آن است کہ تعمیر کند عالمِ خویش — در نسازد بہ جہانے کہ کرانے دارد
۳۔ دلِ بیدار ندادند بہ دانائے فرنگ — ایں قدر ہست کہ چشمِ نگرانے دارد
۴۔ عشق ناپید و خرد می گزدش صورتِ مار — گرچہ در کاسۂ زر لعلِ روانے دارد
۵۔ دُردِ من گیر کہ در میکدہ ہا پیدا نیست — پیر مردے کہ مے تند و جوانے دارد

۱- عاشق وہ نہیں جو ہر وقت فریاد وفغاں کرتا رہے بلکہ عاشق وہ ہے جس کے ہاتھ میں دونوں جہان ہوں۔ گویا حقیقی عاشق دونوں جہانوں سے بے نیاز ہوتا اور ان پر حکمرانی کرتا ہے جبکہ فریاد وفغاں کرنے والا عاشق اس مادی دنیا کے عشق میں مبتلا ہوتا ہے۔

۲- حقیقی عاشق تو وہ ہے جو اپنی دنیا آپ تعمیر کرتا ہے اور ایسی دنیا سے جو محدود ہے' موافقت نہیں کرتا۔ اس کی دنیا لامحدود ہوتی ہے اور وہ کسی صورت میں بھی کسی کا احسان اٹھانا پسند نہیں کرتا۔ علامہ ہی کے بقول:

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی

۳- یورپ کے داناؤں یا اہل علم ودانش کو قدرت کی طرف سے دل بیدار عطا نہیں ہوا۔ ہاں اتنا ہے کہ ان کی آنکھیں دیکھنے والی ہیں یعنی ان کی نگاہیں صرف ظاہر ہی پر رہتی ہیں دل تک نہیں پہنچتیں جبکہ علامہ کے بقول:

دلِ بیدار فاروقی ' دل بیدار کراری
مِس آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری

اور یہ کہ:

دلِ بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جب تک
نہ تیری ضرب ہے کاری نہ میری ضرب ہے کاری

۴- اہل یورپ میں تو عشق کا جذبہ ہی نہیں ہے اور عقل انہیں سانپ کی طرح ڈس رہی ہے' اگرچہ ان کے سونے کے پیالے میں لعلِ رواں یعنی سرخ اور قیمتی شراب ہے۔ مطلب یہ کہ وہ اپنی عقل سے کائنات کے ظاہر کو تو تسخیر کر رہے ہیں لیکن اپنی خودی اور اپنے خدا سے دور ہو رہے ہیں اور دنیاوی عیش وعشرت کے سامان اور مال ودولت سے تو وہ مالا مال ہیں لیکن اپنی معرفت سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

۵- تو مجھ سے میری تلچھٹ لے لے کیونکہ شراب خانوں میں ایسا کوئی پیرمغاں نہیں ہے جس کے پاس تیز اور تازہ شراب ہو۔ قاری سے خطاب ہے۔ مطلب یہ کہ میری شاعری میں خودشناسی اور خداشناسی کا جو پیغام ہے' اس پر توجہ دے کیونکہ ایسا پیغام کسی بھی مغرب ومشرق کے شاعر کے کلام میں نہیں ملے گا۔ یہ پیغام گویا ایسی شراب ہے جو پرانے بزرگوں سے مجھ تک پہنچی ہے' اسے پی جا یعنی اس پیغام پر عمل پیرا ہو جا۔

غزل-۲۸

۱- دریں چمن دلِ مرغاں زماں زماں دگر است | بشاخِ گل دگر است و بآشیاں دگر است

۲- بخود نگر! گلہ ہائے جہاں چہ می گوئی | اگر نگاہِ تو دیگر شود جہاں دگر است

۳- بہ ہر زمانہ اگر چشم تو نکو نگرد | طریق میکدہ و شیوۂ مغاں دگر است

۴- بہ میر قافلہ از من دعا رسان و بگوے | اگرچہ راہ ہمان است کارواں دگر است

۱- اس چمن میں پرندوں کے دل میں ہر لحہ تبدیلی آتی رہتی ہے۔ وہ پھول کی شاخ پر ہوں تو ان کا دل اور انداز کا ہوتا ہے جبکہ آشیانے میں اور انداز کا۔ مطلب یہ کہ اس دنیا میں لوگوں کے دل مختلف ہیں۔ ایک ماحول میں ان کا دل اور طرح کا اور دوسرے ماحول میں دوسری طرح کا ہوتا ہے' اس لیے کہ ان کی ساری توجہ اپنی اغراض پر ہوتی ہے جبکہ مردان مومن یا اہل حق کا دل ایک ہی ڈگر پر رہتا ہے کیونکہ ان کی ساری توجہ اس محبوب حقیقی کی طرف ہوتی ہے۔

۲- تو اپنے آپ کو دیکھ' دنیا کے گلے شکوے کیا کر رہا ہے۔ اگر تیری نگاہ بدل جائے تو تیری دنیا بھی اور ہو جائے گی یعنی خود بینی اور خود شناسی پر توجہ دے۔ اس سے تیری دنیا بھی سنور جائے گی۔

۳- اگر ہر زمانے میں تیری آنکھ صحیح طور پر دیکھے یا مشاہدہ کرے تو تو دیکھے گا کہ ہر زمانے میں میکدہ کا طریقہ اور پیر مغاں کا انداز مختلف رہا ہے یعنی زمانے کے حالات کبھی یکساں نہیں رہتے۔ قدرت ان میں تغیر و تبدل کرتی رہتی ہے۔

۴- میری طرف سے قافلہ سالار کو دعا پہنچا اور اس سے کہہ کہ اگرچہ راستہ تو وہی ہے لیکن قافلہ اور ہے۔ مطلب یہ کہ ہر دور میں راستہ ایک ہی ہوتا ہے لیکن اس پر چلنے والے بدلتے رہتے اور مختلف ہوتے ہیں' اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ زمانے کے حالات اور دیگر تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کو زندگی گذارنے کے صحیح طریقے بتائے جائیں اور یہ کام میر قافلہ یا قومی رہنماؤں کا ہے۔

غزل-۲۹

۱- ما از خدائے گم شدہ ایم او بجستجو ست
چوں ما نیاز مند و گرفتارِ آرزوست

۲- گاہے بہ برگِ لالہ نویسد پیام خویش
گاہے درونِ سینہ مرغاں بہ ہاو ہوست

۳- در نرگس آرمید کہ بیند جمالِ ما
چنداں کرشمہ داں کہ نگاہش بہ گفتگوست

۴- آہے سحر گہے کہ زند در فراقِ ما
بیرون و اندروں، زبر و زیر و چار سوست

۵- ہنگامہ بست از پے دیدار خاکیے
نظارہ را بہانہ تماشائے رنگ و بوست

۶- پنہاں بہ ذرہ ذرہ و نا آشنا ہنوز
پیدا چو ماہتاب و بآغوشِ کاخ و کوست

۷- در خاکدانِ ما گہر زندگی گم است
ایں گوہرے کہ گم شدہ مائیم یا کہ اوست

۱- ہم خدا سے گم ہو چکے ہیں اور وہ ہماری تلاش میں ہے۔ وہ ہماری ہی طرح نیاز مند اور آرزو میں گرفتار ہے۔ عالم ارواح کے حوالے سے بات کی ہے۔ جب انسانی روحیں خدا کے سامنے ہوتی تھیں۔ دنیا میں آ کر ہم اس سے ملنے کے آرزو مند ہیں اور وہ ہم سے ملنے کی آرزو رکھتا ہے۔ دونوں کے باہمی قرب کے لیے ضروری ہے کہ ہم خود کو اس کی ذات میں فنا کر دیں اور اس کا طریقہ ایک مرشد کامل ہی بتا سکتے ہیں۔

۲- کبھی تو وہ لالہ کی پتی پر اپنا پیام لکھتا ہے اور کبھی وہ پرندوں کے سینے میں آہ و فغاں یا شور کر رہا ہے۔ ایک صاحب بصیرت کو ان میں بھی اس خالق ہی کا جلوہ کارفرما نظر آتا ہے۔ بقول سعدی شیرازی:

برگِ درختانِ سبز پیش خداوندِ ہوش
ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

۳- کبھی وہ (خالق) آ کر نرگس کی آنکھ میں آرام سے بیٹھ گیا تا کہ وہ ہمارا جمال دیکھے۔ وہ ناز و ادا سے آگاہ ہے کہ اس کی نگاہیں بھی گفتگو کر رہی ہوتی ہیں۔ نرگس کا پھول آنکھ کی طرح ہوتا ہے۔ دوسرے شعر والی بات نرگس کے حوالے سے۔

۴- صبح سویرے وہ ہمارے فراق میں جو آہ بھرتا/کھینچتا ہے وہ اس کائنات کے باہر اور اندر اور اوپر اور نیچے ہر طرف نکلتی دکھائی دیتی ہے۔ وہی بات کہ ہر شے میں اس کا ظہور ہے اور وہ اپنے شاہکار یعنی نائب و خلیفہ انسان کو دیکھنے کی آرزو رکھتا ہے جس طرح ایک مصور اپنے کسی شاہکار کو بڑے ناز سے دیکھتا ہے۔

۵- اس نے کائنات میں یہ سارا ہنگامہ اس لیے برپا کر رکھا ہے کہ وہ مٹی کے بنے ہوئے انسان کا دیدار کر سکے، ایسے انسان کا جس میں وہ جلوہ گر ہو، عام انسان کا نہیں۔ کائنات کی ہر ہر شے میں وہ گویا انسان کے نظارے کے لیے جلوہ فرما اور چشم کشا ہے۔

۶- وہ ذرے ذرے میں پوشیدہ ہے اور ابھی تک نا آشنا ہے، نظر نہیں آتا۔ وہ چاند کی طرح تو نمایاں اور ظاہر ہے لیکن ساتھ ہی وہ کاخ وکو کی گود میں ہے۔ وہی مطلب کہ وہ ہر ہر شے میں جلوہ گر ہے، جسے انسان اپنی غفلت کے باعث دیکھ نہیں پاتا جبکہ وہ خود اس کے اندر بھی ہے۔

۷- ہمارے جسم میں زندگی کا موتی گم ہے۔ یہ موتی جو گم شدہ ہے کیا وہ ہم ہیں یا کہ وہ (خالق کائنات) ہے۔ مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ اگر انسان خود کو تلاش کر لے یا معرفت حاصل کر لے تو وہ خدا کو پا لے گا اور یوں خود کو پا لے گا۔

غزل-۳۰

(یہ مستزاد کی صورت میں غزل ہے)

۱- خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعل ناب   از جفائے دہ خدایاں کشت دہقاناں خراب

انقلاب!

انقلاب، اے انقلاب

۲- شیخ شہر از رشتۂ تسبیح صد مومن بدام   کافرانِ سادہ دل را برہمن زنار تاب

انقلاب!

انقلاب، اے انقلاب

۳- میر و سلطاں نرد باز و کعبتین شاں دغل   جانِ محکوماں زتن بردند و محکوماں بخواب

انقلاب!

انقلاب ، اے انقلاب

۴- واعظ اندر مسجد و فرزندِ او در مدرسہ   آں بہ پیری کودکے ایں پیر در عہد شباب

انقلاب!

انقلاب ، اے انقلاب

۵- اے مسلماناں فغاں از فتنہ ہاے علم وفن اہرمن اندر جہاں ارزاں ویزداں دیریاب
انقلاب!
انقلاب ' اے انقلاب

۶- شوخیِ باطل نگر! اندر کمین حق نشست شپّر از کوری شبیخو نے زند بر آفتاب
انقلاب!
انقلاب ' اے انقلاب

۷- در کلیسا ابن مریم را بدار آویختند مصطفیٰ از کعبہ ہجرت کردہ با ام الکتاب
انقلاب!
انقلاب ' اے انقلاب

۸- من درونِ شیشہ ہاے عصر حاضر دیدہ ام آں چناں زہرے کہ از وے مارہا در پیچ وتاب
انقلاب!
انقلاب ' اے انقلاب

۹- با ضعیفاں گاہ نیروے پلنگاں می دہند شعلہ ے شاید بروں آید ز فانوسِ حباب
انقلاب
انقلاب ' اے انقلاب

۱- کارخانہ دار/ صنعت کار مزدور کی رگوں کے خون سے خالص لعل بنا رہا ہے جبکہ گاؤں کے زمینداروں کی سختی یا ظلم وستم سے کسانوں کی کھیتی اجڑ گئی ہے۔ گویا مزدور کارخانے میں جو سخت محنت کرتا ہے' اس کا سارا فائدہ کارخانے کا مالک اٹھا رہا ہے۔ اسی طرح محنت کسان کرتے ہیں اور گاؤں کے چودھری عیش وعشرت میں کھوئے رہتے ہیں۔ بدل دو' بدل دو' سب کچھ بدل دو۔

(اس ساری نظم میں علامہ نے اپنے دور کے مختلف غلط قسم کے حالات نیز مذہب کے حوالے سے چند باتیں کی ہیں جو انسانوں کے انسانوں پر ظلم وستم کی عکاسی کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ایسا نظام جلد بدل دینا چاہیے۔)

۲- شہر کے شیخ / مذہبی رہنما کی تسبیح کے دھاگے کی وجہ سے سینکڑوں مومن اس کے جال میں گرفتار ہیں جبکہ سادہ دل کافروں کے لیے برہمن خالص/ پکا جنیو بنا ہوا ہے یعنی ہر مذہب کے پیشوا اپنے عقیدت مندوں کی اس عقیدت کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں

اور انہیں ہر طرح سے خوب لوٹ رہے ہیں۔ انقلاب (بدل دو) سب کچھ بدل دو' اے انقلاب

۳- امیر اور سلطان/ پادشاہ چوسر کھیلنے والے ہیں اور ان کے کھیل کے پانسے دھوکا فریب ہیں۔ انہوں نے محکوموں یا کمزور رعایا کے جسم سے جان نکال رکھی ہے اور محکوم سوئے ہوئے ہیں۔ گویا ان کی یہ حالت کر رکھی ہے کہ وہ اٹھنے کے قابل نہیں رہے کہ اٹھیں اور ان حاکموں کو فنا کر دیں۔ انقلاب' انقلاب' اے انقلاب

۴- واعظ تو خود مسجد میں ہے اور اس کا بیٹا مدرسے میں (جدید تعلیم حاصل کر رہا ہے) وہ (واعظ) تو بڑھاپے میں بچہ اور یہ (بیٹا) جوانی ہی میں بوڑھا ہے۔ گویا واعظ تو دنیا کے حالات سے بے خبر ہے جبکہ اولاد جدید/ انگریزی طرزِ تعلیم کے باعث دین سے ناآشنا ہو گئی ہے۔ انقلاب' انقلاب' اے انقلاب

۵- اے مسلمانو! (جدید طرز کے) علم و فن کے ہاتھوں فریاد ہے کہ ان علوم و فنون کے نتیجے میں شیطان دنیا میں سستا ہو گیا ہے جبکہ خدا مشکل سے ملتا ہے۔ ان علوم و فنون نے لوگوں کو دین سے دور کر دیا ہے' لوگ خدا کو بھول چکے ہیں اور ہر طرف شیطنت پھیلی ہوئی ہے۔ انقلاب' انقلاب' اے انقلاب۔

۶- تو باطل کی شوخی ذرا ملاحظہ کر کہ وہ حق کی گھات میں لگا ہوا ہے' یہ گویا ایسا معاملہ ہے جیسے چمگادڑ جسے دن کو نظر نہیں آتا سورج پر شب خون مار رہی ہے۔ یورپ والوں کے طرز تعلیم اور طرز زندگی نے معاملہ بالکل الٹ کر دیا ہے یعنی کبھی حق' باطل کی گھات میں ہوتا تھا اور اب باطل حق کی گھات میں ہے۔ انقلاب' انقلاب' اے انقلاب۔

۷- گرجے میں عیسائیوں نے ابن مریمؑ یعنی حضرت عیسیٰؑ کو سولی پر لٹکا دیا جبکہ حضرت محمد مصطفیٰؐ قرآن کریم کے ساتھ کعبہ سے ہجرت فرما گئے۔ گویا نہ تو عیسائی اپنے مذہب سے وابستہ رہے اور نہ مسلمانوں ہی کو اپنے مذہب سے کوئی دلچسپی و محبت رہی۔ سبھی جدید دور کی بالخصوص یورپی تہذیب سے بے حد متاثر ہو کر دین و مذہب اور خدا کو بھول گئے۔ انقلاب' انقلاب' اے انقلاب۔

۸- میں نے اس دور/ جدید دور کے پیالوں/ صراحیوں میں کچھ اس قسم کا زہر (زہریلی شراب) دیکھا ہے کہ سانپ بھی اس سے تڑپ رہے ہیں۔ گویا سانپ تو صرف جسم کو ڈستا ہے لیکن روح پھر بھی زندہ رہتی ہے۔ عصر حاضر کی تہذیب و ثقافت کچھ اس قسم کی

زہریلی شراب ہے جو روح ہی کو مار ڈالتی ہے' اسے مردہ کر دیتی ہے۔ اس تہذیب کے ڈسے ہوئے انسان دین و مذہب اور عشق حقیقی کے جذبوں سے خالی/محروم ہو جاتے ہیں۔ انقلاب' انقلاب' اے انقلاب۔

۹۔ لیکن بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ قضا و قدر کے کارکن کمزوروں کو بھی چیتوں کی سی قوت عطا کر دیتے ہیں۔ سو ممکن ہے کہ اب بلبلے کے فانوس (بلبلے کے پانی) سے کوئی شعلہ ظاہر ہو جائے یعنی ایسی صورت حال پیدا ہو جائے کہ جس سے بے طاقتوں کو طاقت اور بے حوصلہ لوگوں کو ایسا حوصلہ عطا ہو جائے جس سے وہ اس انسانیت اور دین دشمنی نظام کو ختم کر کے رکھ دیں اور ایک صحیح انسانی معاشرہ وجود میں لائیں۔ انقلاب' انقلاب' اے انقلاب۔

غزل-۳۱

۱۔ گرچہ می دانم کہ روزے بے نقاب آید بروں — تا نہ پنداری کہ جاں از پیچ و تاب آید بروں

۲۔ ضربتے باید کہ جانِ خفتہ برخیزد ز خاک — نالہ کے بے زخمہ از تارِ رباب آید بروں

۳۔ تاکِ خویش از گریہ ہائے نیم شب سیراب دار — کز درونِ او شعاعِ آفتاب آید بروں

۴۔ ذرہ بے مایہ ای ترسم کہ ناپیدا شوی — پختہ تر کن خویش را تا آفتاب آید بروں

۵۔ در گذر از خاک و خود را پیکر خاکی مگیر — چاک اگر در سینہ ریزی ماہتاب آید بروں

۶۔ گر بروئے تو حریم خویش را در بستہ اند — سر بسنگ آستاں زن لعل ناب آید بروں

۱۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ تو کسی روز بے نقاب آئے گا' پھر بھی تو کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ میری جان (تیرے اس دیدار سے) بیقراری اور اضطراب سے بچ جائے گی۔ گویا عشق نام ہی بیقراری کا ہے جو وصل اور فراق دونوں صورتوں میں برقرار رہتی ہے ورنہ بقول سعدی عاشق و صابر دل گویا پتھر ہے:

دلے کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است
زعشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است

۲۔ کسی ایسی ضرب/چوٹ کی ضرورت ہے جس سے جسم میں سوئی ہوئی روح بیدار ہو جائے' بھلا نالہ/نغمہ رباب کے تار سے مضراب کے بغیر کیونکر باہر آئے گا' نکلے گا۔

دوسرا مصرع پہلے مصرع کی تمثیل ہے۔ مطلب یہ کہ جب تک کسی مردِ حق/ کامل کی تجھ پر نظر نہ ہوگی، اس وقت تک تیرے اندر کے انسان کا بیدار ہونا ممکن نہیں۔

۳۔ تو اپنی انگور کی بیل (اپنے وجود) کو نیم شب کی گریہ وزاری سے سیراب کرتا کہ اس کے اندر سے شراب کی بجائے سورج کی شعاع باہر آئے یعنی آدھی رات کے وقت اس خالق کے حضور گریہ وزاری کرتا کہ تیرے اندر کی پوشیدہ/ مخفی قوتیں اور صلاحیتیں ظاہر ہوں۔

۴۔ تو ایک بے قیمت یا حقیر سا ذرہ ہے، مجھے یہ ڈر ہے کہ تو غائب/ فنا ہو جائے گا تو اپنے آپ کو مضبوط کرتا کہ تجھ سے سورج ظاہر ہو یعنی تو اپنی خودی کو مضبوط کر کہ اس سے تجھے بقا حاصل ہوگی اور تو فنا سے بچ جائے گا۔

۵۔ تو خاک سے گذر جا اور خود کو مٹی کے جسم والا نہ سمجھ۔ اگر تو اپنے سینے میں چاک/ پھاڑ ڈال لے تو اس کے اندر سے چاند نمودار ہوگا۔ گویا اپنی خودی کو بھول جانے کے باعث تو ایک طرح سے مٹی ہے۔ اگر تو اپنی خودی سے آگاہ ہو جائے اور اسے پختہ کر لے تو سراپا نور بن جائے گا اور دوسروں کو بھی روشنی دے گا۔

۶۔ اگر محبوب نے تجھ پر اپنے گھر کا دروازہ بند کر رکھا ہے تو کوئی بات نہیں، فکر نہ کر تو اس کے آستانے/ چوکھٹ کے پتھر پر سر مار، اس سے خالص لعل باہر آئے گا۔ مطلب یہ کہ عشق میں ثابت قدم رہ، اس محبوب کی دہلیز کو کسی صورت بھی نہ چھوڑ۔ تیری اس ثابت قدمی سے ایک نہ ایک دن وہ محبوب ضرور تجھ پر متوجہ ہو جائے گا۔ بقول مصحفیؔ:

تو ملے یا نہ ملے اس سے تو کچھ کام نہیں
ہم کو کوچے سے تیرے روز میاں ہو جانا

نیز مصحفیؔ:

تیرے کوچے ہر بہانے مجھے دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا

غزل-۳۲

۱۔ کشادہ روز خوش و ناخوشِ زمانہ گذر   زگلشن و قفس و دام و آشیانہ گذر

۲- گرفتم ایں کہ غریبی و رہ شناس نہ ای — بکوئے دوست باندازِ محرمانہ گذر
۳- بہر نفس کہ بر آری جہاں دگرگوں کن — دریں رباطِ کہن صورتِ زمانہ گذر
۴- اگر عنانِ تو جبریل و حور می گیرند — کرشمہ بر دل شاں ریز و دلبرانہ گذر

۱- تو زمانے کے اچھے یا برے سے خوشی خوشی گذر جا، گلشن سے، پنجرے سے، جال اور آشیانے سے گذر جا یعنی انسانی زندگی کو ہر طرح کے حالات پیش آتے ہیں، اچھی زندگی گذارنے کے لیے ضروری ہے کہ ان سے بے فکر اور بے نیاز ہو جاؤ۔ دوسرا مصرع تمثیل کا ہے۔

۲- میں یہ مانتا ہوں کہ تو ایک اجنبی/ مسافر ہے اور تجھے راستے کا علم یا راستے کی پہچان نہیں ہے۔ پھر بھی تو محبوب کے کوچے سے اس طرح گذر جیسے تو اسے پوری طرح جانتا ہے۔ یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ محبوب سے وابستگی کے لیے خلوص دل کی ضرورت ہے۔

۳- تو جو بھی سانس باہر نکالے اس سے دنیا کو الٹ پلٹ کر دے۔ اس میں انقلاب پیدا کر دے۔ اس پرانی سرائے یعنی دنیا میں زمانے کی طرح گذر۔ مطلب یہ کہ زمانہ ہر لمحے کوئی نہ کوئی تبدیلی پیدا کرتا رہتا ہے، تو بھی اپنے جہد وعمل سے زندگی میں نت نئے انقلاب لا۔

۴- اگر جبرئیل اور حور بھی تیری لگام پکڑیں، پھر بھی تو ان کی طرف توجہ نہ کر اور ان کے دل پر اپنے ناز و ادا کی جھلک ڈال کر محبوبوں کی سی شان کے ساتھ گذر جا۔ یعنی تیرے عظیم مقصد و آرزو کے راستے میں کتنے ہی دلکش و حسین مرحلے آئیں جو تیرے آگے بڑھنے میں رکاوٹ بنیں تو ان پر توجہ نہ کر اور بے نیازانہ انداز میں منزل کی طرف گامزن رہ۔

غزل-۳۳

۱- زندگی در صدفِ خویش گہر ساختن است — در دلِ شعلہ فرو رفتن و نگداختن است
۲- عشق ازیں گنبدِ در بستہ بروں تاختن است — شیشۂ ماہ ز طاقِ فلک انداختن است
۳- سلطنت نقدِ دل و دیں زکف انداختن است — بہ یکے داو جہاں بردن و جاں باختن است
۴- حکمت و فلسفہ راہمتے مردے باید — تیغ اندیشہ بروئے دو جہاں آختن است

۵- مذہب زندہ دلاں خواب پریشانے نیست　　　از ہمیں خاک جہانِ دگرے ساختن است

۱- زندگی ایک طرح سے اپنی سیپی میں موتی بنانا ہے اور شعلے کے اندر اتر جانا اور نہ پگھلنا ہے یعنی اپنے جسم میں دل بیدار پیدا کرنا ہے جس سے اپنی خودی کی آگاہی حاصل ہوتی ہے اور یوں زندگی ایک حقیقی اور بامقصد زندگی بنتی ہے اور عشق کی آگ میں داخل ہو کر مٹی کے اس جسم کو سونا بنانا ہے۔

۲- عشق ایک طرح سے اس بند دروازے والے گنبد یعنی آسمان سے باہر نکل جانا اور چاند کے پیالے کو آسمان کے طاق سے نیچے پھینک دینا ہے۔ مطلب یہ کہ عشق کی بدولت انسان زمان و مکاں پر حاوی ہو جاتا ہے اور آسمان کے اس پار تک اس کی رسائی ہو جاتی ہے۔ بقول ابو طالب کلیم:

کشتۂ عشق شو اے دل کہ زخس خوار تر است
ہر کہ زیں بحر سلامت بکنار افتادہ

۳- سلطنت گویا دل اور دین کی نقدی/ دولت کو ہاتھ سے پھینک دینے کا عمل ہے اور ایک ہی داؤ میں دنیا کو جیت لینا اور جان کو ہار دینا ہے۔ بادشاہت/ حکومت میں دولت دنیا اور دنیا کی آسائشیں وغیرہ ضرور میسر آتی ہیں لیکن دین اور انسانیت سے وابستگی ختم ہو جاتی ہے، روح مردہ ہو جاتی ہے۔

۴- حکمت اور فلسفہ کے لیے ایک دلیر اور قوی انسان کی سی ہمت چاہیے اور یہ گویا فکر و خیال کی تلوار کو دونوں جہانوں پر کھینچنا ہے یعنی فلسفی اور حکیم کو اپنی رائے منوانے اور مخالف رائے کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمت و حوصلہ سے کام لینا پڑتا ہے۔ اس لیے کہ فلسفہ دونوں جہانوں کو عقل کی کسوٹی پر جانچتا ہے۔ گویا اس عمل میں بڑے بڑے فکری مرحلے آتے ہیں جنہیں سر کرنے کے لیے مخالف قوتوں سے اسی طرح لڑنا پڑتا ہے جس طرح ایک تلوار چلانے والا دشمن سے الجھتا اور لڑتا ہے۔

۵- زندہ دلوں کا مذہب کوئی خوابِ پریشاں نہیں ہے بلکہ یہ تو اسی مٹی سے ایک اور/ نیا جہان تعمیر کرنا ہے یعنی وہ اس دنیا میں رہتے ہوئے اپنے جوش و جذبہ سے اپنے لیے ایک ایسا ماحول پیدا کرتے ہیں جو صرف ان کی اپنی آرزو کے مطابق ہو۔

غزل-۳۴

۱-	بروں زیں گنبد در بستہ پیدا کردہ ام راہے	کہ از اندیشہ برتر می پرد آہِ سحر گاہے
۲-	توائے شاہیں نشیمن در چمن کردی ازاں ترسم	ہوائے او ببال تو دہد پروازِ کوتاہے
۳-	غبارے گشتہ ای؟ آسودہ نتواں زیستن ایں جا	بہ بادِ صبح دم در پیچ و منشین برسرِ راہے
۴-	ز جوئے کہکشاں بگذر، زنیل آسماں بگذر	ز منزل دل بمیر دگرچہ باشد منزل ماہے
۵-	اگر زاں برقِ بے پروا درونِ او تہی گردد	بچشم کوہ سینا می نیرزد با پر کاہے
۶-	چساں آداب محفل رانگہ دارند و می سوزند	مپرس از ما شہیدانِ نگاہِ برسرِ راہے
۷-	پس از من شعر من خوانند و دریا بند و می گویند	جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

۱- میں نے اس آسمان میں ایک راستہ پیدا کر لیا ہے، اس لیے کہ میری صبح سویرے کی آہ میرے فکر و خیال سے بھی زیادہ اونچا اڑے والی ہے۔ آہ عشق حقیقی کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ ایک عاشق اس کائنات کو تسخیر کر سکتا ہے اور اس سے اپنی خواہش کے مطابق کام لے سکتا ہے۔

۲- اے شاہین! تو نے چمن میں اپنا آشیانہ بنا لیا ہے اور مجھے تیرے اس عمل کی بنا پر یہ خدشہ ہے کہ چمن کی فضا تیرے پروں کو نیچے اڑنے یا کم بلندی پر اڑنے والے بنا دے گی۔ شاہین علامت ہے بلند پروازی اور سخت کوشی کی۔ علامہ نے اس حوالے سے مسلمان سے کہا ہے کہ تو تو شاہین ہے لیکن تو نے بلند پروازی اور سخت کوشی چھوڑ کر سستی و کاہلی اور آرام طلبی کو اپنا لیا ہے جس سے تو دوسری قوموں کا شکار/محکوم ہو جائے گا۔ شاہین اپنی بلند پروازی کے باعث کسی شکاری کے جال میں نہیں پھنستا جبکہ چمن کے پرندے جال میں آسانی سے پھنس جاتے ہیں۔

۳- کیا تو غبار بن گیا ہے؟ یہاں (اس دنیا میں) آرام کی زندگی بسر نہیں کی جا سکتی تو صبح کی ہوا سے لپٹ جا اور راستے میں نہ بیٹھ۔ گویا اگر تیری یہ خواہش ہے کہ تو مٹی سے سونا بن جائے تو جہد و عمل کی راہ پر گامزن ہو جا اور ایک عظیم مقصد و آرزو پیدا کر کے اس کے حصول میں سرگرم ہو جا۔

۴- تو کہکشاں کی ندی سے گذر جا اور آسمان کے نیل یعنی دریا سے بھی گذر جا، اس لیے کہ منزل (پر پہنچنے) سے دل مر جاتا ہے۔ اگرچہ منزل آسمان کی منزل ہی کیوں نہ ہو۔

مطلب یہ کہ منزل ایک طرح سے آرام طلبی کا نام ہے جس سے زندگی محض ایک چلتی پھرتی لاش رہ جاتی ہے جبکہ حقیقی زندگی حرکت و عمل اور نت نئی منزل کی تلاش میں رواں دواں رہنے کا نام ہے۔

۵- اگر اس بے نیاز بجلی سے طور سینا کا اندر خالی ہو جائے تو میری نگاہوں میں اس (سینا) کی قیمت ایک تنکے کے برابر بھی نہ رہے۔ کوہ طور پر حضرت موسیٰؑ کے عرض کرنے پر اللہ تعالیٰ نے اپنے جلوے کی بجلی طور پر پھینکی تھی جس کی وجہ سے سینا کی وادی کی بڑی قدر و قیمت ہے' بصورت دیگر وہ ایک عام وادی ہوتی۔

۶- میں تجھے کیا بتاؤں یا تو یہ مت پوچھ کہ ہم راہ چلتے شہیدانِ نگاہ محفل کے آداب کو کس طرح پیش نظر رکھتے اور چلتے ہیں یعنی یہ بات بیان نہیں کی جا سکتی کہ اس کا تعلق احساس و جذبہ سے ہے' وہی جان سکتے ہیں جو اس کیفیت سے خود گذرے ہوں۔

۷- میرے مرنے کے بعد لوگ میرے شعر پڑھیں گے' انہیں سمجھیں گے اور کہیں گے کہ ایک خود آگاہ مرد نے ایک دنیا کو تہ و بالا کر دیا ہے۔ مطلب یہ کہ میں نے اپنی شاعری سے لوگوں کے دلوں میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے' ان میں جوش و جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔

غزل-۳۵

۱- گنہ گارِ غیورم مزدِ بے خدمت نمی گیرم
ازاں داغم کہ بر تقدیر او بستند تقصیرم

۲- زفیض عشق و مستی بردہ ام اندیشہ را آنجا
کہ از دنبالہ چشم مہر عالمتاب می گیرم

۳- من از صبح نخستیں نقشبند موج و گردابم
چو بحر آسودہ می گردد ز طوفاں چارہ بر گیرم

۴- جہاں را پیش ازیں صد بار آتش زیر پا کردم
سکون و عافیت را پاک می سوزد بم و زیرم

۵- ازاں پیش بتاں رقصیدم و زنار بر بستم
کہ شیخ شہر مردِ با خدا گردد ز تکفیرم

۶- زمانے رم کنند از من زمانے با من آمیزند
دریں صحرا نمی دانند صیادم کہ نخچیرم

۷- دل بے سوز کم گیرد نصیب از صحبت مردے
مس تابیدہ ے آور کہ گیرد در تو اکسیرم

۱- میں ایک غیرت مند گنہگار ہوں' کسی خدمت یا کام کے بغیر اجرت نہیں لیتا۔ میرے سینے میں تو اس بات کا داغ ہے کہ قضا و قدر نے اس کی (یعنی ابلیس کی) تقدیر سے میری تقصیر وابستہ کر دی (اس کے نام جڑ دی ہے) گویا میں عبادت و اطاعت کے بغیر

جنت کا دعویدار نہیں بننا چاہتا۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ہم انسان جو بھی گناہ کرتے ہیں اس کا ذمہ دار ابلیس کو ٹھہرایا جاتا ہے اور خود کو بے گناہ قرار دے کر جنت کے حقدار سمجھنے لگتے ہیں۔

۲- عشق و مستی کے فیض سے میں اپنی فکر/ عقل کو اس جگہ تک لے گیا ہوں کہ جہاں سے میں دنیا کو روشن کرنے والے سورج کی آنکھ کو پیچھے سے پکڑ لیتا ہوں یا بند کر دیتا ہوں۔ مطلب یہ کہ عشق کی بدولت انسانی عقل کو ایسی قوت حاصل ہو جاتی ہے جس سے وہ نہ صرف روشن ہو جاتی ہے بلکہ سورج کی روشنی بھی اس کے آگے ماند پڑ جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں عشق کے فیض سے عقل جو کچھ دیکھ سکتی ہے، سورج کی آنکھ بھی اس کے دیکھنے سے قاصر ہے۔

۳- میں پہلی صبح ہی سے (روز پیدائش ہی سے) موج اور بھنور کے نقوش بنا رہا ہوں۔ جب کسی وقت سمندر میں سکون ہوتا ہے تو میں طوفان سے اس کا چارہ/ علاج کر لیتا ہوں۔ گویا انسانی وجود روزِ آفرینش ہی سے کائنات میں ہنگاموں کا باعث بن رہا ہے اور جب کبھی زندگی سکون و آسائش کی طرف مائل ہونے لگتی ہے تو عشق اسے مائل نہیں ہونے دیتا۔ گویا عشق روزِ ازل ہی سے کائنات میں برسرِ عمل ہے اور کائنات اور انسانی زندگی کی تمام رعنائی و رونق اسی کے فیض سے ہے۔ دوسرے لفظوں میں اگر عشق نہ ہوتا تو اس کائنات کا وجود ایک بیکار قسم کا وجود ہوتا اور انسانی زندگی بھی محض مٹی کے مادھو کی سی ہوتی۔

۴- اس سے پہلے میں نے جہان کو سینکڑوں مرتبہ بیقرار و مضطرب کیا ہے۔ میرے اونچے نیچے سر یا عشق کا اتار چڑھاؤ سکون و عافیت کو مکمل طور پر جلا ڈالتا ہے۔ پہلے شعر کے حوالے سے انسانی خصوصیتِ عشق کی بات کرتے ہوئے انسان ہی کی زبان سے یہ کچھ کہا ہے۔ مطلب یہ کہ عشق کے ہوتے ہوئے سکون و عافیت کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔

۵- میں بتوں کے آگے اس لیے ناچا، میں نے رقص کیا اور گلے میں زنار پہن لی تاکہ مجھے کافر قرار دینے یا میرے اس کافرانہ انداز سے شیخ شہر (صحیح معنوں میں) ایک باخدا انسان بن جائے۔ مجھ پر کفر کا فتویٰ لگانے والا مذہبی رہنما خود تو اپنی عبادت و زہد کے تکبر کا شکار ہے جو خود ایک بڑا شرک ہے۔ میں نے یہ انداز اس لیے اختیار کیا کہ شاید اس سے اس کے دل میں خدا کا خوف پیدا ہو جائے اور وہ تکبر و غرور سے توبہ کر کے

ایک سچا مسلمان بن جائے اور دوسروں پر یونہی فتوے لگانے سے بچے۔

۶۔ کسی وقت تو لوگ مجھ سے دور بھاگتے ہیں اور کسی وقت مجھ سے آملتے ہیں، مجھ سے میل ملاپ کرتے ہیں۔ انہیں یہ علم نہیں اس صحرا (دنیا) میں میں شکاری ہوں یا خود شکار ہوں یعنی لوگ ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکے کہ میں ان کا خیر خواہ ہوں یا بدخواہ۔ میری شاعری عام شاعری کی طرح محض تفریح خاطر کے لیے ہے یا اس میں دیا گیا پیغام جہد وعمل ان کی تقدیر سنوارنے کا باعث بن سکتا ہے۔

۷۔ جس دل میں کوئی سوز نہ ہو، وہ یعنی ایسے دل والا انسان کسی مردِ حق کی صحبت سے بہرہ ور نہیں ہوتا۔ تو چمکدار پیتل لا کہ اس پر میری اکسیر اثر کرے۔ مطلب یہ کہ میری شاعری کو سمجھ اور اس کا اثر لے کر راہ عمل اختیار کر جس سے تیری زندگی گویا سونا بن جائے گی۔

غزل-۳۶

۱۔ جہاں کوراست واز آئینہ دل غافل افتاداست — ولے چشمے کہ بینا شد نگاہش بر دل افتاداست

۲۔ شب تاریک و راہِ پیچ پیچ و بے یقیں راہی — دلیل کارواں را مشکل اندر مشکل افتاداست

۳۔ رقیب خام سوداست و عاشق مست و قاصد مست — کہ حرفِ دل براں دارائے چندیں محمل افتاداست

۴۔ یقین مومنے دارد گمانِ کافرے دارد — چہ تدبیرائے مسلماناں کہ کارم با دل افتاداست

۵۔ گہے باشد کہ کارِ ناخدائی می کند طوفاں — کہ از طغیانِ موجے کشتیم بر ساحل افتاداست

۶۔ نمی دانم کہ داد ایں چشم بینا موجِ دریا را — گہر در سینۂ دریا خزف بر ساحل افتاداست

۷۔ نصیبے نیست از سوزِ درونم، مرز و بومم را — زدم اکسیر را بر خاک صحرا، باطل افتاداست

۸۔ اگر در دل جہانے تازہ ے داری بروں آور — کہ افرنگ از جراحت ہائے پنہاں بسمل افتاداست

۱۔ جہان نابینا ہے اور دل کے آئینے سے غافل واقع ہوا ہے لیکن جو آنکھ بینا ہو گئی اس کی نگاہ دل پر پڑ گئی ہے۔ دل گویا ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ساری باہر کی دنیا کا عکس پڑتا ہے لیکن اہل دنیا اس عظیم آئینے کو محض گوشت کا ایک لوتھڑا سمجھتے ہیں اور اسے کوئی اہمیت نہیں دیتے حالانکہ:

دل کے آئینے میں ہے تصویر یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

یعنی دل پر ہی اس محبوب حقیقی کی جلوہ گری ہو سکتی ہے، تاہم جس انسان کو کسی مردِ حق کی صحبت میسر آ گئی، اس کی چشم باطن بینا ہو کر دل کی قدر و قیمت اور اہمیت سے آگاہ ہو گئی۔

۲- اندھیری رات ہے اور راستے میں بڑے موڑ/ بل ہیں اور راہ گیر بے یقینی کا شکار ہے جس کے نتیجے میں قافلہ سالار کے لیے مشکل کے بعد مشکل یعنی مسلسل مشکلیں ہیں۔ آج کا مسلمان صحیح راستے پر نہیں چل رہا۔ پھر یقین کی دولت سے بھی محروم ہے، اس صورت میں رہنما اسے کیونکر زندگی کے پر پیچ راستوں سے گذار کر منزل تک پہنچا سکتا ہے۔ مذکورہ صورتحال نے اس کے لیے مشکلیں پیدا کر رکھی ہیں۔

۳- ناقص عشق والا رقیب مست ہے، عاشق مست اور قاصد مست ہے کیونکہ محبوبوں کی تحریر/ بات اپنی اونٹنی پر کجاوے رکھنے والی واقع ہوئی ہے۔ گویا یہ تحریر ایسی پہلو دار ہے کہ ہر کوئی اسے اپنے حسب حال سمجھ کر مست ہو رہا ہے۔ یہ مطلب بنتا ہے کہ اس محبوب حقیقی سے ہر کسی نے اپنے اپنے انداز میں وابستگی پیدا کر رکھی ہے۔

۴- میرا دل کبھی تو مومنوں کے سے یقین کا حامل ہوتا ہے اور کبھی کافر کی سی بے یقینی اس میں آ جاتی ہے۔ اے مسلمانو! مجھے بتاؤ کہ میں اس کا کیا چارہ کار کروں کہ مجھے اس دل سے پالا پڑ گیا ہے۔ اس دور کے علوم و فنون اور تہذیب و ثقافت کے نتیجے میں میں پورے طور پر یقین کی حالت میں نہیں رہتا۔ اے یقین کی دولت سے مالا مال مردانِ حق مجھے میرے اس دل کا کوئی چارہ بتاؤ تا کہ میں مسلک حق پر چل کر اپنے دل کی یہ حالت بدل سکوں۔

۵- کبھی ایسا ہوتا ہے کہ طوفان بھی ملاحی یا ملاح والا کام کرتا یعنی کشتی کنارے پر پہنچا دیتا ہے، چنانچہ موجوں کے طغیان سے میری کشتی ساحل پر آ لگی ہے۔ مطلب یہ کہ بعض مرتبہ انسان کی زندگی میں ایسے مصائب و حادثات آتے ہیں جو ہوتے تو اذیت ناک ہیں لیکن انسان ان سے عبرت پکڑ کر راہِ راست پر چلنے لگتا ہے۔

۶- مجھے نہیں معلوم کہ موج دریا کو دیکھنے والی آنکھ (یا دو چیزوں میں فرق کرنے والی آنکھ) کس نے عطا کی ہے کہ وہ موتی تو سمندر کے سینے میں یعنی تہ میں رکھتی ہے جبکہ ٹھیکری کو ساحل پر پھینک دیتی ہے۔ گویا کائنات کی ہر ہر شے کسی ان دیکھی ہستی کے فرمان کے مطابق کام کرتی ہے، اس کا تعلق خواہ عالم نباتات سے ہو یا عالم جمادات و حیوانات سے۔

۷- میرے دل میں جو سوزِ عشق ہے اس سے میرے اہل وطن نے کوئی حصہ حاصل نہیں کیا یعنی میری شاعری میں دیئے گئے پیغام سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ گویا میں نے صحرا کی خاک پر اکسیر لگائی جو بیکار ثابت ہوئی۔ ان میں وہ جذبہ ہی نہیں ورنہ وہ اس سے استفادہ کر کے اپنی عظمت و سربلندی کا سامان کر لیتے۔

۸- اگر تیرے دل میں کوئی نئی دنیا ہے تو اسے باہر نکال' اس لیے کہ اہل یورپ زخموں کا علاج کرتے کرتے خود زخمی ہو گئے ہیں یعنی تو (مسلمان) کوئی ایسا چارہ کر جس سے عہد حاضر کے انسانوں کے زخموں کا جو شیطان کے زخم خوردہ ہیں' کوئی علاج ہو سکے۔ یورپی علوم وفنون وغیرہ کے فساد بگاڑ کی طرف اشارہ ہے۔ اس بگاڑ کو صرف مردانِ مومن ہی ختم کر کے دنیا کو اس سے نجات دلا سکتے ہیں۔

غزل-۳۷

۱-	نہ یابی در جہاں یارے کہ داند دل نوازی را	بخود گم شو نگہ دار آبروئے عشق بازی را
۲-	من از کار آفریں داغم کہ با ایں ذوقِ پیدائی	زما پوشیدہ دارد شیوہ ہائے کارسازی را
۳-	کسے ایں معنی نازک نداند جز ایاز ایں جا	کہ مہر غزنوی افزوں کند دردِ ایازی را
۴-	من آں علم وفراست با پرکاہے نمی گیرم	کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مردِ غازی را
۵-	بہر نرخے کہ ایں کالا بگیری سود مند افتد	بزورِ بازوئے حیدرؓ بدہ ادراک رازی را
۶-	اگر یک قطرہ خوں داری' اگر مشت پرے داری	بیا من باتو آموزم طریق شاہبازی را
۷-	اگر ایں کار را کارِ نفس دانی چہ نادانی	دم شمشیر اندر سینہ باید نے نوازی را

۱- تجھے دنیا میں ایسا کوئی یار/محبوب نہیں ملے گا جسے دل نوازی کا انداز معلوم ہو' لہٰذا تو اپنے آپ میں کھو جا اور عشق بازی کی آبرو رکھ لے/کی حفاظت کر۔ اپنی معرفت ہی سے انسان میں ایسی خودداری پیدا ہو سکتی ہے جس سے اسے کسی اور کی طرف دیکھنے یا اس سے دل لگانے کی ضرورت نہیں رہتی۔

۲- مجھے خالقِ کائنات سے اس بات کا داغ ہے کہ وہ اپنے اس ذوقِ نمود/ظہور کے باوجود ہم سے اپنی کارسازی کے طور طریقوں کو پوشیدہ رکھتا ہے یعنی اگرچہ کائنات کی ہر شے میں اس کا ظہور و جلوہ ہے لیکن اس کائنات کا نظام وہ کس طرح چلاتا ہے' اس

سے متعلق وہ ہمیں کچھ نہیں بتاتا۔ ''ذوق پیدائی'' قرآنی آیت کے حوالے سے ہے۔ ارشادِ ربانی ہے کہ میں نے چاہا کہ میں خود کو دیکھوں' میں نے یہ کائنات پیدا کر دی۔

۳- یہاں ایاز کے سوا کوئی اس معنی نازک کو نہیں جانتا کہ غزنوی کی محبت ایاز کے درد میں اضافہ کر دیتی ہے۔ ایاز' سلطان محمود کا زرخرید غلام تھا جس سے محمود غزنوی کو بہت محبت تھی۔ علامہ نے اسی حوالے سے یہ کہنا چاہا ہے کہ وہ ذاتِ اقدس جس قدر اپنے کسی بندے کے قریب ہو جاتی ہے اتنی ہی اس کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔

۴- میں ایسے علم و فراست کو گھاس کے ایک تنکے کے عوض بھی لینے کو تیار نہیں ہوں جو مرد غازی کو تلوار اور ڈھال سے بیگانہ کر دے۔ مرد مومن کی شان یہی ہے کہ علامہ کے بقول (یہ ایک قرآنی آیت کا ترجمہ ہے)

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

تو جب کوئی علم غازی یا مومن کو اس رزم ہی کے لائق نہ رکھے گا تو وہ ایک بیکار قسم کا اور بے قدر و قیمت علم ہوگا۔

۵- تو جس قیمت پر بھی یہ سودا خریدے تیرے لیے فائدہ مند ثابت ہوگا (وہ سودا یہ ہے کہ) تو حضرت علیؓ کے زورِ بازو کے بدلے میں رازیؒ کی عقل و خرد دے ڈال۔ مطلب یہ کہ جس علم و حکمت سے ایک بندۂ مومن جہاد سے بیگانہ ہو جائے' اسے اہمیت و قدر نہ دی جائے۔

۶- اگر تجھ میں خون کا ایک قطرہ ہے اور تیرے چند پر بھی ہیں تو آ میں تجھے شاہبازی کا طریقہ بتا دوں یعنی اگر تیرے دل میں ذرا سا بھی جذبہ موجود ہے یا تجھ میں ذرا سی بھی زندہ دلی ہے تو میں تجھ کو بتایا ہوں کہ دنیا میں عظمت و سربلندی اور حکمرانی کا حصول کیونکر ممکن ہے۔ وہ طریقہ یہی ہے کہ تو جذبہ و شوق سے سرشار ہو اور جہد و عمل تیرا شعار ہو۔ تیرے پیش نظر ایک عظیم مقصد ہو۔

۷- اگر تو اس کام کو سانس کا کام سمجھتا ہے تو تو کیسا نادان ہے۔ نے نواز کے سینے میں تو عام سانس کی بجائے دم شمشیر کی ضرورت ہے۔ بانسری بجانے کے لیے صرف سانس پھونکنا ہی کافی نہیں اس کے لیے سینے کے اندر قوت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح اپنے کسی عظیم مقصد کے حصول کے لیے سرفروشی کی آرزو ہی کافی نہیں بلکہ اس

کے لیے عملی طور پر سر بکف ہونا بھی ضروری ہے۔

غزل-۳۸

۱- علمے کہ تو آموزی مشتاق نگاہے نیست	واماندۂ راہے ہست آوارۂ راہے نیست
۲- آدم کہ ضمیر او نقش دو جہاں ریزد	باللذت آہے ہست بے لذت آہے نیست
۳- ہر چند کہ عشق او آوارۂ راہے کرد	داغے کہ جگر سوز د در سینۂ ماہے نیست
۴- من چشم نہ بردارم از روئے نگارینش	آں مست تغافل را توفیق نگاہے نیست
۵- اقبال قبا پوشد در کارِ جہاں کوشد	دریاب کہ درویشی با دلق و کلاہے نیست

۱- جو علم تو حاصل کر رہا ہے وہ نگاہ کا مشتاق نہیں ہے' وہ راستے ہی میں تھک ہار کر بیٹھ جانے والا تو ہے لیکن راستہ مسلسل طے کرنے والا نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ اس علم کی تمام تر توجہ مادیت کی طرف یا تن پروری کی طرف ہے اور بصیرت سے عاری کر دینے والا ہے۔ ایسے علم سے اپنی اور خدا کی معرفت ممکن نہیں ہے۔

۲- وہ انسان جس کا ضمیر دو جہانوں کی نقش کشی کرتا ہے' اس کا یہ عمل آہ کی لذت سے ہے' آہ کی لذت کے بغیر نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ انسان ہی کی بدولت دونوں جہانوں کی رونقیں ہیں اور یہ رونقیں اسی صورت میں ممکن ہیں جب وہ عشق کے سوز و جذبہ سے سرشار ہو۔

۳- اگرچہ اس (محبوب حقیقی) کے عشق نے اسے (چاند کو) راستے میں آوارہ کر رکھا ہے لیکن ایسا داغ جو جگر کو جلا دے' چاند کے سینے میں نہیں ہے۔ صنعت حسن تعلیل سے کام لیا ہے۔ چاند آسمان پر چلتا ہے۔ اس کا یہ چلنا گویا محبوب حقیقی کی تلاش میں ہے لیکن چونکہ وہ سوز عشق سے خالی ہے' اس لیے بس چلتا ہی رہتا ہے تا آنکہ غروب ہو جاتا ہے۔ اس سوز سے تو انسان سرشار ہو کر اس تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔

۴- میں اس محبوب کے حسین و دل کش چہرے سے آنکھ نہیں اٹھاتا۔ اس تغافل میں مست محبوب کو اپنے عشاق پر ایک نگاہ کی بھی توفیق یا فرصت نہیں ہے یعنی وہ اپنے عشاق سے بے توجہ اور بے پروا رہتا ہے۔

۵- اقبال پہنتا تو قبا ہے لیکن دنیا کے کاموں میں لگا رہتا ہے' یہ جان لے کہ درویشی بوریا

نشینی اور درویشی ٹوپی پہننے سے نہیں آتی، یعنی ظاہری لباس سے حقیقی درویشی کا کوئی تعلق نہیں، اس کے لیے روحانی جذبوں کی ضرورت ہے اور مادہ پرستی سے دور رہنا ہے۔

غزل-۳۹

۱- چو خورشید سحر پیدا نگاہے می تواں کردن | ہمیں خاک سیہ را جلوہ گاہے می تواں کردن

۲- نگاہِ خویش را از نوکِ سوزن تیز تر گرداں | چو جوہر در دل آئینہ راہے می تواں کردن

۳- دریں گلشن کہ بر مرغِ چمن راہِ فغاں تنگ است | باندازِ کشودِ غنچہ آہے می تواں کردن

۴- نہ ایں عالم حجاب او را نہ آں عالم نقاب او را | اگر تاب نظر داری نگاہے می تواں کردن

۵- "تو در زیر درختاں ہمچو طفلاں آشیاں بینی" | بہ پرواز آ کہ صید مہر و ماہے می تواں کردن

۱- صبح کے سورج کی مانند (خاص) نگاہ پیدا کی جا سکتی ہے۔ اسی سیاہ خاک کو ایک جلوہ گاہ بنایا جا سکتا ہے۔ صبح سورج طلوع ہوتا ہے تو وہ اپنی روشنی سے دنیا کو روشن کر دیتا ہے۔ اسی طرح جو انسان سوز و جذبہ عشق کی بدولت چشم حق بیں پیدا کر لیتا ہے، وہ بھی پوری مخلوق یا دنیا کو منور کر دیتا ہے۔

۲- تو اپنی نگاہ کو سوئی کی نوک سے بھی زیادہ تیز کر یا بنا کیونکہ جوہر کی طرح آئینے کے دل میں راہ پیدا کی جا سکتی ہے۔ گویا جس طرح آئینے کی چمک اس کا ایک حصہ ہے، اسی طرح تو اپنی خودی میں ایسی کیفیت و قوت پیدا کر کہ وہ اس ذات کی انائے مطلق یا خودی میں محو ہو جائے۔

۳- اس گلشن میں جہاں چمن کے پرندے پر آہ و فغاں کا راستہ بند ہے، کلی کے کھلنے کے انداز میں ایک آہ کھینچی جا سکتی ہے۔ گویا پرندے پر پابندی ہے کہ وہ فریاد نہیں کر سکتا۔ (آگے فریاد کا طریقہ بتایا ہے) کلی گویا آہ کھینچ کر پھول کی صورت اختیار کر لیتی ہے، اس کھلنے میں کوئی آواز نہیں ہوتی۔ اسی طرح تجھ کو اگر مجبوریوں میں جکڑا گیا ہے تو تو بھی کلی کی طرح خاموشی سے یا دل میں ظلم کے خلاف فریاد اور احتجاج کرتا رہ، ایک دن آئے گا کہ تجھے اس خاموش احتجاج کا اچھا نتیجہ ملے گا۔

۴- نہ تو یہ دنیا ہی اس کے لیے حجاب ہے اور نہ وہ دنیا ہی اس کا نقاب ہے۔ اگر تجھ میں نگاہ کی طاقت ہے تو اس پر نظر کی جا سکتی ہے۔ محبوب حقیقی کا جلوہ کائنات کی ہر ہر شے

میں نمایاں ہے جسے دیکھنے کے لیے بڑی بصیرت اور جذبہ عشق کی ضرورت ہے۔
بقول سعدی:

برگ درختانِ سبز پیش خداوند ہوش
ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

۵- تو بچوں کی طرح درختوں کے نیچے آشیانہ دیکھ رہا ہے تو پرواز کر کہ سورج اور چاند کو شکار کیا جا سکتا ہے۔ تو معمولی معمولی خواہشوں میں پڑا ہوا ہے، جہد و عمل سے کام لے اور یوں عظمت و بلندی حاصل کر کے تو کائنات کی تسخیر کر سکتا ہے۔

غزل-۴۰

۱- کشیدی بادہ ہا در صحبت بیگانہ پے در پے	بنورِ دیگراں افروختی پیمانہ پے در پے
۲- ز دست ساقی خاور دو جام ارغواں درکش	کہ از خاک تو خیزد نالہ مستانہ پے در پے
۳- دلے کو از تب و تاب تمنا آشنا گردد	زند بر شعلہ خود را صورتِ پروانہ پے در پے
۴- ز اشک صبح گاہی زندگی را برگ و ساز آور	شود کشت تو ویراں تانہ ریزی دانہ پے در پے
۵- بگرداں جام و از ہنگامہ افرنگ کمتر گوے	ہزاراں کارواں بگذشت ازیں ویرانہ پے در پے

۱- (مسلمان سے خطاب ہے) تو نے غیروں کی صحبت میں بیٹھ کر لگاتار شراب کشی کی ہے اور یوں تو نے دوسروں کی روشنی سے اپنے پیمانے کو متواتر منور کیے رکھا ہے یعنی تو نے ان قوموں کے افکار کو اپنایا ہے جو اسلام کی مخالف ہیں، تو ان سے تعلق توڑ اور اپنی اصل کی طرف لوٹ۔

۲- تو مشرق کے ساقی کے ہاتھ سے سرخ شراب کے دو جام پی تا کہ تیری خاک (جسم) سے متواتر نالۂ مستانہ بلند ہوتا رہے۔ مطلب یہ کہ یورپی افکار اور علم سے تو کچھ اس قدر متاثر ہو چکا ہے کہ تجھ میں مسلمانوں والے جذبے نہیں رہے، لہٰذا تو اپنے مشرقی یعنی اسلامی علوم و فنون اور افکار کی طرف توجہ کر تا کہ تجھ میں جہاں انسانی جذبے پیدا ہوں وہاں تیری زندگی عشق حقیقی کے سوز و گداز سے سرشار ہو جائے۔

۳- وہ دل جو تمنا کی تب و تاب سے آشنا ہو جاتا ہے وہ پروانے کی طرح خود کو لگاتار شعلے پر مارتا رہتا ہے۔ پروانہ عاشق اور شعلہ محبوب ہے۔ گویا جو بھی انسان آرزو یا عشق

کے سوز وحرارت سے آشنا ہو جاتا ہے وہ اپنے محبوب سے کہ وہ اس کا مقصود بھی ہے، پیہم وابستہ رہتا ہے۔

۴۔ تو صبح کے وقت کے آنسوؤں سے زندگی کا ساز وسامان پیدا کر۔ تیری کھیتی اجڑ جائے گی اگر اس میں تو مسلسل دانے/ بیج نہ ڈالتا رہے گا۔ گویا جب تک انسان جذبہ عشق اور سوز وگداز سے بیگانہ رہتا ہے اس وقت تک اس کی زندگی ایک ایسی حقیقی زندگی نہیں بن سکتی جو اس کائنات کی تخلیق کا مقصد ومنشا ہے۔

۵۔ تو جام کو گردش میں لا اور یورپی ہنگامے کی بات کم کر یا نہ کر، اس ویرانے (دنیا) سے ہزاروں قافلے مسلسل گذر چکے ہیں۔ مطلب یہ کہ تو اپنے اسلام اور اس کی تعلیمات کی طرف توجہ کر۔ یورپ نے کیا کیا یا کیا ظلم ڈھائے، اس کا ذکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس دنیا میں آئے دن تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ آج ایک قوم غالب ہے تو کل وہ مغلوب یا تباہ ہو جائے گی، لہٰذا تو اہل یورپ سے مت خوف زدہ ہو اور نہ ان کے افکار کا کوئی اثر لے بلکہ اپنے مذہبی افکار کو اپنا کر اپنے لیے عزت وعظمت کا سامان کر۔

غزل-۴۱

۱۔ عشق اندر جستجو افتاد و آدم حاصل است جلوۂ او آشکار از پردۂ آب وگل است

۲۔ آفتاب و ماہ و انجم می تواں دادن ز دست در بہائے آں کفِ خاکے کہ دارائے دل است

۱۔ عشق تلاش میں نکلا اور اسے آدم مل گیا یا اس کی جستجو کا حاصل آدم ٹھہرا۔ اس (عشق) کا جلوہ آدم کے جسم خاکی سے ظاہر/ نمایاں ہے۔ غالباً قرآنی تلمیح کے حوالے سے بات کی ہے۔ روزِ ازل جب خدا کی خلافت و نیابت کی امانت (جسے یہاں عشق کہا گیا ہے) کا بوجھ اٹھانے سے سب نے انکار کر دیا تو آدم نے اسے اٹھا لیا۔ اسی بنا پر صرف انسانی خاک/ جسم اس ذات کے عشق سے منور ہے۔ اس موضوع کو بعض شعرا نے اور انداز میں پیش کیا ہے۔ مثلاً بقول حافظ

آسماں بارِ امانت نتوانست کشود
قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

سعدیؔ:

مرا گناه خود است ار ملامت تو برم
که عشق بارِ گراں بود و من ظلوم و جهول

میر تقی میرؔ:

کی عرض جو متاعِ امانت ازل کے بیچ
جب اور لے سکے نہ، خریدار ہم ہوئے

۲- اس مٹھی بھر خاک یعنی جسم کے بدلے میں یا قیمت میں جو ایک دل زندہ کا حامل ہو، آفتاب اور چاند اور ستارے ہاتھ سے دیئے جا سکتے ہیں۔ گویا ایک عشق آشنا دل رکھنے والے جسم کے مقابلے میں بڑی سے بڑی اور ہر چیز کی کوئی قدر و قیمت اور اہمیت نہیں ہے۔

غزل-۴۲

۱-	بیا که خاوریاں نقش تازه ے بستند	دگر مرو بطوافِ بتے که بشکستند
۲-	چه جلوه ایست که دلہا بلذت نگہے	زخاکِ راه مثال شراره برجستند
۳-	کجاست منزل تورانیانِ شہر آشوب	که سینه ہائے خود از تیزی نفس خستند
۴-	تو ہم بذوقِ خودی رس که صاحبان طریق	بریده از ہمه عالم بخویش پیوستند
۵-	بچشم مرده دلاں کائنات زندانے است	دو جام باده کشیدند و از جہاں رستند
۶-	غلامِ ہمت بیدارِ آں سوارانم	ستاره را بسناں سفته در گره بستند
۷-	فرشته را دگر آں فرصت سجود کجاست	که نوریاں بتماشائے خاکیاں مستند

۱- تو آ کہ اہل مشرق نے ایک نیا نقش باندھا/کھینچا ہے۔ تو اب ایسے بت کے طواف کو مت جا جسے انہوں نے توڑ دیا ہے یعنی اہل یورپ نے اپنے ظاہری علوم وفنون اور ثقافت کی چمک دمک سے انہیں مسحور کر رکھا تھا اس سے وہ باخبر ہو کر اس کا توڑ کرنے میں لگ گئے ہیں، لہٰذا تو (مخاطب) بھی اب اس سے دور رہ۔

۲- یہ کیسا جلوہ ہے کہ دل جس پر نگاہ کرنے (اسے دیکھنے) کی لذت سے چنگاری کی طرح راستے کی خاک سے اچھل پڑے ہیں یا اچھل رہے ہیں۔ جلوہ سے مراد آزادی

کا جلوہ ہے۔ یورپ نے مشرق کو غلام بنا رکھا تھا۔ اب اہل مشرق بیدار ہو کر اپنی کمزوری اور بے مائیگی کے باوجود آزادی کے حصول میں بڑے جوش وجذبہ اور شوق وذوق سے مصروف ہو گئے ہیں۔

۳۔ ان تورانی مسلمانوں کی منزل کہاں ہے جو ہنگامہ و جنگ پسند تھے' وہ تورانی جو اپنی تیزی نفس سے اپنے سینے زخمی کر لیا کرتے تھے یعنی وہ باطل قوتوں کے خلاف جہاد کیا کرتے اور راہِ حق میں جدوجہد کرنے کے لیے ہر وقت آمادہ اور بیقرار رہتے۔ ''ان کی منزل کہاں ہے'' سے مراد ہے کہ وہ کہاں ہیں' انھیں اور فرنگی باطل کو مٹا دیں۔

۴۔ تو بھی خودی کا ذوق خود میں پیدا کر کیونکہ عشق کے مسلک پر چلنے والے ساری دنیا سے کٹ کر اپنی ذات میں محو ہو گئے تھے، گویا تو بھی ان کا مسلک اختیار کر کے اپنی معرفت حاصل کر اور یوں دنیا پر چھا جا۔

۵۔ مردہ دل لوگوں کی نظروں میں یہ کائنات محض ایک قید خانہ ہے' چنانچہ انہوں نے شراب کے دو جام پیے اور اس دنیا سے نجات پا گئے' آزاد ہو گئے۔ ایسے لوگ چند روزہ زندگی عیش ونشاط میں گذار کر خود کو یہاں کی ذمہ داریوں سے گویا بچانا چاہتے ہیں اور یوں ایک بے مقصد زندگی بسر کر کے یہاں سے چل بستے ہیں جبکہ حقیقی زندگی کا مقصد اس کائنات کو تسخیر کر کے اپنی بقا کا سامان کرنا ہے۔

۶۔ میں ان بیدار ہمت سواروں کا غلام ہوں جنہوں نے ستارے کو سنان (نیزے کی انی) میں پرو کر اپنی گرہ میں باندھ لیا یعنی انہوں نے بڑے بڑے کارنامے انجام دے کر اس کائنات کو مسخر کیا۔

۷۔ فرشتے کو اب پھر (اس) سجدہ کرنے کی فرصت کہاں ہے کیونکہ فرشتے تو انسانوں کے نظارے میں مست ہیں۔ روزِ ازل آدم کی تخلیق پر فرشتوں نے اسے سجدہ کیا۔ اس وقت اس کے کمالات اور جوہر پوشیدہ تھے جو اب ظاہر ہو کر فرشتوں کی حیرانی کا باعث بن رہے ہیں اور وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ خالق کا یہ عظیم شاہکار واقعی سجدے کے لائق ہے۔

غزل-۴۳

۱۔ عشق را نازم کہ بودش را غم نابود نے   کفر او زنار دارِ حاضر و موجود نے

۲-	عشق اگر فرماں دہد از جان شیریں ہم گذر	عشق محبوب است و مقصود است و جاں مقصود نے
۳-	کافری را پختہ تر سازد شکست سومنات	گرمی بت خانہ بے ہنگامۂ محمودؔ نے
۴-	مسجد و میخانہ و دیر و کلیسا و کنشت	صد فسوں از بہر دل بستند و دل خوشنود نے
۵-	نغمہ پردازی ز جوئے کوہسار آموختم	در گلستاں بودہ ام یک نالہ دردآلود نے
۶-	پیش من آئی؟ دم سردے دل گرمے بیار	جنبش اندر تست اندر نغمۂ داؤد نے
۷-	عیب من کم جوے واز جامم عیار خویش گیر	لذت تلخاب من بے جان غم فرسود نے

۱- مجھے عشق پر فخر ہے کہ اس کے وجود کو نیستی/ فنا کا غم نہیں ہے۔ اس کا کفر حاضر اور موجود کا زنار دار نہیں ہے یعنی وہ ابدی ہے اور ہر طرح کے دنیاوی اور مادی اور عام مذہبی چکروں سے آزاد ہے۔ ایک صاحب عشق کا سب سے بڑا مقصد اس محبوب حقیقی تک رسائی ہے جس کی اسلام تعلیم دیتا ہے۔

۲- اگر عشق حکم دیتا ہے تو تو اپنی پیاری جان بھی قربان کر دے' اس لیے کہ عشق ہی محبوب ہے' وہی مقصود ہے' یعنی حقیقی زندگی اسی سے ہے جبکہ جان مقصود نہیں ہے۔ اس لیے کہ عشق ہی کی بدولت تو ایک عاشق حقیقی زندگی گذارتا اور بقا حاصل کرتا ہے۔

۳- سومنات کی ٹوٹ پھوٹ کافری یا کفر میں زیادہ استحکام/ پختگی پیدا کرتی ہے۔ بت خانے کی گرمی یا رونق محمود غزنوی کے ہنگامے کے بغیر نہیں ہے۔ تاریخی تلمیح سے استفادہ کرتے ہوئے یہ کہنا چاہا ہے کہ جب دشمن کا خوف ہو تو انسان اپنے بچاؤ کا انتظام کرتا ہے۔ چنانچہ کفر اسلام کے خوف سے خود کو مضبوط تر بنا رہا ہے۔ جملہ معترضہ کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آج کا مسلمان اس صورتِ حال سے بے نیاز ہے اور اپنے استحکام کا کوئی سامان نہیں کر رہا۔

۴- مسلمانوں کی مسجد' رندوں کا شراب خانہ' بت پرستوں کا مندر اور آتش پرستوں کی عبادت گاہ' گویا ہر جگہ دل کی خاطر سینکڑوں جادو جگائے گئے لیکن دل بھی خوش نہیں ہوا۔ یہ عبادت گاہیں دل کے اطمینان کے لیے تھیں لیکن انہیں نفرت و نفاق اور دنیا داری کی آماجگاہیں بنا دیا گیا ہے جبکہ ایک عاشق کے پیش نظر اس محبوب حقیقی کی جلوہ گری کی کوئی صورت ہے جو ان میں نہیں ہے اور یہی امر اس کے دل کے عدم اطمینان کا باعث ہے۔

۵- میں نے نغمہ سرائی پہاڑ سے بہنے والی ندی سے سیکھی ہے۔ میں گلستاں میں رہا ہوں۔

وہاں ایسا ایک بھی نالہ میں نے نہیں سنا جو درد بھرا ہو۔ ندی پہاڑ سے نکلتی ہے تو اس میں شور پیدا ہے۔ یہ شور گویا اس کا اپنے محبوب (پہاڑ) سے دور ہونے کے غم میں درد بھرا نالہ ہے جبکہ پرندے باغ میں چہچہاتے ہیں تو اس چہچہانے میں درد نہیں ہوتا' اس لیے کہ ان کا محبوب پھل اور پھول وہاں موجود ہوتا ہے جو وصل کی علامت ہے۔

٦- اگر تو میرے پاس آنا چاہتا ہے تو سرد دم اور گرم دل کے ساتھ آ' اس لیے کہ حرکت تو خود تیرے اپنے اندر ہے۔ حضرت داوٗدؑ کے نغمے میں نہیں ہے۔ کسی نغمہ کی مقبولیت اور دل نشینی خود سننے والے کے ذوق کے باعث ہے ورنہ کچھ نہیں۔ اسی حوالے سے اپنی شاعری کی بات کی ہے یعنی اس سے وہی قاری فیض پا سکتا ہے جس میں صلاحیت ہو۔

٧- تو (قاری) میرا یا میری شاعری میں عیب نہ نکال۔ میرے پیالے سے تو اپنی صلاحیت و معیار کے مطابق شراب لے کر پی۔ میری شراب تلخ کی لذت اس جان کے سوا حاصل ہونا ممکن نہیں جو عشق کے غم میں گھل نہ گئی ہو۔ اپنی شاعری کو تلخ شراب سے تشبیہ دی ہے جس میں گویا تلخ حقائق کے حامل مضامین ہیں۔

غزل-۴۴

۱- بر دلِ بیتابِ من ساقی مے نابے زند — کیمیا ساز است و اکسیرے بہ سیمابے زند

۲- من ندانم نور یا نار است اندر سینہ ام — ایں قدر دانم بیاضِ او بہ مہتابے زند

۳- بر دلِ من فطرتِ خاموش می آرد ہجوم — ساز از ذوقِ نوا خود را بہ مضرابے زند

۴- غم مخور ناداں کہ گردوں در بیابانِ کم آب — چشمہ ہا دارد کہ شبخونے بہ سیلابے زند

۵- اے کہ نوشم خوردہ ای از تیزیٔ نیشم مرنج — نیش ہم باید کہ آدم را رگِ خوابے زند

۱- ساقی میرے بیقرار دل پر خالص شراب ڈالتا ہے وہ ایک کیمیا ساز ہے اور پارے کے ساتھ اکسیر لگاتا ہے۔ اکسیر کو پارے پر لگایا جائے تو وہ سونا بن جاتا ہے۔ اسی حوالے سے مرشد کامل کی بات کی ہے کہ وہ اپنی پوری توجہ سے میرے دل کو خود شناس اور خدا شناس بنا رہا ہے۔

۲- مجھے یہ علم نہیں ہے کہ میرے سینے میں نور ہے یا نار (آگ) ہے۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ اس کی چمک چاند کی چاندنی یا روشنی کے لیے باعث شرم بن رہی ہے۔ عشق کی

روشنی سے منور دل کے مقابلے میں ظاہر کی بڑی سے بڑی روشنی کی بھی کوئی قدر و اہمیت نہیں ہے۔

۳- میرے دل پر خاموش فطرت ہجوم کر رہی ہے۔ گویا نغمے کے ذوق سے ساز خود کو مضراب پر لگا رہا ہے یا مار رہا ہے۔ دل جب عشق کے جذبوں سے سرشار ہو جاتا ہے تو اس صورت میں اسے فطرت کی نہیں بلکہ فطرت کو اس کی طلب ہوتی ہے تاکہ وہ اس کی پوشیدہ صلاحیتوں کو ظاہر کر کے انہیں عمل پر گامزن کرے۔

۴- اے نادان! تو غم نہ کر' اس لیے کہ آسمان تھوڑے پانی والے بیابان میں ایسے چشمے رکھتا ہے جو سیلاب پر شب خون مارتے ہیں یعنی اگرچہ تو ایک کمزور انسان ہی سہی لیکن قدرت نے تجھ میں ایسی پوشیدہ اہلیتیں اور صلاحیتیں رکھی ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر تو اپنی عظمت و سربلندی کا سامان کر سکتا ہے۔

۵- اے (مخاطب) کہ تو نے میری شیریں غذا کھائی یا میرا شہد پیا ہے تو تو میرے ڈنک کی تیزی سے رنجیدہ خاطر نہ ہو کیونکہ ڈنک مارنے کی بھی ضرورت ہے جو انسان کی سوئی ہوئی رگ کو پھڑکا دے/ جگا دے یعنی اگر تو نے میری شاعری سے لطف اٹھایا ہے تو اس میں کہے گئے ایسے موضوعات و مضامین سے مت گھبرا جو تجھے بے مقصد زندگی گذارنے کی بجائے جہد و عمل سے با مقصد زندگی گذارنے پر مائل کرتے ہیں۔

غزل-۴۵

۱- فروغِ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے | زمیں از کوکب تقدیر ما گردوں شود روزے

۲- خیالِ ما کہ او را پرورش دادند طوفاں ہا | زگردابِ سپہر نیلگوں بیروں شود روزے

۳- یکی در معنیٔ آدم نگر! از من چہ می پرسی | ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے

۴- چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے | کہ یزداں را دل از تاثیر او پرخوں شود روزے

۱- ایک دن آئے گا جب مٹی کے بنے انسان کی روشنی نوری مخلوق یعنی فرشتوں سے بڑھ جائے گی اور زمین ہماری تقدیر کے ستارے سے آسمان بن جائے گی یعنی انسان بے حد ترقی کر کے اس دنیا یا زمین کو ستاروں سے آراستہ آسمان کے مقابلے میں زیادہ پرکشش بنا دے گا اور ذاتی ترقی میں وہ فرشتوں سے بھی آگے نکل جائے گا۔

۲- ہمارا خیال، جسے طوفانوں نے پرورش کیا، پالا پوسا ہے، ایک روز وہ نیلے آسمان کے بھنور سے باہر نکل جائے گا۔ گویا انسانی فکر اس حد تک ترقی کر جائے گی کہ اس کے لیے آسمانوں کے اس پار رسائی ممکن اور آسان ہو جائے گی۔

۳- تو ذرا آدم کے معنی پر غور کر، مجھ سے تو کیا پوچھتا ہے، یہ معنی ابھی اس کی طبیعت کے اندر مچل رہے ہیں۔ ایک روز آئے گا جب وہ موزوں ہو جائیں گے، شعر بن جائیں گے۔ مطلب یہ کہ ایک دن اس کی پوشیدہ یا باطنی صلاحیتیں اور اہلیتیں نمایاں ہو جائیں گی اور وہ صحیح معنوں میں زمین پر خدا کا نائب قرار پائے گا۔ البتہ ان صلاحیتوں کونمایاں کرنے کی خاطر کسی مردِ حق کی صحبت ضروری ہوگی۔

۴- یہ پیش پا افتادہ مضمون ایک روز ایسا موزوں ہو جائے گا کہ خدا کا دل اس کی تاثیر سے پرخوں ہو جائے گا۔ مطلب یہ کہ انسان میں خدائی صفتوں کے مظہر ہونے کی صلاحیت واہلیت ہے تو سہی لیکن فی الحال وہ اپنی غفلت کی بنا پر گویا حیوانوں کی سی زندگی بسر کر رہا ہے، اگر اس نے اپنی معرفت حاصل کر لی تو وہ ایسے مقام پر پہنچے گا جو خالق کے لیے باعث ناز ہوگا کہ اس کی اس تخلیق (انسان) نے اپنی صلاحیتوں سے صحیح کام لیا ہے۔

غزل-۴۶

۱- زرسم و راہِ شریعت نکردہ ام تحقیق　　جز ایں کہ منکرِ عشق است کافر وزندیق

۲- مقام آدم خاکی نہاد دریابند　　مسافران حرم را خدا دہد توفیق

۳- من از طریق نہ پرسم، رفیق می جویم　　کہ گفتہ اند نخستیں رفیق و باز طریق

۴- کند تلافی ذوق آں چناں حکیم فرنگ　　فروغِ بادہ فزوں ترکند بجام عقیق

۵- ہزار بار نکوتر متاع بے بصری　　ز دانشے کہ دل او رانمی کند تصدیق

۶- بہ پیچ وتاب خرد گرچہ لذت دگر است　　یقین سادہ دلاں بہ زنکتہ ہائے دقیق

۷- کلام و فلسفہ از لوحِ دل فروشستم　　ضمیر خویش کشادم بہ نشتر تحقیق

۸- ز آستانۂ سلطاں کنارہ می گیرم　　نہ کافرم کہ پرستم خدائے بے توفیق

۱- میں نے شریعت کے طور طریقوں پر اس کے سوااور کوئی تحقیق نہیں کی کہ عشق سے انکار

کرنے والا کافر اور آتش پرست ہے۔ مطلب یہ کہ عشق حقیقی کے بغیر ایک مسلمان محض نام کا مسلمان ہے۔ وہ عقل ہی کو سب کچھ جانتا اور یوں شریعت کی کئی باتوں سے انکار یا اختلاف کرتا ہے جیسا کہ آج دیکھنے میں آ رہا ہے۔

۲- خدا حرم کے مسافروں کو توفیق دے کہ وہ مٹی سے تخلیق شدہ انسان کے مقام کو صحیح طور پر سمجھیں۔ گویا کعبہ کے جانے والے مسلمان اس راز سے آگاہ ہو جائیں کہ ظاہری کعبہ کے علاوہ ان کے سینے میں بھی ایک کعبہ یعنی دل ہے جسے خدا کا گھر بنایا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے عشق کا جذبہ صادق ضروری ہے۔

۳- میں راستہ نہیں پوچھ رہا' میں تو ساتھی تلاش کر رہا ہوں۔ اس لیے کہ کہا جاتا ہے کہ پہلے راستے کا ساتھی' پھر راستہ۔ ساتھی سے مراد راستے اور اس کی مشکلات سے آگاہ دوست جو چلنے والے کو راستہ بھٹکنے سے بچا لے۔

۴- فرنگ/ یورپ کا دانشمند کچھ اس انداز سے ذوق کی تلافی کرتا ہے کہ وہ جام عقیق میں شراب کی چمک کو زیادہ کر دیتا ہے۔ یورپ کی تہذیب و معاشرت' علوم وفنون اور فکر و خیال وغیرہ سے دنیا کئی برائیوں اور خرابیوں کا شکار ہوئی ہے۔ گویا اب وہ (اہل یورپ) اپنی تہذیب کی ظاہری چکا چوند اور چمک دمک سے دوسرے ملکوں کے لوگوں کی آنکھیں چندھیا رہے ہیں تا کہ وہ اس روشنی کے پس پردہ تاریکی کو نہ دیکھ سکیں جو وہ دنیا میں پھیلا چکے اور پھیلا رہے ہیں۔

۵- اس دانش سے بے بصری کی متاع ہزار مرتبہ اچھی ہے جس (دانش) کی تصدیق دل نہیں کرتا۔ ایسی دانائی ایک بیکار سی دانائی ہے جس کا تعلق دل سے نہ ہو یعنی جذبوں سے خالی ہو۔ اس کے مقابلے میں جہالت کہیں بہتر ہے۔

۶- خرد کے پیچ و تاب میں اگرچہ ایک اور ہی لذت ہے لیکن سادہ دل لوگوں/ انسانوں کا یقین گہرے نکتوں سے زیادہ اچھا ہے۔ عقل و خرد بھول بھلیوں اور شک وشبہ کا شکار رہتی ہے جبکہ سادہ دل انسان (عشق کی بنا پر) پختہ یقین کے حامل ہوتے ہیں اور اسی باعث رمزوں اور گہری باتوں کے چکر سے دور رہتے ہیں۔

۷- میں نے کلام اور فلسفہ کو دل کی تختی سے دھو ڈالا ہے اور اپنے ضمیر کو تحقیق کے نشتر سے کھول لیا ہے۔ مطلب یہ کہ تحقیق گویا مشاہدے' یقین اور تصوف کا علم ہے۔ اس کے مقابلے میں علم کلام اور فلسفہ سے دینی مسئلوں کو عقل کے حوالے سے سمجھا اور جانچا پرکھا

جاتا ہے یعنی میں نے علم کلام وغیرہ سے اپنی دلچسپی ختم کر کے علم مشاہدہ کی طرف رجوع کر لیا ہے۔

۸۔ میں بادشاہ/ سلطان کے آستانے سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہوں۔ میں کوئی کافر نہیں ہوں جو کسی بے توفیق خدا کی پرستش کروں۔ بادشاہ خواہ کتنی عظیم قوت کا مالک کیوں نہ ہو، وہ کسی نہ کسی صورت اور معاملے میں دوسروں کا محتاج اور دست نگر ہوتا ہے جبکہ حقیقی بادشاہ صرف خدا ہی ہے جو قطعاً کسی کا محتاج نہیں بلکہ پوری مخلوق اس کی محتاج ہے اور اسی بنا پر میں اس کے آستانے کی طرف متوجہ ہو جاؤں تو صحیح ہوگا۔

غزل-۴۷

۱- از ہمہ کس کنارہ گیر صحبت آشنا طلب
ہم زخدا خودی طلب ہم زخودی خدا طلب

۲- از خلش کرشمہ ے کار نمی شود تمام
عقل و دل و نگاہ را جلوہ جدا جدا طلب

۳- عشق بسر کشیدن است شیشہ کائنات را
جامِ جہاں نما مجو دست جہاں کشا طلب

۴- راہ رواں برہنہ پا راہ تمام خار زار
تا بہ مقام خود رسی راحلہ از رضا طلب

۵- چوں بہ کمال می رسد فقر دلیل خسروی است
مسند کیقباد را در تہ بوریا طلب

۶- پیش نگر کہ زندگی راہ بعالمے برد
از سر آنچہ بود و رفت در گذر، انتہا طلب

۷- ضربت روزگار اگر نالہ چونے دہد ترا
بادۂ من زکف بنہ، چارہ زمومیا طلب

۱- تو ہر کسی سے کنارہ کشی اختیار کر (الگ ہو جا) اور کسی آشنا کی صحبت کا طالب ہو تو خدا سے خودی بھی طلب کر اور خودی سے خدا کا طالب بھی ہو یعنی خدا ہی تیرا صحیح دوست ہے کوئی انسان نہیں۔ جب تو خودی سے آگاہ ہو گیا تو تو خدا کو پا لے گا۔ اپنی ذات کی معرفت ہی سے خدا کی معرفت کا سامان ہوتا ہے۔

۲- محبوب کے صرف چشم و ابرو کے اشاروں یعنی ناز و ادا ہی سے کام نہیں بنتا۔ تو عقل اور دل اور نگاہ کے لیے الگ الگ جلوے کا طالب ہو۔ گویا محبوب حقیقی سے وابستگی کے لیے تو عقل اور عشق (دل) اور نگاہ کو ساتھ ساتھ رکھ یعنی تینوں سے بیک وقت کام لے کہ عشق حقیقی کا یہی تقاضا ہے۔

۳- عشق کیا ہے؟ عشق کائنات کی صراحی پی جانے کا نام ہے۔ تو جام جہاں نما تلاش نہ کر

بلکہ دنیا کو مسخر کرنے والے ہاتھ کی خواہش کر یا طلب کر۔ مطلب یہ کہ عشق پوری کائنات کو مسخر و مطیع کرنا ہے۔ تو مشاہدے کی حالت سے نکل کر اس مشاہدہ شدہ دنیا کو اپنی روحانی قوت سے اپنا اطاعت گزار بنا۔

۴- راستہ چلنے والے/ مسافر ننگے پاؤں ہیں اور تمام راستہ کانٹوں سے بھرا پڑا ہے۔ اس خاطر کہ تو اپنے مقام کو پہنچے تو خالق کی تسلیم و رضا کی سواری طلب کر۔ ایک سالک کو محبوب حقیقی تک رسائی کے راستے میں سات مقامات سے سابقہ پڑتا ہے توبہ' ورع' زہد' فقر' صبر' توکل وغیرہ۔ آخری مقام تسلیم و رضا کا مقام ہے جس میں گویا سب مقامات موجود ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ عشق میں کتنے اور کیسے ہی مصائب و آلام کیوں نہ پیش آئیں صبر و رضا اختیار کرتے ہوئے اس راستے پر چلتا رہ یعنی:

ع سر تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

کا عملی نمونہ بن جا۔

۵- جب فقر اپنے کمال کو پہنچتا ہے تو وہ بادشاہت/ شہنشاہی کی دلیل بن جاتا ہے۔ تو کیقباد کا تخت بوریے کے نیچے طلب کر۔ فقر میں کامل ہو جانے والا اس دنیا کا شہنشاہ بن جاتا ہے۔ وہ ایک ملک کا نہیں بلکہ پوری دنیا کا اور اہل دنیا کے دلوں کا حکمران بن جاتا ہے۔

۶- تو آگے کی طرف دیکھ کہ زندگی کس دنیا کی طرف رواں دواں ہے جو کچھ تھا اور چلا گیا یعنی گذر گیا اس کا نہ سوچ' اس کا خیال چھوڑ اور انتہا کا طالب ہو۔ گویا کائنات کی ہر شے اپنی اصل (خالق) کی طرف چل رہی ہے۔ تو بھی اپنی انتہا (اصل) کی طرف چلنے کا طالب ہو۔

۷- اگر زمانے کی چوٹ کے باعث تجھ میں بانسری کی طرح نالہ پیدا ہو جائے تو تو میری شراب ہاتھ سے پھینک دے اور مومیا سے اس (نالہ) کا علاج کر۔ اگر زمانے کے آلام و مصائب کے ہاتھوں تو فریاد اور واویلا کر رہا ہے تو میری ایسی شاعری کو پیش نظر نہ رکھ جو تفریحی قسم کی ہو بلکہ ان اشعار سے استفادہ کر جن میں تیری اس مصیبت کا کوئی علاج ہو۔ یعنی ایسے اشعار جن میں صبر و رضا کی تلقین کی گئی ہے۔

غزل-۴۸

۱- بینی جہاں را خود را نبینی تا چند ناداں غافل نشینی

۲- نورِ قدیمی شب را بر افروز دست کلیمی در آستینی
۳- بیروں قدم نہ از دورِ آفاق تو پیش ازینی تو بیش ازینی
۴- از مرگ ترسی اے زندہ جاوید؟ مرگ است صیدے تو در کمینی
۵- جانے کہ بخشند دیگر نگیرند آدم بمیرد از بے یقینی
۶- صورت گری را ازمن بیاموز شاید کہ خود را باز آفرینی

۱- تو دنیا کوتو دیکھتا ہے لیکن خود کو نہیں دیکھتا۔ ارے نادان! تو کب تک غافل بیٹھا رہے گا یعنی تو اپنی معرفت اور خود کو دیکھنے یا اپنی ذات کی شناخت کے معاملے میں کب تک غفلت سے کام لیتا رہے گا۔

۲- تو تو ایک قدیم نور ہے' رات کو روشن کر۔ تو آستین میں کلیمؑ کا ہاتھ ہے۔ قرآنی تلمیح اور حضرت موسیٰ کے معجزہ ''ید بیضا'' کے حوالے سے یہ کہنا چاہا ہے کہ تو اس ازلی ذات کا پرتو ہے۔ تو اس نور/ پرتو سے اپنی زندگی کی رات روشن کر۔ تو اپنی حقیقت کو فراموش کر چکا ہے اپنی معرفت حاصل کرتا کہ تجھ پر یہ امر واضح ہو جائے کہ تیری اصل کتنی باعظمت ہے۔

۳- تو آفاق/ کائنات کے حلقے سے قدم باہر رکھ۔ تو اس (کائنات) سے آگے یعنی پہلے کا یا مقدم ہے اور تو اس سے بڑھ کر یا زیادہ وسیع ہے۔ تو اس کائنات میں کیوں کھو گیا یا محصور ہو کے رہ گیا ہے۔ تو تو اس سے ہر لحاظ سے افضل و عظیم ہے۔ غفلت چھوڑ اور اپنا صحیح مقام حاصل کرنے کے لیے جہد و عمل کی راہ اختیار کر۔

۴- اے زندۂ جاوید کیا تو موت سے ڈرتا ہے؟ موت تو شکار ہے جس کی گھات میں تو لگا ہوا ہے۔ تو فانی نہیں ہے' البتہ اس ضمن میں یہ لازم ہے کہ تو اپنی معرفت سے آگاہ ہو جائے کہ اسی میں تیری بقا کا سامان ہے۔

۵- قدرت جو جان عطا فرماتی ہے' اسے واپس نہیں لیتی۔ آدمی تو اپنی بے یقینی کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ گویا جان اس خالق کی طرف سے ایک تحفہ ہے اور تحفہ واپس نہیں لیا جاتا۔ اگر آدمی ایمان کی حد تک یقین پیدا کر لے تو اسے بقا حاصل ہو جاتی ہے' بصورت دیگر وہ فنا کا شکار ہو جاتا ہے۔

۶- صورت گری کا فن تو مجھ سے سیکھ' ممکن ہے اس طرح تو اپنی تخلیق دوبارہ کر لے۔ انسان کی ایک پیدائش تو ماں کے پیٹ سے ہے جبکہ دوسری پیدائش انسان کی عملی

پیدائش ہے یعنی انسان اپنی خودی کو پالیتا اور جہد وعمل کی راہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔

غزل-۴۹

۱- من ہیچ نمی ترسم از حادثۂ شب ہا | شبہا کہ سحر گردد از گردشِ کوکب ہا
۲- نشناخت مقام خویش افتاد بدام خویش | عشقے کہ نمودے خواست از شورشِ "یارب ہا"
۳- آہے کہ ز دل خیزد از بہر جگر سوزی است | در سینہ شکن او را آلودہ مکن لب ہا
۴- در میکدہ باقی نیست از ساقی فطرت خواہ | آں مے کہ نمی گنجد در شیشہ مشرب ہا
۵- آسودہ نمی گردد آں دل کہ گسست از دوست | با قرأتِ مسجد ہا با دانشِ مکتب ہا

۱- میں راتوں کے حادثے سے ذرا بھی نہیں ڈرتا۔ اس لیے کہ راتیں تو ستاروں کی گردش سے صبح میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اگر اس بات پر یقین ہو کہ تاریکی آخر چھٹ جاتی ہے اور روشنی آ جاتی ہے' اسی طرح تکلیف کے بعد راحت آتی ہے تو انسان وقتی پریشانیوں اور تکلیفوں سے نہیں گھبراتا۔

۲- وہ عشق جس نے "یارب" کے شور سے اپنی نمود چاہی یا اپنا اظہار چاہا' اس نے اپنا مقام نہ پہچانا اور وہ اپنے ہی جال میں پھنس گیا۔ یارب کا شور عشق میں تکلیفوں کے باعث ہے۔ یہ صحیح عشق نہیں ہے۔ صحیح عشق ہر طرح کی اذیتوں تکلیفوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنے اور انہیں دوست (محبوب حقیقی) کی طرف سمجھنے کا نام ہے یعنی:

ہرچہ از دوست رسد خوب است

(جو کچھ دوست کی طرف سے پہنچتا ہے وہ خوب ہے) لہٰذا:

ع سر تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

۳- وہ آہ جو دل سے اٹھتی ہے وہ جگر جلانے کے لیے ہے۔ تو اسے سینے میں جذب کر لے اور اس سے اپنے ہونٹ آلودہ نہ کر۔ گویا نالہ وفریاد کرنا اور آہیں بھرنا عشق کا لازمہ ہے لیکن انہیں ہونٹوں پر نہ لانے ہی سے عشق میں پختگی آتی ہے۔

۴- وہ شراب جو مذہب کے طور طریقوں کی صراحی میں نہیں سماتی وہ تو فطرت کے ساقی سے مانگ۔ ایسی شراب مے خانوں میں باقی نہیں ہے یعنی یہ شراب مذہبی رسوم اور عبادتوں کی نہیں بلکہ روحانیت کی شراب ہے جو خانقاہوں اور مسجدوں میں نہیں پائی

جاتی۔ اس کے لیے خدا کی طرف توجہ کر۔ گویا آج کے صوفی و ملا محض نام کے صوفی و ملا ہیں' ان میں حقیقی روحانی جذبے نہیں ہیں۔

۵- وہ دل جو دوست/محبوب سے جدا ہو گیا' وہ مسجدوں میں قرآن خوانی اور مدرسوں کی تعلیم و دانش سے سکون نہیں پاتا۔ عاشق کی تسکین کا سامان صرف محبوب کے وصل و دیدار ہی سے ممکن ہے' وعظ و نصیحت اور علم و حکمت سے نہیں۔ بقول سعدی شیرازی وہ دل کہ عاشق بھی ہے اور صابر بھی وہ دل نہیں پتھر ہے کیونکہ عشق اور صبر میں ہزاروں کوس کا فاصلہ ہے:

دلے کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است
زعشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است

غزل-۵۰

۱- تو کیستی؟ زکجائی؟ کہ آسمانِ کبود | ہزار چشم براہِ تو از ستارہ کشود
۲- چہ گویمت کہ چہ بودی' چہ کردہ ای چہ شدی | کہ خوں کند جگرم را ایازی محمود
۳- تو آں نہ ای کہ مصلیٰ زکہکشاں می کرد | شراب صوفی و شاعر تراز خویش ربود
۴- فرنگ اگرچہ ز افکارِ تو گرہ بکشاد | بجرعۂ دگرے نشۂ ترا افزود
۵- سخن زنامہ و میزاں درازتر گفتی | بحیرتم کہ نہ بینی قیامت موجود
۶- خوشا کسے کہ حرم را درونِ سینہ شناخت | دمے تپید و گذشت از مقام گفت و شنود
۷- ازاں بمکتب و میخانہ اعتبارم نیست | کہ سجدہ ے نبرم بر درِ جبیں فرسود

۱- تو کون ہے؟ کہاں سے ہے؟ کہ نیلے آسمان نے تیری راہ (انتظار) میں ستاروں کی ہزاروں آنکھیں بچھا رکھی ہیں۔ انسان اشرف المخلوقات ہونے کے ناطے گویا عظمت و سربلندی کا حامل ہے جس کی وجہ سے آسمان اپنی تمام تر بلندی کے باوجود اس کے نظارے کا خواہشمند ہے۔

۲- میں کیا کہوں کہ تو کیا تھا' تو نے کیا کیا اور تو کیا ہو گیا ہے' اس لیے کہ محمود کی ایازی میرے جگر کو خون کرتی ہے۔ انسان خدا کا نائب بنا کر زمین پر بھیجا گیا تھا' گویا وہ اس دنیا کا حکمران بنایا گیا تھا لیکن وہ یہاں آ کر مادیت یا مادی دنیا کا غلام بن گیا۔ اس

کے اس عمل پر دکھ کا اظہار کرتے ہوئے بالواسطہ یہ درس ہے کہ اپنی حقیقت سے آگاہ ہو کر اصل راہ اختیار کر۔

۳- تو وہ نہیں ہے جس نے کبھی کہکشاں کو مصلیٰ بنایا تھا۔ نام نہاد صوفی اور شاعری کے حقیقی مقصد سے بے خبر شاعر کی شراب نے تجھے خود سے بیگانہ کر دیا یعنی تجھے کائنات کا حکمران بنایا گیا تھا لیکن ان لوگوں (صوفی و شاعر) کی وجہ سے تو اپنے مقصد سے دور ہو گیا ہے۔

۴- اگرچہ یورپ نے تیرے افکار کی گتھیاں سلجھا دی ہیں لیکن اس نے شراب کا ایک دوسرا گھونٹ پلا کر تیرے نشے میں اضافہ کر دیا ہے یعنی اپنے جدید علوم و فنون سے تیرے ذہن کو روشن کیا ہے لیکن ساتھ ہی (ان علوم اور یورپی تہذیب و ثقافت سے متاثر ہونے کے نتیجے میں) تو اپنے دینی افکار سے دور ہٹ گیا اور بے دینی یا ملحدانہ نظریات کا حامل ہو گیا ہے۔

۵- تو نے قیامت کے روز کے نامۂ اعمال سے متعلق تو بہت لمبی چوڑی باتیں کی ہیں لیکن مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ تو وہ قیامت نہیں دیکھ رہا جو تیرے سامنے ہے۔ گویا اس دنیا میں بھی قوموں یا افراد کی ترقی یا ان کے زوال کو ان کے اعمال ناموں کی بنا پر جانچا جاتا ہے اور یہ بھی ایک طرح سے قیامت ہے۔

۶- وہ شخص بڑا خوش بخت یا مبارک ہے جس نے اپنے سینے کے اندر کے حرم کو پہچان لیا۔ وہ کچھ دیر تڑپا اور گفت و شنید کے مقام سے گذر گیا۔ یہاں حرم سے مراد ایسا دل جو خدا آشنا ہے اور خدا کا گویا گھر ہے اور جسے یہ مشاہدہ ہو جائے وہ اس ذاتِ اقدس کے وجود کے بارے میں قیل و قال اور بحث مباحثے میں نہیں پڑتا۔

۷- مدرسے اور مے خانے میں اس لیے میرا اعتبار نہیں ہے، میری ساکھ نہیں ہے کہ میں اس دروازے پر سجدہ نہیں کرتا جس پر دوسروں نے پیشانیاں رگڑی ہوں، ماتھے گھسائے ہوں۔ گویا آج کے نام نہاد علما اور صوفیا لوگوں کو اللہ کے حضور جھکانے کی بجائے اپنے آگے جھکاتے ہیں۔ لوگ ان کے آستانوں پر سجدے کرتے ہیں۔ چونکہ علامہ ان کے مخالف ہیں، اس لیے ان حلقوں میں ان کو عزت سے نہیں دیکھا جاتا۔

غزل-۵۱

۱- دیارِ شوق کہ دردآشناست خاک آنجا — بذرہ ذرہ تواں دید جانِ پاک آنجا

۲- مے مغانہ زمغ زادگاں نمی گیرند — نگاہ می شکند شیشہ ہائے تاک آنجا

۳- بہ ضبط جوشِ جنوں کوش در مقام نیاز — بہوش باش و مرو باقبائے چاک آنجا

۱- دیارِ شوق میں کہ جہاں کی مٹی درد آشنا ہے' ذرے کے اندر جانِ پاک کو دیکھا جا سکتا ہے۔ گویا ایک عاشق کے جسم کی ہر ہر رگ دردِ عشق سے آشنا ہونے کے باعث اس جان پاک کی جلوہ گاہ بن جاتی ہے۔ اس میں انوارِ الٰہی سما جاتے ہیں۔

۲- مے مغانہ مغ زادوں سے نہیں لی جاتی' وہاں تو نگاہ تاک کی صراحیوں کو توڑ ڈالتی ہے یعنی ایک عاشق حقیقی' محبوب کی نگاہ سے شراب پیتا ہے۔ محبوب حقیقی کی توجہ اسے مست کر دیتی ہے۔ وہ (عاشق) دنیاوی اسباب یا ظاہری اسباب کا محتاج نہیں رہتا۔

۳- تو ادب واحترام کے مقام پر اپنے جوشِ جنون کو ضبط کرنے کی کوشش کر۔ ہوش میں رہ اور اس مقام پر پھٹے ہوئے لباس کے ساتھ مت جا۔ یہ مقام محبوب کا آستانہ ہے جہاں مدہوشی کی حالت میں کوئی ایسی بات کرنا جو گستاخی کا باعث بنے' اچھا نہیں۔ پھٹا ہوا لباس/گریبان جنون ہی کی علامت ہے۔ اس گستاخی اور بے احترامی سے دور رہ اور احترام وادب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑ۔

غزل-۵۲

۱- مئے دیرینہ و معشوقِ جواں چیزے نیست — پیشِ صاحب نظراں حور و جناں چیزے نیست

۲- ہرچہ از محکم و پایندہ شناسی' گذرد — کوہ و صحرا و بر و بحر و کراں چیزے نیست

۳- دانشِ مغربیاں' فلسفہ مشرقیاں — ہمہ بتخانہ و در طوفِ بتاں چیزے نیست

۴- از خوداندیش و ازیں بادیہ ترساں مگذر — کہ تو ہستی و وجودِ دو جہاں چیزے نیست

۵- در طریقے کہ بنوکِ مژہ کاویدم من — منزل و قافلہ ریگ رواں چیزے نیست

۱- پرانی (زیادہ نشے والی) شراب اور جوان (دلکش) معشوق کوئی چیز نہیں۔ اہل نظر کے لیے حور اور جنت کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ محبوب حقیقی کے سچے عاشقوں کی تمام تر

توجہ اس ذات کی طرف ہوتی ہے اور وہ نہ تو دنیا داروں کی طرح دنیاوی دل کشیوں اور عیش و عشرت کے سامان میں کھوئے رہتے ہیں اور نہ وہ نام نہاد ملاؤں کی طرح حور و بہشت کے چکر میں پڑتے ہیں۔ ان سے سراپا بے نیاز ہوتے ہیں۔

۲- جس چیز کو بھی تو مضبوط اور ہمیشہ رہنے والی سمجھتا ہے' اسے آخر فنا ہے، یہ پہاڑ' یہ صحرا' یہ میدان اور سمندر اور ساحل کوئی چیز نہیں ہیں۔ ازلی و ابدی ذات صرف اس خالق کائنات کی ہے۔

۳- خواہ اہل یورپ کی دانش و حکمت ہے اور خواہ اہل مشرق کا فلسفہ یہ سب محض بت خانہ ہے اور بتوں کے طواف میں کچھ حاصل اور فائدہ نہیں ہے۔ کائنات کو مسخر کرنے اور اس کے اسرار سے آگاہی کے لیے صرف جذبہ عشق اور جہد و عمل کی ضرورت ہے۔ دنیاوی علوم و فنون اور فلسفہ و حکمت وغیرہ اس راہ میں بیکار ہیں۔

۴- تو اپنی معرفت یا خود شناسی کے بارے میں سوچ اور اس بیابان (زندگی کا یا دنیا کا) سے ڈرتا ہوا مت گذر' اس لیے کہ تیرا وجود تو ہے لیکن دونوں جہانوں کا وجود کوئی شے نہیں ہے یعنی انسان ہی نائب خدا ہونے کے باعث اس کائنات کا مقصد و محور ہے۔ وہ کائنات کے لیے تخلیق نہیں کیا گیا بلکہ کائنات اس کے لیے تخلیق کی گئی ہے۔

۵- اس راستے میں جو میں نے اپنی پلکوں کی نوک سے کھودا ہے' منزل اور قافلہ اور اڑتی ہوئی ریت کوئی شے نہیں ہے' ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ عاشق کو اپنے محبوب تک رسائی کے لیے خونِ جگر پینا پڑتا ہے۔ جان ماری کرنی پڑتی ہے۔ یہ ایک ایسا راستہ ہے جس پر عاشق مسلسل چلتا رہتا اور ہر طرح کے آرام اور منزل یا پڑاؤ سے بے نیاز ہوتا ہے۔

غزل-۵۳

۱- قلندراں کہ بہ تسخیر آب و گل کوشند — زشاہ باج ستانند و خرقہ می پوشند
۲- بجلوت اند و کمندے بہ مہر و ماں پیچند — بخلوت اند و زمان و مکاں در آغوشند
۳- بروزِ بزم سراپا چو پرنیان و حریر — بروزِ رزم خود آگاہ و تن فراموشند
۴- نظامِ تازہ بچرخِ دو رنگ می بخشند — ستارہ ہائے کہن را جنازہ بر دوشند

۵- زمانہ از رخِ فردا کشود بندِ نقاب معاشراں ہمہ سرمستِ بادۂ دوشند
۶- بلب رسید مرا آں سخن کہ نتواں گفت بحیرتم کہ فقیہان شہر خاموشند

۱- وہ قلندر جو اس مادی دنیا کو تسخیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ ایسے عظیم انسان ہیں جو پہنتے تو گدڑی ہیں لیکن بادشاہ سے خراج وصول کرتے ہیں یعنی مردانِ حق یا مردانِ مومن کی تمام تر سادہ زندگی کے باوجود حاکمانِ وقت ان سے خوف زدہ رہتے ہیں۔

۲- جب وہ (قلندر) جلوت یا محفل میں ہوتے ہیں تو وہ سورج اور چاند پر کمند پھینکتے / ڈالتے ہیں اور جب وہ خلوت میں ہوتے ہیں تو زمان و مکاں کو آغوش میں لیے ہوتے ہیں۔ جلوت میں ہونے سے مراد ہے کہ وہ لوگوں کے کام بناتے اور انہیں ظالموں یا ظالم حکمرانوں کے ظلم سے بچاتے ہیں جبکہ خلوت میں وہ محبوب حقیقی تک رسائی یا اس کے مشاہدے میں مست و محو ہوتے ہیں۔

۳- محفل کے دن وہ پورے طور پر حریر اور پرنیاں جیسے ریشم کی طرح نرم ہوتے ہیں جبکہ جنگ کے دن وہ خود آگاہ اور اپنے جسم کو بھولے ہوتے ہیں یعنی سب کے ساتھ وہ پیار محبت سے پیش آتے ہیں جبکہ باطل قوتوں سے ٹکراؤ میں وہ اپنی جان تک قربان کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔ علامہ نے اردو میں یہ بات یوں کہی ہے اور یہ درحقیقت ایک قرآنی آیت ۵۴ ' سورۂ المائدہ کا ترجمہ ہے:

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

۴- وہ (قلندر) اس دورنگے آسمان کو ایک نیا نظام دیتے ہیں۔ وہ پرانے ستاروں کا جنازہ کندھوں پر اٹھائے ہوتے ہیں۔ دورنگا آسمان اس بنا پر کہ اس کی گردش کبھی خوشی اور کبھی غم لاتی ہے۔ ستاروں کا تعلق تقدیر سے ہے۔ مطلب یہ کہ وہ قلندر تسخیر کائنات کرنے کے باعث آسمان اور ستاروں سے اپنی مرضی کے مطابق کام لیتے ہیں۔ اپنی تقدیر خود بناتے ہیں۔ علامہ نے تقدیر سے متعلق اردو میں یوں کہا ہے:

عبث ہے شیوۂ تقدیرِ یزداں
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

۵- زمانے نے تو آنے والے کل یعنی مستقبل کے چہرے سے پردہ اٹھا دیا ہے لیکن مسلمان ماضی کی شراب میں مست ہیں یعنی دوسری قومیں تو اپنا مستقبل سنوارنے کے

لیے جدو جہد اور کوششیں کر رہی ہیں جبکہ ہم مسلمان اپنے شاندار ماضی ہی کو یاد کر کے خوش ہو رہے ہیں اور اپنی ترقی کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھا رہے۔

۶- میرے ہونٹوں تک وہ بات آگئی جو بیان نہیں کی جا سکتی۔ میں حیران ہوں کہ شہر کے فقیہ خاموش ہیں۔ گویا علامہ کے مطابق آج کے مسلم علما قوم کو غفلت سے بیدار نہیں کر رہے ہیں اس لیے کہ وہ خود غافل اور عمل سے بیگانہ ہیں۔ علامہ اس لیے یہ بات نہیں کر رہے کہ علما ان کے مخالف ہو جائیں گے یا معاشرے میں ان کی عزت و آبرو نہ رہے گی۔ انہیں حیرانی اس بات پر ہے کہ یہ منہ پھٹ علما ابھی تک ان (علامہ) کے خلاف کیوں نہیں بولے' ہوسکتا ہے انہیں علامہ کے خلاف کوئی مواد نہ ملا ہو ورنہ وہ چپ رہنے والے کہاں ہیں۔

غزل-۵۴

۱- دو دستہ تیغم و گردوں برہنہ ساخت مرا | فساں کشید و بروئے زمانہ آخت مرا

۲- من آں جہانِ خیالم کہ فطرت ازلی | جہانِ بلبل و گل را شکست و ساخت مرا

۳- مے جواں کہ بہ پیمانہ تو می ریزم | ز راوقے است کہ جام و سبو گداخت مرا

۴- نفس بہ سینہ گدازم کہ طائر حرمم | تواں ز گرمی آوازِ من شناخت مرا

۵- شکستِ کشتی ادراکِ مرشدانِ کہن | خوشا کسے کہ بدریا سفینہ ساخت مرا

۱- میں دو دستہ تلوار ہوں اور آسمان نے مجھے نیام سے باہر نکال دیا۔ اس (آسمان) نے مجھے سان پر چڑھایا (تیز کیا) اور زمانے پر چلا دیا۔ علامہ کے مطابق قدرت نے انہیں موجودہ دور کے غیر اسلامی افکار وغیرہ کا توڑ کرنے پر مقرر کیا اور انہوں نے دو دستہ تلوار کی طرح (اپنی شاعری سے) ان سے ٹکر لے کر ان کے مٹنے کا سامان کیا ہے۔

۲- میں وہ جہانِ خیال ہوں کہ فطرت ازلی (قضا و قدر) نے گل و بلبل کی دنیا کو مٹا کر میری تخلیق کی یعنی قضا و قدر نے مجھے ایسے زوردار اور تعمیری خیالات سے نوازا ہے جن سے میں اپنی قوم کی سہل انگاری' غفلت اور بیکاری کو دور کر کے انہیں جہد و عمل اور بیداری کی طرف لا رہا ہوں۔ یہ سب شاعرانہ افکار سے کر رہا ہوں۔

۳- وہ تیز شراب' جو میں تیرے جام میں ڈال رہا ہوں' شراب کے اس برتن سے ہے جس

نے میرے جام وسبو کو پگھلا دیا ہے۔ یہ شراب عشق حقیقی ہے جس سے عاشق پگھل کے رہ جاتا ہے' اسے وہ اپنی شاعری کی صورت میں ملت کو پلا رہے ہیں یعنی اس میں عشق کے جذبے پیدا کر رہے ہیں۔

۴- میں اپنا سانس سینے ہی میں پگھلا رہا یا گداز کر رہا ہوں کیونکہ میں حرم کا پرندہ ہوں۔ چنانچہ مجھے میری آواز کی گرمی ہی سے پہچانا جا سکتا ہے۔ اپنی اسلامی افکار کی حامل اور پرسوز جذبوں والی شاعری کے حوالے سے یہ کہنا چاہا ہے کہ ان کی شاعری عام ڈگر سے ہٹ کر ہے جس کی تصدیق ان افکار سے ہو سکتی ہے۔

۵- پرانے مرشدوں کی عقل ودانش کی کشتی ٹوٹ گئی۔ وہ شخص بڑا ہی خوش بخت ہے جس نے سمندر/ دریا میں مجھے کشتی بنایا یعنی آج کے علما وحکما اس دور کے مسائل کا حل بتانے سے قاصر ہیں جبکہ میں نے اپنی شاعری میں ایسے افکار پیش کیے ہیں جن کو اپنانے اور ان پر عمل کرنے والا انسان/ قاری اس پر آشوب دور میں ایک کامیاب زندگی بسر کر سکے گا۔

غزل-۵۵

۱- مثلِ شرر ذرّہ را تن بہ تپیدن دہم — تن بہ تپیدن دہم بالِ پریدن دہم
۲- سوزِ نوایم نگر! ریزۂ الماس را — قطرۂ شبنم کنم خوئے چکیدن دہم
۳- چوں زمقام نمود نغمۂ شیریں زنم — نیم شباں صبح را میل دمیدن دہم
۴- یوسفؑ گم گشتہ را باز کشودم نقاب — تا بہ تنک مایگاں ذوقِ خریدن دہم
۵- عشق شکیب آزما خاکِ زخود رفتہ را — چشم ترے دادو من لذت دیدن دہم

۱- میں ذرے کو چنگاری کی طرح تڑپنے یا تن گرم کرنے کا طریقہ دیتا یعنی بتاتا ہوں۔ میں اسے تن گرم کرنے کا انداز سکھاتا/ بتاتا ہوں اور اس طرح اسے اڑنے والے پر دیتا ہوں۔ میں اپنے تعمیری شاعرانہ افکار سے جذبوں سے عاری انسان میں عشق کے جذبوں کی گرمی پیدا کرتا اور اس طرح اسے جہد وعمل کی طرف لا کر اس کی عظمت و بقا کا سامان کرتا ہوں۔

۲- تو ذرا میری نوا کے سوز کو دیکھ' اس پر غور کر تو تجھے پتا چلے گا کہ میں الماس کے ٹکڑے کو شبنم کا قطرہ بناتا ہوں اور اس میں ٹپکنے کی خوخصلت پیدا کرتا ہوں۔ گویا ایک پتھر دل

آدمی بھی اگر میرے شاعرانہ افکار کو پالے، سمجھ لے تو اس میں عشق کا پرسوز جذبہ پیدا ہوگا جس سے وہ دوسروں کو بھی مستفید کرے گا۔

۳- جب میں مقام نمود سے شیریں نغمہ چھیڑتا ہوں تو میں آدھی رات ہی کے وقت صبح کو پھوٹنے یا طلوع ہونے کی رغبت دلاتا ہوں یعنی میری شاعری میں دیئے گئے پیغام کو سن یا پڑھ کر قاری کے دل میں ایسا ولولہ انگیز جذبہ پیدا ہو جاتا ہے جس کی بنا پر وہ کوشش کرتا ہے کہ جس عمل کے لیے مجھے کہا گیا ہے اسے میں التوا میں نہ ڈالوں اور ابھی یا آج ہی کرنے لگوں۔ ویسے مقام موسیقی کی اصطلاح بھی ہے بمعنی سر، راگ۔

۴- میں نے گم شدہ یوسفؑ کا نقاب پھر سے اٹھا دیا ہے تاکہ میں کم حوصلہ یا کم سرمائے والوں میں بھی اس کے خریدنے کا ذوق پیدا کروں۔ قرآنی تلمیح سے استفادہ کرتے ہوئے حضرت یوسفؑ کے واقعہ کے حوالے سے بات کی ہے یعنی جو لوگ حقیقی زندگی کے مقصد سے بہرہ ور نہیں ہیں، میں اپنی شاعری کے ذریعے ان میں یہ ذوق وجذبہ پیدا کروں کہ وہ جہد وعمل سے اس مقصد کو پالیں۔

۵- صبر آزما عشق نے خود کو بھولی ہوئی خاک یعنی اپنے مقصد سے ہٹے ہوئے انسان کو چشم تر سے نوازا جبکہ میں دیکھنے کی لذت دے رہا یا پیدا کر رہا ہوں۔ گویا عشق نے آدمی کو گداز دیا اور میں نے اس وسیلے سے اپنی شاعری میں وہ پیغام دیا جس نے لوگوں میں محبوب حقیقی کو پانے کا ذوق وجذبہ پیدا کیا۔

غزل-۵۶

۱- خودی را مردم آمیزی دلیلِ نارسائی ہا	تو اے دردآشنا بیگانہ شو از آشنائی ہا
۲- بدرگاہِ سلاطیں تا کجا ایں چہرہ سائی ہا	بیاموز از خدائے خویش نازِ کبریائی ہا
۳- محبت از جوانمردی بجائے می رسد روزے	کہ افتد از نگاہش کاروبارِ دل ربائی ہا
۴- چناں پیشِ حریم او کشیدم نغمۂ دردے	کہ دادم محرماں را لذت سوز جدائی ہا
۵- ازاں برخویش می بالم کہ چشم مشتری کوراست	متاعِ عشق نافرسودہ ماند از کم روائی ہا
۶- بیا بر لالہ پا کوبیم و بیباکانہ مے نوشیم	کہ عاشق را خجل کردند خونِ پارسائی ہا
۷- بروں آ از مسلماناں گریز اندر مسلمانی	مسلماناں روا دارند کافر ماجرائی ہا

۱- خودی کا عام لوگوں سے میل ملاپ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی منزل تک رسائی نہیں ہے' لہٰذا اے درد آشنا تو لوگوں کے میل ملاپ سے بیگانہ ہو جا' خود کو دور رکھ۔ خودی سے مراد صاحب خودی ہے۔ اگر وہ عوام میں رہ کر اپنے مقصد سے ہٹ جاتا ہے تو اس کی خودی محض دعویٰ بن جاتی ہے جبکہ خودی سے آگاہ انسان عوام میں رہتے ہوئے بھی خود سے اور خدا یا محبوبِ حقیقی سے غافل نہیں رہتا۔

۲- سلاطین/حکمرانوں کے آستانے پر یا دربار میں تو کب تک چہرہ سائی کرتا رہے گا۔ تو اپنے خدا سے کبریائی کے انداز سیکھ۔ تو نائب خدا ہے' تجھ میں خدائی صفات ہیں۔ اس لیے تو غیروں کا محتاج رہ کر زندگی بسر نہ کر بلکہ اپنی عظمت کا خیال کرتے ہوئے اس قسم کی محتاجی کی زندگی سے بچ۔

۳- محبت اپنی جوانمردی کی بدولت ایک روز ایسے مقام پر پہنچ جائے گی جہاں اس کی نگاہوں سے دلربائی کا کاروبار ہی گر جائے گا یعنی ایک حقیقی عاشق محبوب کے ناز و ادا ہی میں نہیں کھویا رہتا بلکہ اپنے جذبہ صادق کی بنا پر محبوب تک رسائی پالیتا ہے۔ وہ مادیات یا غیر اللہ سے کوئی تعلق نہ رکھنے کے باعث محبوب حقیقی کو پالیتا ہے۔

۴- میں نے اس محبوب کے گھر کے سامنے کچھ اس انداز میں نغمۂ درد الاپا کہ اس سے محرموں کو سوز جدائی کی لذت حاصل ہوگئی۔ مطلب یہ کہ ایک سچے عاشق کو وصل کی نسبت ہجر و فراق میں زیادہ لطف آتا ہے۔ بقول مومنؔ:

مرگ ہے انتہائے شوق یاں رہی ابتدائے عشق
زندگی اپنی ہوگئی رنجشِ بار بار میں

۵- میں اپنے آپ پر اس لیے ناز کر رہا ہوں کہ گاہک کی آنکھ اندھی ہے' چنانچہ عشق کی متاع اس کے عام عمل دخل کی بنا پر بے آبرو نہ ہوئی۔ عشق ایسا سودا ہے جس کا ہر کوئی خریدار نہیں۔ یہ بات عاشق یا عشق کے لیے باعث فخر ہے۔ اگر کوئی عشق کا دعویٰ بھی کرتا ہے اور حرص و ہوس کا بھی شکار ہے تو اس کا یہ دعویٰ حقیقت سے دور ہے۔

۶- تو آ کہ ہم گل لالہ پر رقص کریں اور بے خوف ہو کر شراب نوشی کریں' اس لیے کہ عاشق پر پارسائی کا خون بہانا حلال ہے۔ یہاں پارسائی سے مراد وہ نام نہاد زہد و تقویٰ ہے جو محض دکھاوے کے لیے کیا جاتا ہے اور وہ سچے جذبوں سے خالی ہوتا ہے جبکہ ایک سچا عاشق اس قسم کی پارسائی سے دور رہتا ہے۔

۷- تو مسلمانوں کی صف سے باہر آجا اور صحیح مسلمانی میں داخل ہو جا۔ اس لیے کہ آج کے مسلمان کافروں کے سے طور طریقوں کو جائز سمجھتے ہیں۔ گویا آج کے مسلمان نے اسلامی تعلیمات سے قطع تعلق کر رکھا ہے اور غیر اسلامی شعائر کو اپنائے ہوئے ہے۔ اے مخاطب تو صحیح معنوں میں اسلامی تعلیمات پر عمل کر کے ایک حقیقی مسلمان بن جا۔

غزل-۵۷

۱- چوں چراغ لالہ سوزم در خیابانِ شما | اے جوانانِ عجم جانِ من و جانِ شما

۲- غوطہ ہا زد در ضمیر زندگی اندیشہ ام | تا بدست آوردہ ام افکارِ پنہانِ شما

۳- مہر و مہ دیدم نگاہم برتر از پروین گذشت | ریختم طرح حرم در کافرستان شما

۴- تا سنانش تیز تر گردد فرو پیچید مش | شعلہ آشفتہ بود اندر بیابانِ شما

۵- فکر رنگینم کند نذرِ تہی دستان شرق | پارۂ لعلے کہ دارم از بدخشانِ شما

۶- می رسد مردے کہ زنجیر غلامان بشکند | دیدہ ام از روزنِ دیوارِ زندانِ شما

۷- حلقہ گردِ من زنید اے پیکرانِ آب و گل | آتشے در سینہ دارم از نیاگان شما

۱- اے عجم کے نوجوانو! مجھے اپنی جان کی قسم اور تمہاری جان کی قسم کہ میں تمہارے باغ کی کیاری میں لالہ کی طرح جل رہا ہوں (دوسرے مصرعے کا پہلے ترجمہ ہوگا) لالہ سرخ رنگ کا پھول ہے۔ اس حوالے سے جلنے کی بات کی ہے۔ کہنا یہ چاہا ہے کہ مجھے تمہارے بارے میں ہر لحہ یہ فکر لاحق رہتی ہے کہ خدا کرے تم عشق کے سچے جذبوں سے سرشار ہو کر میدانِ عمل میں کود پڑو۔

۲- میری فکر نے زندگی کے ضمیر میں کئی غوطے لگائے، تب کہیں تمہارے پوشیدہ افکار میرے ہاتھ لگے (میں ان سے آگاہ ہوا ہوں) یعنی میں نے ایک مدت تک اپنی قوم کی نوجوان نسل کے مسائل پر غور کیا ہے جس کے نتیجے میں یہ مسائل اور ان کا حل مجھ پر واضح ہوا ہے۔

۳- میں نے سورج اور چاند کو دیکھا تو میری نگاہ پروین سے بھی آگے بلندی پر نکل گئی۔ میں نے تمہارے کافرستان میں کعبہ کی بنیاد رکھی ہے (اس مسلسل غزل میں جوان نسل ہی مخاطب ہے) یعنی بے حد غور و فکر کے بعد مجھ پر یہ کھلا کہ تم (نوجوانو) اسلام کی راہ سے ہٹ گئے ہو ضروری ہے کہ تم میں اسلامی تعلیمات پر عمل کے جذبے پیدا کیے جائیں۔

۴- اس خاطر کہ اس کی نوک میں اور تیزی پیدا ہو' میں نے اسے (شعلے کو) لپیٹ لیا وہ شعلہ تمہارے بیابان میں بکھرا ہوا تھا (میں نے اسے یک جا کر دیا) یعنی تم نوجوانوں کی سوچ اور فکر و خیال منتشر تھے۔ میں نے انہیں صحیح نقطہ پر لانے کی کوشش کی ہے اور وہ نقطہ ہے اسلام سے پورے طور پر ذہنی اور عملی وابستگی۔

۵- میری رنگین فکر مشرق کے مفلسوں کو ایک ایسے لعل کا ٹکڑا پیش کر رہی ہے جس کا تعلق تمہارے بدخشاں سے ہے۔ اپنی شاعری کے حوالے سے بات کی ہے یعنی میں نے اپنی شاعری میں جو افکار پیش کیے ہیں' اہل مشرق جو ہر لحاظ سے پس ماندہ ہیں اگر وہ ان افکار کو پیش نظر رکھیں اور جہد و عمل کی راہ پر گامزن ہو جائیں تو ان کے مقدر سنور سکتے ہیں اور ان کا شمار ترقی یافتہ قوموں میں ہو سکتا ہے۔

۶- (دوسرا مصرع پہلے) میں نے تمہارے قید خانے کی دیوار کے روشن دان سے دیکھا ہے کہ کوئی ایسا مرد/ دلیر آ رہا ہے جو غلاموں کی زنجیر توڑ ڈالے گا۔ گویا وہ وقت قریب ہے جب تم اہل مشرق آزادی کی دولت سے مالا مال ہو جاؤ گے۔

۷- اے آب و گل کے پیکرو! میرے گرد حلقہ بناؤ' میری صحبت اختیار کرو کیونکہ میرے سینے میں ایک ایسی آگ ہے جو میں نے تمہارے اسلاف سے لی ہے یعنی تم سوز و جذبہ سے عاری جسم والے ہو۔ میری صحبت یا شاعری کو اپنا کر خود میں سوز محبت' حرارت ایمان اور اسلامی تعلیمات پر عمل کا جذبہ پیدا کر کے اپنی بقا کا سامان کرو۔
(بعض کا خیال ہے کہ علامہ نے اس غزل میں ایرانی نوجوانوں سے خطاب کیا ہے۔)

غزل-۵۸

۱- دم مرا صفت بادِ فرودیں کردند	گیاہ را ز سرشکم چو یاسمیں کردند
۲- نمودِ لالۂ صحرا نشیں زخونابم	چنانکہ بادۂ لعلے بساتگیں کردند
۳- بلند بال چنانم کہ بر سپہر بریں	ہزار بار مرا نوریاں کمیں کردند
۴- فروغِ آدمِ خاکی ز تازہ کاری ہاست	مہ و ستارہ کنند آنچہ پیش ازیں کردند
۵- چراغِ خویش برافروختم کہ دست کلیم	دریں زمانہ نہاں زیرِ آستیں کردند
۶- درآ بسجدہ و یاری ز خسرواں مطلب	کہ روزِ فقر نیاگانِ ما چنیں کردند

۱- قدرت نے میرے دم/ سانس کو موسم بہار کی مانند کر دیا اور گھاس کو میرے آنسوؤں سے چنبیلی کے پھول کی طرح بنا دیا۔ اپنی شاعری کے حوالے سے بات کی ہے جس کی تاثیر سے سوئی ہوئی قوم بیدار ہوئی ہے اور انقلابی جذبے اس میں پیدا ہوئے۔

۲- صحرا میں کھلنے والے لالہ کا وجود یا اس کی نمود میرے خالص خون کی آبیاری سے ہے۔ اس لیے کہ میرے بڑے پیالے میں سرخ شراب ڈالی گئی ہے۔ گویا اس دنیا میں جو بھی حسن و دل کشی ہے وہ انسان کی بدولت ہے جو افضل مخلوقات ہے اور کائنات کے سنوارنے میں لگا رہتا ہے۔

۳- میں اتنی بلندیوں پر اڑنے والا ہوں کہ آسمان کی بلندی پر فرشتے ہزار مرتبہ میری گھات میں بیٹھے ہیں لیکن وہ مجھے شکار نہیں کر سکے۔ انسان کے اشرف مخلوقات ہونے کے حوالے سے بات کی ہے یعنی انسان فرشتوں سے بہت افضل و اشرف ہے۔

۴- مٹی سے تخلیق کیے ہوئے انسان کی قدر و اہمیت اس کے نت نئے کارنامے انجام دینے سے ہے۔ چاند اور ستارے تو وہی کچھ کرتے ہیں جو کچھ انہوں نے اس سے پہلے کیا۔ چاند اور ستارے اپنے وقت پر طلوع اور غروب ہوتے ہیں' ان کا یہ انداز ازل سے چلا آ رہا ہے' گویا انسان سے ہٹ کر دوسری مخلوق تقدیر کی پابند ہے جبکہ انسان تسخیر کائنات کر کے اور نت نئی ایجادات وغیرہ اور عمل پیہم سے اپنی زندگی میں عظیم انقلاب لا کر اپنی تقدیر سنوار سکتا ہے۔

۵- میں نے اپنا چراغ جلایا یا روشن کیا' اس لیے کہ آج کے دور میں دست کلیمؑ کو قدرت نے آستین میں کر دیا ہے۔ مطلب یہ کہ معجزات کا زمانہ اب نہیں رہا' اب تو ہمیں اپنے علوم و فنون اور سائنس وغیرہ سے اس کائنات کی تسخیر کا سامان کرنا ہے یا حضور اکرمؐ کی تعلیمات کی روشنی میں ہمیں ایسا کرنا ہے۔

۶- تو اس خالق کے حضور سجدے میں گر جا اور حکمرانوں سے مدد نہ طلب کر۔ اس لیے کہ حاجت و ضرورت کے موقع پر ہمارے بزرگوں نے یہی انداز اختیار کیا تھا یعنی مدد صرف اللہ ہی سے مانگو' نیز بقول علامہ:

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

غزل-۵۹

۱- گذر از آں کہ ندیدست و جز خبر ندہد — سخن دراز کند لذت نظر ندہد

۲- شنیدہ ام سخن شاعر و فقیہ و حکیم — اگرچہ نخل بلند است برگ و بر ندہد

۳- تجلیٔ کہ برو پیر دَیر می نازد — ہزار شب دہد و تاب یک سحر ندہد

۴- ہم از خدا گلہ دارم کہ بر زباں نرسد — متاعِ دل برد و یوسفے بہ بر ندہد

۵- نہ در حرم نہ بہ بت خانہ یابم آں ساقی — کہ شعلہ شعلہ بہ بخشد شرر شرر ندہد

۱- اس عقل سے کنارہ کشی اختیار کر لے جس نے اسے (حقیقت کو) نہیں دیکھا اور جو اس کی خبر کے سوا اور کچھ دینے سے قاصر ہے۔ وہ باتیں تو بڑی لمبی چوڑی کرتی ہے لیکن نظر کی لذت نہیں دیتی یعنی یہ صرف جذبہ عشق ہی ہے جس کی بدولت انسان حقیقت کو دیکھ لیتا یا پالیتا ہے، عقل اس معاملے میں بے بس ہے۔

۲- میں نے شاعر اور فقیہ اور فلسفی کی باتیں سنی ہیں۔ ان کی کیفیت کچھ اس قسم کی ہے کہ درخت تو بڑا بلند ہے لیکن اس میں پھل اور پتے نہیں اگتے۔ گویا ان کی باتیں تو بظاہر عظیم ہوتی ہیں لیکن ان سے نہ تو دل میں کوئی جذبہ پیدا ہوتا ہے اور نہ روح ہی کی تقویت کا کوئی سامان۔

۳- وہ تجلی جس پر زمانے کا یہ بوڑھا فخر و غرور کرتا ہے، وہ ہزاروں راتیں تو دیتی ہے لیکن ایک صبح کی روشنی/ چمک نہیں دیتی۔ غالباً اس سے مراد فلسفی ہے جو اپنی عقل و خرد کے زور پر زندگی کے مسائل کا حل تلاش کرتا ہے لیکن درحقیقت وہ حل کرنے کی بجائے ان میں مزید الجھنیں ہی پیدا کرتا ہے جو گویا تاریکی کی علامت ہے۔

۴- مجھے خدا سے ایسی شکایت/ گلہ ہے کہ جو زبان پر نہیں آتی/ آتا اور وہ یہ کہ وہ دل کی متاع تو لے جاتا ہے لیکن کوئی یوسف پہلو میں نہیں دیتا یعنی اس محبوب حقیقی نے میرا دل تو لے لیا ہے لیکن مجھے اپنے جلوے سے محروم رکھ رہا ہے۔

۵- مجھے نہ تو کعبہ میں اور نہ بت خانے میں کوئی ایسا ساقی مل رہا ہے کہ جو شعلہ شعلہ یعنی کثرت سے شراب پلائے اور شرر شرر شراب نہ دے، یعنی جو بخیلی سے کام نہ لے۔ گویا ایسا فیض رساں جو اپنے فیض سے ہمیں ایک سخی کی طرح نوازے اور اس ضمن میں کنجوسی نہ کرے، آج کے دور میں کہیں نظر نہیں آ رہا۔

غزل-۶۰

۱- دریں صحرا گذر افتاد شاید کاروانے را　　　پس از مدت شنیدم نغمہ ہائے ساربانے را
۲- اگر یک یوسف از زندانِ فرعونے بروں آید　　　بغارت می تواں دادن متاعِ کاروانے

۱- اس صحرا سے شاید کسی قافلے کا گذر ہوا ہے کیونکہ میں نے ایک مدت کے بعد کسی ساربان کے نغمے سنے ہیں۔ صحرا سے مراد مسلمان قوم ہے جسے انگریزوں کی عیاری و مکاری نے گویا زرخیز کھیتی سے صحرا بنا دیا ہے۔ علامہ کے مطابق اب حالات کچھ ایسے نظر آ رہے ہیں کہ جذبوں سے سرشار کچھ لوگ قوم میں پیدا ہو رہے ہیں جو قوم کی قسمت بدل دیں گے اور اس کی عظمت رفتہ کو واپس لانے کا سامان کریں گے۔

۲- اگر کسی فرعون کے قید خانے سے ایک یوسف بھی باہر آ جائے یعنی رہائی پالے تو ایک قافلے کی متاع (اس کے ساز و سامان) کو غارت کیا جا سکتا ہے۔ غالباً یہ مراد ہے کہ ظالم حکمرانوں کے پنجے سے اگر ایک مسلمان کو چھڑانے کے لیے پوری قوم کو جدوجہد یا جہاد کرنا پڑے تو اس میں کوئی قباحت نہ ہوگی۔

غزل-۶۱

۱- ترا ناداں امیدِ غم گساری ہا ز افرنگ است؟　　　دلِ شاہیں نسوزد بہر آں مرغے کہ در چنگ است
۲- پشیماں شو اگر لعلے ز میراثِ پدر خواہی　　　کجا عیشِ بروں آوردنِ لعلے کہ در سنگ است
۳- سخن از بود و نابودِ جہاں با من چہ می گوئی　　　من ایں دانم کہ من ہستم ندانم ایں چہ نیرنگ است
۴- دریں میخانہ ہر مینا ز بیمِ محتسب لرزد　　　مگر یک شیشۂ عاشق کہ از وے لرزہ بر سنگ است
۵- خودی را پردہ می گوئی؟ بگو! من با تو ایں گویم　　　مزن ایں پردہ را چاکے کہ دامانِ نگہ تنگ است
۶- کہن شاخے کہ زیرِ سایہ او پر برآوردی　　　چو بر گش ریخت از وے آشیاں برداشتن ننگ است
۷- غزل آں گو کہ فطرت سازِ خود را پردہ گرداند　　　چہ آید زاں غزل خوانے کہ با فطرت ہم آہنگ است

۱- اے نادان! تجھے اہل یورپ سے اپنے غموں کے بارے میں ہمدردی کی توقع ہے۔ (یاد رکھ) شاہین کا دل ایسے پرندے کے لیے نہیں جلتا جو اس (شاہین) کے پنجے میں ہوتا ہے۔ جس طرح شکاری کو شکار کے تڑپنے پھڑکنے پر رحم نہیں آتا، کچھ ایسی ہی

صورت انگریز حکمرانوں کی ہے، وہ تجھے غموں دکھوں میں دیکھ کر رحم نہیں کھائیں گے بلکہ وہ تیری اسی حالت کو اپنے لیے مفید سمجھیں گے۔

۲- اگر تو اپنے باپ کی میراث (جائیداد) میں سے ایک لعل لینے کا خواہش مند ہے تو اپنی اس خواہش پر پشیمان ہو، اس لیے کہ جو لطف پتھر سے لعل باہر نکالنے میں ہے وہ اور کہاں ہے یعنی باپ کی میراث سے کچھ ملنے پر خوش ہونا کہ کسی محنت اور تگ و دو کے بغیر ہی یہ کچھ مل گیا ہے اچھی بات نہیں۔ حقیقی زندگی اسی میں ہے کہ انسان اپنے زورِ بازو پر بھروسا کرے اور محنت و ہمت سے کام لے کر اپنا مستقبل خود سنوارے۔ تن آسانی اچھی چیز نہیں ہے۔

۳- تو مجھ سے دنیا کے وجود اور عدم کی کیا بات کرتا ہے، میں تو یہ جانتا ہوں کہ میں ہوں، یہ نہیں جانتا کہ یہ کیا تماشا یا عجیب بات ہے۔ گویا جہان کے ہونے یا نہ ہونے پر مجھے سوچنے کی کیا ضرورت ہے جبکہ مجھے یہ علم ہے کہ یہ دنیا میرے ہی وجود کے باعث ہے، میں حقیقت ہوں اور وہ قیاس ہے۔ اگر میں (انسان) نہ ہوتا تو یہ کائنات نہ ہوتی۔

۴- اس مے خانے میں ہر صراحی محتسب کے خوف سے لرزتی ہے (کانپتی ہے) جبکہ اس کے برعکس عاشق کی صراحی ہے جس سے پتھر پر لرزہ طاری ہوتا ہے۔ محتسب شراب کے تمام برتنوں وغیرہ کو توڑ ڈالتا ہے، گویا صراحی اسی خوف کے باعث لرزتی ہے لیکن عاشق کے پیشِ نظر چونکہ صرف محبوب کی ذات ہے اور وہ ہر طرح سے دونوں جہانوں سے بے نیاز ہے، اس لیے وہ ایک بے خوف زندگی بسر کرتا ہے۔

۵- کیا تو خودی کو پردہ کہتا ہے؟ کہہ یا کہتا رہ، میں تو تجھ سے یہ کہتا ہوں کہ اس پردہ میں کوئی چاک نہ ڈال کیونکہ نگاہ کا دامن تنگ ہے یعنی اگر تو خودی کو اپنے اور خدا کے درمیان پردہ سمجھتا ہے تو سمجھتا رہ لیکن میری یہ بات یاد رکھ کہ تو اس حالت میں یہ پردہ پڑا ہی رہنے دے کیونکہ ہٹانے سے وہ تجلی ظاہر ہو گی کہ تیری نظریں جس کی تاب نہ لا سکیں گی۔

۶- وہ پرانی شاخ جس کے سائے میں تو نے پر نکالے ہیں جب اس کے پتے جھڑ گئے تو اس پر سے اپنا گھونسلا اٹھا لینا شرم کی بات ہو گی۔ شاخ سے مراد ملت ہے جس سے وابستگی کی بنا پر فرد کو آسائشیں مہیا ہوئی ہیں۔ اگر آج وہ ملت زوال کا شکار ہے تو اس سے تعلق توڑ لینا کوئی اچھی بات نہیں، ہر صورت میں ملت سے تعلق و رشتہ برقرار رکھنا

ضروری ہے کیونکہ علامہ ہی کے بقول:

ع پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

۷- تو غزل ایسی چھیڑ/ کہہ کہ جسے فطرت اپنے ساز کا پردہ یعنی راگ سمجھے' یا سر بدل لے۔ ایسے غزل خواں سے کیا حاصل جو فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہو یعنی شاعری ایسی ہو جو قاری میں جہد و عمل کا جذبہ و ولولہ پیدا کرے نہ ایسی کہ جو بے عملی' ست الوجودی اور تن آسانی پیدا کرے۔

غزل-۶۲

۱- بگذر از خاور و افسونی افرنگ مشو	کہ نیرزد بجوے ایں ہمہ دیرینہ و نو
۲- چوں پر کاہ کہ در رہ گذر باد افتاد	رفت اسکندر و دارا و قباد و خسرو
۳- زندگی انجمن آرا و نگہدار خود است	اے کہ در قافلہ ای بے ہمہ شو باہمہ رو
۴- تو فروزندہ تر از مہر منیر آمدہ ای	آں چناں زی کہ بہر ذرہ رسانی پرتو
۵- آں نگینے کہ تو باآہرمناں باختہ ای	ہم بجبریل امینے نتواں کرد گرو
۶- از تنک جامی ما میکدہ رسوا گردید	شیشہ ے گیر و حکیمانہ بیاشام و برو

۱- تو مشرق سے گذر جا' اس کا خیال چھوڑ دے اور فرنگیوں/ انگریزوں کے سحر سے مسحور نہ ہو (جادو کا اثر نہ لے) کیونکہ اس پرانے اور نئے کی قیمت دو جو کے برابر نہیں ہے یعنی اہل مشرق کی سادہ تہذیب و معاشرت اور انگریز کی عیاری اور مکاری کی حامل تہذیب و معاشرت جو بظاہر بڑی ٹھاٹھ دار ہے' دونوں تیرے لیے بیکار اور غیر مفید ہیں تو اپنی اسلامی تعلیمات کی حامل تہذیب و معاشرت اختیار کر جو صحیح معنوں میں انسانیت کی علم بردار ہے۔

۲- اسکندر و دارا اور قباد و خسرو جیسے بڑے بڑے بادشاہ اس دنیا سے اس طرح چلے گئے جس طرح راستے میں پڑا ہوا تنکا ہوا سے اڑ جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ یہ دنیا اور انسان فانی ہے۔ اسی طرح دنیاوی عظمت و حکمرانی کو بھی بقا نہیں ہے۔ بقا صرف اللہ کی ذات کو ہے۔ فانی حکمرانوں سے مرعوب مت ہو صرف اس حاکم مطلق کی طرف توجہ رکھ۔

۳- زندگی محفل کو آراستہ کرنے والی اور اپنی محافظ ہے۔ تو جو قافلے میں ہے سب سے

الگ تھلگ رہ اور سب کے ساتھ بھی چل۔ مطلب یہ کہ دوسروں کے ساتھ رہنا بھی انسانی مجبوری ہے کہ انسان ''مدنی بالطبع'' (فطری طور پر مل جل کر رہنے والا) ہے لیکن الگ تھلگ رہنا گویا اپنی خودی کو پیشِ نظر رکھنا یا اس کی حفاظت کرنا ہے کہ حقیقی زندگی یہی ہے۔

۴- تو روشنی دینے والے سورج سے بھی زیادہ روشن ہے۔ اس لیے لازم ہے کہ تو زندگی اس انداز میں بسر کرے کہ تو ہر ذرے کو روشنی پہنچائے یعنی انسان میں ایسی اہلیتیں اور صلاحیتیں ہیں جن سے کام لے کر وہ دوسروں کے مقدر بھی سنوار سکتا یا ان کے تاریک دلوں کو بھی منور کر سکتا ہے۔

۵- وہ نگین جو تو شیطانوں کے پاس ہار چکا ہے اسے تو جبرئیل امین کے پاس بھی گروی نہیں رکھا جا سکتا۔ نگین یعنی انسانی دل جو اگر اپنی اہلیتوں سے پوری طرح آگاہ ہو تو انسان فرشتوں سے افضل ہو جاتا ہے جبکہ بصورتِ دیگر وہ شیطان سے بھی زیادہ برا بن جاتا ہے۔ دل کی اس اہمیت سے آگاہی ضروری ہے۔

۶- ہمارے چھوٹے پیالے کی وجہ سے میخانہ رسوا ہو گیا۔ تو کوئی صراحی پکڑ اور دانش مندوں کی طرح پی اور شراب خانے سے چلا جا۔ مطلب یہ کہ رسوائی اس لحاظ سے کہ دوسروں نے سمجھا شاید میخانے ہی میں شراب کم ہے۔ ایسا نہیں تھا بلکہ اپنے ظرف کی تنگی تھی۔ گویا شریعت اور طریقت کو ہر کوئی اپنے اپنے جذبے اور صدق و صفا کے مطابق اپنا تا یا اس پر عمل پیرا ہوتا ہے۔

غزل-۶۳

۱- جہانِ رنگ و بو پیداتو می گوئی کہ راز است ایں	یکے خود را بتارش زن کہ تو مضراب و ساز است ایں
۲- نگاہِ جلوہ بدمست از صفائے جلوہ می لغزد	تو می گوئی حجاب است ایں نقاب است ایں مجاز است ایں
۳- بیادر کش طناب پردہ ہائے نیلگونش را	کہ مثلِ شعلہ عریاں برنگاہِ پاک باز است ایں
۴- مرا ایں خاکدانِ من ز فردوس بریں خوشتر	مقامِ ذوق و شوق است ایں حریمِ سوز و ساز است ایں
۵- زمانے گم کنم خود را زمانے گم کنم او را	زمانے ہر دو را یابم، چہ راز است ایں، چہ راز است ایں

۱- یہ رنگ اور خوشبو والی دنیا تو ظاہر اور نمایاں ہے لیکن تو کہتا ہے کہ یہ راز ہے تو ذرا یا

کچھ دیر کے لیے خود کو اس کے تاروں پر لگا کیونکہ تو مضراب ہے اور یہ (دنیا) ساز ہے۔ رنگ و بو سے مراد دل کشی ہے لیکن وہ عارضی و فانی ہے۔ مضراب کے بغیر ساز میں آواز پیدا نہیں ہوتی۔ گویا انسان کے وجود کے بغیر اس کائنات کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اگر انسان اپنی معرفت و خودی سے آگاہ ہو جائے تو اس کے لیے یہ کائنات کوئی راز نہیں ہے۔

۲۔ محبوبِ حقیقی کے جلوے میں خوب مست و محو رہنے یا اس کی آرزو رکھنے والی نگاہ جلوے کی چمک سے پھسل جاتی یا لغزش کھا جاتی ہے۔ تو یہ کہتا ہے کہ یہ حجاب ہے، یہ نقاب ہے اور یہ مجاز ہے۔ گویا اس محبوب کا جلوہ تو کائنات کی ہر ہر شے میں نمایاں ہے لیکن ہم ہی میں اس کے دیکھنے یا برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہے اور چونکہ ہم خود شناس اور خدا شناس نہیں ہیں اس لیے اس نمایاں جلوے کو نہیں دیکھ پاتے اور اسے حجاب و نقاب کا نام دیتے ہیں۔ نیز حقیقت کے برعکس اسے ایک موہوم دنیا گردانتے ہیں۔

۳۔ تو آ اور اس دنیا پر پڑے ہوئے اس آسمان کے نیلے پردوں کی رسی کھینچ ڈال، اس لیے کہ وہ پاک باز نگاہ پر شعلے کی طرح عریاں ہے، ظاہر ہے مطلب یہ کہ اگر تو اپنا باطن صاف رکھے تو تیری نگاہ میں وہ گہرائی یا بصیرت ہوگی جس سے تجھ پر واضح ہو جائے گا کہ اس جہان کا وجود ہے اور اپنی معرفت سے آگاہ ہو کر تو اسے تسخیر کر سکتا ہے۔

۴۔ میرے لیے میرا یہ مٹی کا گھر یعنی دنیا فردوسِ بریں سے زیادہ دلکش اور اچھا/اچھی ہے۔ اس لیے کہ یہ دنیا ذوق وشوق کا مقام اور سوز و ساز کا گھر ہے۔ گویا جنت میں انسان ان جذبوں سے محروم رہتا ہے۔ یہاں وہ اپنے جہد و عمل سے اپنی بقا کا سامان کرتا ہے۔

۵۔ کبھی تو میں خود کو گم کر دیتا ہوں اور کبھی اس (خدا) کو گم کر دیتا ہوں اور کبھی میں دونوں کو (خود کو اور خدا کو) پا لیتا ہوں۔ یہ کیا راز ہے؟ یہ کیا راز ہے؟ گویا سالک کبھی تو خدا کی تجلی میں محو ہو کر خود سے بے خبر ہو جاتا ہے اور کبھی وہ اپنی معرفت وخودی میں اس قدر محو ہو جاتا ہے کہ وہ اس محبوب حقیقی سے بے خبر ہو جاتا ہے اور کبھی یہ حالت ہوتی ہے کہ خودی اور خدا دونوں سے مربوط ہوتا ہے۔ یہ کیفیت دراصل کسی سالک کے احوال اور مقامات سے متعلق ہے، جس کی وضاحت کوئی مردِ حق ہی کر سکتا ہے، یہ

عقل کے بس کی بات نہیں ہے۔

غزل-۶۴

۱- از داغِ فراقِ او در دل چمنے دارم — اے لالہ صحرائی با تو سخنے دارم

۲- ایں آہِ جگر سوزے در خلوتِ صحرا بہ — لیکن چہ کنم کارے با انجمنے دارم

۱- اس محبوب کے فراق کے داغ کے باعث میرے دل میں ایک چمن ہے۔ اے صحرا کے لالہ مجھے تجھ سے کچھ کہنا ہے۔ محبوب کے فراق کے باعث دل کے زخموں کو پھول اور اس حوالے سے دل کو چمن کہا ہے۔ لالہ صحرائی سے کچھ کہنے سے مراد ہے کہ میرے یہ پھول (زخم) چمک دمک اور داغ (جو لالہ کے اندر ہوتا ہے) کے لحاظ سے تجھ سے بہتر ہیں۔

۲- یہ جگر سوز آہ صحرا کی تنہائی ہی میں کھینچنا بہتر یا مناسب ہے لیکن کیا کروں کہ مجھے انجمن سے واسطہ پڑا ہوا ہے۔ گویا عشق تو صحرا نوردی کا تقاضا کرتا ہے جبکہ دنیا میں رہتے ہوئے مجھے دنیاوی فرائض بھی ادا کرنے ہوتے ہیں' لہٰذا میں یہیں جلوت میں عشق کے تقاضے پورے کرتا ہوں۔

غزل-۶۵

۱- بہ نگاہِ آشنائے چو درونِ لالہ دیدم — ہمہ ذوق وشوق دیدم ہمہ آہ و نالہ دیدم

۲- بہ بلند و پست عالم تپش حیات پیدا — چہ دمن چہ تل چہ صحرا رم ایں غزالہ دیدم

۳- نہ بہ ماست زندگانی' نہ زماست زندگانی — ہمہ جاست زندگانی' زکجاست زندگانی

۱- جب میں نے نگاہِ آشنا یا واقف کار نگاہ سے گل لالہ کے اندر جھانکا تو مجھے اس میں سراپا ذوق وشوق نظر آیا اور اس میں میں نے سراسر آہ و نالہ ہی دیکھا۔ مطلب یہ کہ کائنات کی ہر ہر شے میں اس کی اپنی نمود اور ذوق وشوق کا ولولہ اور تڑپ موجود ہے۔ اس لحاظ سے کائنات سکون اور ثبات سے دور ہے۔

۲- دنیا کے بلند و پست میں زندگی کی تپش وحرارت نمایاں ہے۔ چنانچہ میں نے کیا وادی'

کیا ٹیلا اور کیا صحرا سب میں اس ہرنی کو دوڑتے یا چوکڑیاں بھرتے دیکھا ہے۔ وہی پہلے شعر والی بات۔ ہرنی سے مراد زندگی ہے۔ مطلب یہ کہ کائنات کی ہر شے اپنے ظہور کے لیے بیقرار اور زندگی کے ولولہ کی حامل ہے۔ یہ سب اس باعث ہے کہ ہر شے میں یا اس کے پس پردہ اس محبوب حقیقی و ازلی کا جلوہ کارفرما ہے۔

۳- زندگی نہ تو ہمارے ساتھ ہے اور نہ زندگی ہم سے ہے۔ زندگی ہر جگہ ہے، لیکن یہ کہاں سے ہے؟ گویا نہ تو زندگی پر ہمیں کوئی اختیار ہے اور نہ ہم نے اسے تخلیق کیا ہے۔ اس کا خالق کون ہے؟ جواب ظاہر ہے کہ اس کا خالق خداوند کریم ہے۔ ارشاد خداوندی ہے کہ جب میں نے خود کو دیکھنا چاہا تو میں نے یہ کائنات پیدا کر دی۔

غزل-۶۶

۱- ایں ہم جہانے آں ہم جہانے — ایں بیکرانے آں بیکرانے

۲- ہر دو خیالے ہر دو گمانے — از شعلۂ من موجِ دخانے

۳- ایں یک دو آنے آں یک دو آنے — من جاودانے، من جاودانے

۴- ایں کم عیارے آں کم عیارے — من پاک جانے نقد روانے

۵- ایں جا مقامے آں جا مقامے — ایں جا زمانے آں جا زمانے

۶- ایں جا چہ کارم آں جا چہ کارم؟ — آہے فغانے آہے فغانے

۷- ایں رہزنِ من آں رہزنِ من — ایں جا زیانے آں جا زیانے

۸- ہر دو فروزم ہر دو بسوزم — ایں آشیانے آں آشیانے

۱- یہ (دنیا) بھی ایک جہان ہے اور وہ دنیا یعنی عقبیٰ بھی ایک جہان ہے۔ یہ بھی (اول الذکر) بیکراں ہے اور وہ (عقبیٰ) بھی بیکراں ہے، دونوں کی وسعت لامحدود ہے۔

۲- دونوں (دنیا و عقبیٰ) ہی خیال ہیں اور دونوں ہی قیاس ہیں۔ دونوں میرے شعلے کے دھوئیں کی لہریں ہیں۔ انسان کی بدولت ان دونوں کا وجود ہے۔ اگر وہ نہ ہوتا تو یہ بھی نہ ہوتیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح شعلہ ہو تو دھواں نکلتا ہے ورنہ نہیں نکلتا۔

۳- یہ دنیا بھی ایک دو پل کی یعنی عارضی ہے اور وہ دنیا بھی ایک دو پل کی ہے۔ میں (یعنی انسان) جاوداں ہوں، میں جاوداں ہوں۔ دونوں دنیائیں عارضی و فانی ہیں جبکہ

انسان اپنی خودی کی معرفت حاصل کر کے جاوداں یعنی صاحب بقا ہو جاتا ہے۔

۴- اس دنیا کی بھی کوئی قدر و اہمیت نہیں ہے اور اس دنیا کی بھی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ میں ایک پاک جان ہوں۔ میں ایک چلتی رہنے والی یعنی کھری نقدی (کھرا سکہ) ہوں۔ دونوں دنیائیں ذوق وشوق' جذبہ عشق اور خودی سے عاری ہیں جبکہ میں نے انہی جذبوں کے طفیل خود کو مادی آلودگیوں سے پاک رکھا ہے اور یوں اپنی بقا کا سامان کیا ہے۔

۵- میں یہاں بھی عارضی طور پر مقیم ہوں اور وہاں بھی میرا مقام وقتی اور عارضی ہی ہوگا۔ یہاں بھی میرا قیام کچھ دیر کے لیے ہے اور وہاں بھی کچھ دیر کے لیے ہے۔ گویا مجھے دونوں جہانوں سے کوئی غرض یا واسطہ نہیں ہے۔ دونوں میں میں بے غرضی اور بے نیازی کے ساتھ اپنی تکمیل اور بقا کی منزل کی طرف گامزن ہوں یا رہوں گا۔

۶- یہاں مجھے کیا کام ہے اور وہاں مجھے کیا کام ہے؟ سوائے اس کے کہ آہ وفغاں بھرنا اور فریادیں کرنا اور بس یعنی جذبہ عشق کے باعث بیقراری سے یہاں بھی میں دو چار ہوں وہاں بھی بیقرار رہوں گا۔

۷- یہ دنیا بھی میری لٹیری ہے اور وہ دنیا بھی میری لٹیری ہے۔ یہاں بھی (میرے لیے) نقصان ہے' وہاں بھی نقصان ہے یعنی دونوں جہان میرے عظیم اور حقیقی مقصود کی راہ میں روڑے اٹکانے والے ہیں یا رکاوٹ ہیں۔

۸- میں دونوں کو روشن/منور کرتا ہوں۔ پھر دونوں کو جلا دیتا ہوں۔ خواہ یہ آشیانہ ٹھکانا ہو' خواہ وہ آشیانہ ہو۔ مطلب یہ کہ میں ان میں رہتا تو ضرور ہوں اور اپنی وقتی ضروریات کی خاطر میرا ان سے تعلق و واسطہ بھی رہتا ہے لیکن میں ان میں بالکل کھو نہیں جاتا۔

غزل-۶۷

۱- بہار آمد نگہ می غلتد اندر آتشِ لالہ   ہزاراں نالہ خیزد از دل پرکالہ پرکالہ

۲- فشاں یک جرعہ برخاکِ چمن از بادۂ لعلے   کہ از بیم خزاں بیگانہ روید نرگس ولالہ

۳- جہانِ رنگ وبودانی ولے دل چیست می دانی؟   مہے کز حلقہ آفاق سازد گردِ خود ہالہ

۱- موسم بہار آ گیا ہے۔ نگاہ لالہ کی آگ کے اندر لوٹ پوٹ ہو رہی ہے، لڑھک رہی ہے۔ میرے اس ٹکڑے ٹکڑے دل سے ہزاروں نالے بلند ہو رہے ہیں۔ لالہ کے اندر سرخ داغ کی بنا پر آگ کہا ہے۔ موسم بہار میں ایک تو دلکش پھول اگتے ہیں دوسرے اس موسم میں ایک عاشق پر جو گذرتی ہے اس کی تصویر کشی کی ہے۔

۲- تو سرخ یا خالص شراب کا ایک گھونٹ چمن کی خاک پر بکھیر/ ڈال دے تاکہ نرگس اور لالہ کے پھول (سبھی پھول) خزاں کے خوف سے بے نیاز ہو کر یعنی خزاں سے بے خوف ہو کر اُگیں۔ یہی مطلب ہوسکتا ہے کہ اگر فطرت (Nature) کی طرف سے نرگس کو اور لالہ کو بادۂ عشق پلا دی جائے تو نرگس کو نگاہ اور لالہ کو دل مل جائے گا، جو ان کے سدا بہار ہونے کا باعث بنے گا۔ اسی طرح انسان عشق کی بدولت دل زندہ اور دیدۂ بیدار حاصل کر کے جاوداں ہو جاتا ہے۔

۳- تجھے اس رنگ و بو کی دنیا کا تو علم ہے لیکن کیا تجھے علم ہے کہ دل کیا چیز ہے؟ دل ایک ایسا چاند ہے جو حلقہ آفاق سے اپنے گرد ہالہ بناتا ہے، گویا تو اس فانی دنیا میں اپنی عمر مزے سے گذارتا ہے۔ تو یہ جان لے کہ دل اس کائنات کا مرکز ہے اور وہ اس لیے کہ اگر دل نہ ہوتا تو جذبہ عشق بھی نہ ہوتا اور یہ جہان جو تخلیق ہوا ہے تو اسی عشق کی بدولت ہوا ہے ورنہ اس کا وجود نہ ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دنیا گویا اس کا طواف کرتی ہے۔

غزل-۶۸

۱- صورت گرے کہ پیکرِ روز و شب آفرید — از نقش این و آں بہ تماشائے خود رسید

۲- صوفی! بروں ز بنگہ تاریک پا بنہ — فطرت متاعِ خویش بسوداگری کشید

۳- صبح و ستارہ و شفق و ماہ و آفتاب — بے پردہ جلوہ ہا بنگاہے تواں خرید

۱- وہ نقاش جس نے دن اور رات کا پیکر تخلیق کیا، وہ اس اور اس نقش سے اپنے نظارہ/ تماشا تک پہنچا ہے۔ خالق کائنات کا ارشاد ہے کہ میں نے چاہا کہ میں خود کو دیکھوں یا پہچانا جاؤں، میں نے یہ کائنات پیدا کر دی۔ چنانچہ کائنات کی ہر ہر شے میں اس کا جلوہ موجود ہے۔

۲- اے صوفی! تو اپنے تاریک حجرے سے باہر نکل اور دیکھ کہ فطرت یا قدرت نے اپنی

متاع سوداگری کے لیے لا رکھی ہے یعنی تو باہر آ کر فطرت کا مطالعہ کر' اس پر غور کر اور دیکھ کہ وہ ہر شے میں جلوہ گر ہے۔ گویا اپنے مطالعہ کے ساتھ ساتھ فطرت کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ حجرے میں بیٹھے صرف ''اللہ ہو'' کرنا کس کام کا؟

۳- صبح اور ستارہ اور شفق اور ماہ و آفتاب کے بے پردہ نظارے کو ایک نگاہ سے خریدا جا سکتا ہے۔ کائنات کی ہر شے انسان کو اپنا نظارہ کرانے کی آرزومند ہے۔ شرط یہ ہے کہ انسان ایسی نگاہ پیدا کرلے جس سے وہ کائنات کی حقیقت کو سمجھ سکے۔

غزل-۶۹

۱- باز ایں عالم دیرینہ جواں می بایست ‏ برگِ کاہش صفت کوہ گراں می بایست
۲- کف خاکے کہ نگاہ ہمہ بیں پیدا کرد ‏ در ضمیرش جگر آلودہ فغاں می بایست
۳- ایں مہ و مہر کہن راہ بجائے نہ برند ‏ انجم تازہ بہ تعمیر جہاں می بایست
۴- ہر نگارے کہ مرا پیش نظر می آید ‏ خوش نگارے است ولے خوشتر ازاں می بایست
۵- گفت یزداں کہ چنیں است و دگر ہیچ مگو ‏ گفت آدم کہ چنیں است و چناں می بایست

۱- اس پرانے یا بوڑھے جہان کو پھر سے جوان ہونا چاہیے۔ اس کی گھاس کا تنکا بھاری پہاڑ کی مانند ہونا چاہیے۔ یہ انقلاب اسی وقت ممکن ہے جب انسان اپنی معرفت و خودی سے آگاہ اور جذبہ عشق حقیقی سے سرشار ہو جائے کیونکہ اسی آگاہی اور سرشاری کی بدولت وہ اس کائنات کو اُجلا اور عظیم بنا سکتا ہے۔

۲- جس مٹی کے بنے انسان نے خود میں ہمہ بیں نگاہ پیدا کرلی' اس کے ضمیر میں جگر کے خون سے آلودہ آہ و فغاں بھی ہونی چاہیے۔ جگر آلودہ فغاں جذبہ عشق کی اور نگاہِ خود بیں گویا راستہ دیکھنے والی عقل کی علامت ہے۔ ایسی عقل (جو عقل بیدار ہے) کے ساتھ عشق بھی راہ چلے تو منزل سے آشنائی ممکن ہے ورنہ عشق کے جذبے سے خالی عقل ادھر ادھر گھوم کے رہ جاتی ہے' بصورتِ دیگر وہ اپنی منزل کو پا لیتی ہے۔

۳- یہ پرانے چاند اور سورج (جو صدیوں سے طلوع و غروب ہو رہے ہیں) کسی منزل پر نہیں پہنچاتے' لہٰذا جہان کی تعمیر کے لیے کوئی نیا ستارہ طلوع ہونا چاہیے یعنی انسانوں کی فلاح و بہبود کے لیے جو نظام صدیوں سے چلے آ رہے ہیں' ان کا کوئی خاطر خواہ

نتیجہ سامنے نہیں آیا۔ اب اس صورتحال کا تقاضا ہے کہ کوئی تعمیری اور اصلاحی نظام لایا جائے اور ایسا نظام قرآن کریم کی تعلیمات پر عمل ہی سے ممکن ہے۔

۴- ہر وہ حسین جو میری نظروں کے سامنے آتا ہے، وہ بے شک اچھا حسین و محبوب ہے لیکن اس سے بھی زیادہ حسین ہونا چاہیے۔ یہ گویا خوب سے خوب تر کی تلاش ہے جو انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ بقول حالیؔ:

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب دیکھیے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں

۵- یزداں/ خدا نے آدم سے فرمایا کہ ایسا ہی ہے اور تو اب کچھ نہ کہہ۔ آدم نے کہا کہ ٹھیک ہے ایسا ہے، ویسا چاہیے یعنی میں (خدا) نے یہ جو جہان تخلیق کیا ہے یہ اسی طرح ٹھیک ہے۔ اس میں تبدیلی کی بات نہ کر۔ آدم کے بقول جیسا میں چاہتا ہوں ویسا ہونا چاہیے۔ اس حوالے سے یہ کہنا مقصود ہے کہ انسان کی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ ایک شے پر قانع نہ رہے اور نت نئی تبدیلیاں لاتا رہے۔ وہی چوتھے شعر والی بات بدل کر کہی ہے۔

غزل-۷۰

۱- لالہ این گلستاں داغِ تمنائے نداشت ۔۔۔ نرگس طناز او چشم تماشائے نداشت
۲- خاک راموجِ نفس بود و دلے پیدا نبود ۔۔۔ زندگانی کاروانے بود و کالائے نداشت
۳- روزگار از ہائے و ہوئے مے کشاں بیگانہ ے ۔۔۔ بادہ در میناش بود و بادہ پیمائے نداشت
۴- برق سینا شکوہ سنج از بے زبانی ہائے شوق ۔۔۔ ہیچ کس در وادی ایمن تقاضائے نداشت
۵- عشق از فریادِ ما ہنگامہ ہا تعمیر کرد ۔۔۔ ورنہ ایں بزم خموشاں ہیچ غوغائے نداشت

۱- اس گلستان کے لالہ میں آرزو کا داغ نہ تھا اور اس کی طناز نرگس (گل نرگس) میں دیکھنے والی آنکھ نہ تھی۔ لالہ کا داغ شاعر کے نزدیک عشق کی علامت ہے۔ نرگس کو آنکھ سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ ''ایں گلستاں'' سے علامہ کی مراد غالباً یہ کائنات ہے جس میں انسان کی تخلیق سے پہلے ایسے جذبوں کا نام ونشاں نہ تھا۔

۲- خاک یعنی آدم میں سانس کی لہر تو تھی لیکن نمایاں یا ظاہر نہ تھی۔ زندگی گویا ایک ایسا

قافلہ تھی جس کے پاس کوئی ساز وسامان نہ تھا۔

۳- زمانہ کا میخانہ مے خواروں کی ہائے و ہو سے بیگانہ تھا۔ شراب اس (زمانے) کی صراحی میں تو تھی لیکن شراب پینے والا کوئی نہ تھا۔

۴- سینا کی بجلی شوق (محبوب حقیقی کے جلوہ کا شوق) کی بے زبانیوں کا شکوہ کر رہی تھی۔ وادی ایمن میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو اس دیدار کا تقاضا کرتا۔

۵- عشق نے ہماری فریاد سے ہنگامے برپا کیے ورنہ اس خاموش بزم میں کوئی شور وغوغا نہ تھا۔ خاموش بزم سے مراد یہ دنیا جس میں کوئی ہنگامے نہ تھے۔ مطلب یہ کہ اس کائنات میں جو رونق و رعنائی پیدا ہوئی وہ انسان اور اس کے جذبہ ہائے عشق کی بدولت پیدا ہوئی، بصورت دیگر یہ ایک بزم خاموش و بے رونق ہوتی۔ موضوع کے لحاظ سے یہ غزل ایک مسلسل غزل بن گئی ہے۔

غزل-۱۷

۱- ہنگامہ را کہ بست دریں دیر دیر پائے؟ زناریانِ او ہمہ نالندہ ہم چونائے

۲- در بنگہ فقیر و بکاشانہ امیر غمہا کہ پشت را بجوانی کند دو تائے

۳- درماں کجا کہ درد بدرماں فزوں شود دانش تمام حیلہ و نیرنگ کیمیائے

۴- بے زورِ سیل کشتی آدم نمی رود ہر دل ہزار عربدہ دارد بہ ناخدائے

۵- ازمن حکایت سفر زندگی مپرس درساختم بدرد و گذشتم غزال سرائے

۶- آمیختم نفس بہ نسیم سحر گہی گشتم دریں چمن بہ گلاں نانہادہ پائے

۷- از کاخ و کو جدا و پریشاں بکاخ و کوے کردم بچشم ماہ تماشائے ایں سرائے

۱- مدتِ دراز سے قائم اس مندر یعنی دنیا میں ہنگامے کس نے برپا کیے۔ اس کے سب زناری بانسری کی طرح نالہ کر رہے، رو رہے ہیں۔ اس دنیا میں تمام لوگ کسی نہ کسی صورت میں غم والم اور اضطراب کا شکار ہیں۔ اس کا علاج فانی بدایونی کے مطابق یہ ہے کہ:

غم بھی گذشتنی ہے خوشی بھی گذشتنی
کر غم کو اختیار کہ گذرے تو غم نہ ہو

اور بقول شاعر:

کچھ دن کٹے ہیں غم میں تو کچھ دن خوشی کے ساتھ
ہوتا رہا مذاق مری زندگی کے ساتھ

جبکہ بقول غالبؔ:

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

۲- خواہ فقیر یعنی مفلس و غریب کی جھونپڑی ہے اور خواہ کسی امیر کا محل، ہر جگہ غم جوانی ہی میں کمر دہری کر دیتے ہیں، غموں سے کوئی بھی انسان محفوظ نہیں ہے۔ پہلے شعر والی بات۔

۳- علاج یا چارہ کہاں ہے کہ درد اور دکھ تو علاج سے اور بھی بڑھ جاتے ہیں، عقل تمام تر حیلہ و شعبدہ اور ایک ایسا جادو ہے جس سے نظر دھوکا کھا جاتی ہے۔ عقل نے زندگی کے غموں دکھوں کو دور کرنے کے لیے جو بھی تدابیر اختیار کی ہیں یا کر رہی ہے سب بیکار اور بے اثر ہیں۔

۴- طوفان کے زور کے بغیر انسان کی کشتی (زندگی کے سمندر میں) نہیں چلتی۔ ہر دل یا ہر انسان کو ملاح کے ساتھ ہزار طرح کے الجھیڑے اور جھگڑے ہیں۔ ناخدا سے مراد ملت کے رہنما و پیشوا ہیں جو مصیبتوں اور دکھوں میں گرفتار اور مسائل میں گھرے ہوئے لوگوں کو ان سے نجات دلانے کا کوئی چارہ نہیں کرتے۔ ''طوفان کے زور'' سے مراد غم والم وغیرہ ہیں۔

۵- تو زندگی کے سفر کی داستان مجھ سے نہ پوچھ۔ میں نے تو درد و غم کے ساتھ نباہ کر لیا اور غزل سرائی کرتے ہوئے گذر گیا یا چلا گیا۔ گویا میں نے ''سر تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے'' پر عمل کیا یعنی تسلیم و رضا اختیار کرتے ہوئے یہ زندگی ہنسی خوشی گذار دی۔

۶- میں نے صبح کے وقت چلنے والی ہوا کے ساتھ اپنے سانس ملا دیئے اور میں اس چمن میں اس طرح گھوما پھرا کہ میں نے پھولوں پر پاؤں نہ رکھے یعنی میں نے زندگی کچھ انداز میں بسر کی ہے کہ میری طرف سے کسی کو تکلیف یا دکھ نہ پہنچے۔ میری زندگی سراپا عجز و نیاز کی حامل رہی ہے۔

۷- میں محل اور گلی سے الگ تھلگ رہا لیکن کاخ و کو میں پریشان رہا۔ میں نے اس سرائے (دنیا) کا نظارہ چاند کی آنکھوں سے کیا یعنی میں نے اس دنیا سے الگ تھلگ رہ کر

زندگی بسر کی اور جس طرح چاند آسمان سے زمین پر روشنی ڈالتا ہے' اسی طرح میں اہل دنیا سے الگ تھلگ رہتے ہوئے بھی ان کے دکھ درد میں شریک رہا اور ان کی خدمت کر کے اپنی خوشی کا سامان کرتا رہا۔

غزل-۷۲

۱- اے لالہ اے چراغِ کہستان و باغ و راغ	در من نگر کہ می دہم از زندگی سراغ
۲- ما رنگِ شوخ و بوے پریشیدہ نیستیم	مائیم آنچہ می رود اندر دل و دماغ
۳- مستی زبادہ می رسد و از ایاغ نیست	ہر چند بادہ رانتواں خورد بے ایاغ
۴- داغے بسینہ سوز کہ اندر شبِ وجود	خود را شناختن نتواں جزبایں چراغ
۵- اے موجِ شعلہ سینہ ببادِ صبا کشاے	شبنم مجو کہ می دہد از سوختن فراغ

۱- اے لالہ' اے کوہستان اور باغ و راغ کے چراغ تو مجھ میں دیکھ/ جھانک تا کہ میں تجھے زندگی کے راز سے آگاہ کروں۔ لالہ کے اندر داغ کو چراغ سے تشبیہ دی ہے اور یہ عشق و عاشقی کی بھی علامت ہے یعنی میں نے اپنے من میں ڈوب کر زندگی یعنی حقیقی زندگی کا سراغ لگایا ہے۔ تو بھی یہ روش اختیار کر ورنہ اس کے بغیر تیری ساری دل کشی اور سرخ رنگ اور داغ بیکار ہیں۔ لالہ کے حوالے سے قاری کو تلقین کی ہے۔ گویا خود سے آشنا نہ کرنے والا عشق محض نام کا عشق ہے۔ اردو میں یوں کہا ہے:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن' اپنا تو بن

۲- ہم کوئی شوخ رنگ اور منتشر یا بکھر کر پھرنے والی خوشبو نہیں ہیں۔ ہم تو وہ ہیں جو کچھ ہمارے دل و دماغ میں ہوتا ہے۔ رنگ اور خوشبو کو فنا ہے' جلد اڑ جاتے ہیں جبکہ عقل اور عشق ایک انسان میں اکٹھے ہو جائیں تو وہ خود آشنا اور خدا آشنا ہو کر جاوداں ہو جاتا ہے' اسے فنا نہیں ہے۔

۳- مستی تو شراب ہی سے پہنچتی یا حاصل ہوتی ہے' جام سے نہیں۔ وہ الگ بات کہ شراب جام کے بغیر نہیں پی جا سکتی۔ شراب' روح کا اور جام' جسم کا استعارہ ہے۔ گویا روح جسم میں ہوگی تو اس کی اہلیتیں اور صلاحیتیں نمایاں ہوں گی ورنہ نہیں۔ گویا دونوں

روح اور جسم کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

۴۔ تو اپنے سینے/ دل میں کوئی داغ روشن کر کیونکہ وجود کی رات میں خود کو اس چراغ کے بغیر پہچانا جا سکتا ہے۔ گویا تو عشق اختیار کر اور یوں اپنی زندگی کی تاریکیوں کو دور کر لے۔ عشق ہی سے تجھ میں خود شناسی پیدا ہوگی جو تیری زندگی کو روشن و منور کر دے گی۔

۵۔ اے شعلے کی لہر تو صبح کی ہوا سے اپنا سینہ کھول۔ شبنم کی تلاش نہ کر کیونکہ وہ جلنے سے فارغ کر دیتی ہے (شعلہ اس سے بجھ جاتا ہے)۔ شعلہ یہاں انسان کا' صبا سے سینہ کھولنا جدوجہد کا اور شبنم کاہلی و تن آسانی کا استعارہ ہے۔ مطلب یہ کہ انسان کی صحیح اور حقیقی زندگی جدوجہد اور پیہم عمل سے بنتی ہے' بصورت دیگر وہ محض ایک چلتی پھرتی لاش یا مٹی کا مادھو ہوتا ہے۔

غزل-۳۷

۱۔ من بندۂ آزادم عشق است امام من	عشق است امام من عقل است غلام من
۲۔ ہنگامۂ ایں محفل از گردشِ جام من	ایں کوکب شام من ایں ماہِ تمام من
۳۔ جاں درعدم آسودہ بے ذوقِ تمنا بود	مستانہ نواہازد در حلقہ دام من
۴۔ اے عالم رنگ و بوایں صحبت ما تا چند	مرگ است دوامِ تو عشق است دوام من
۵۔ پیدا بضمیرم او پنہاں بضمیرم او	این است مقام او دریاب مقام من

۱۔ میں ایک آزاد بندہ ہوں اور عشق میرا پیشوا ہے۔ عشق میرا پیشوا اور عقل میری غلام ہے۔ گویا عشق کے جذبوں سے سرشار انسان مادیات سے بے نیاز ہوتا ہے اور عقل کو عشق سے وابستہ رکھتا ہے' اسے اہمیت نہیں دیتا کیونکہ علامہ ہی کے بقول:

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

۲۔ اس محفل کا ہنگامہ (رونق) میرے جام کی گردش کے باعث ہے۔ یہ میری شام کا ستارہ اور میرا چودھویں کا چاند ہے۔ محفل زندگی کا اور جام دل کا استعارہ ہے۔ ایسا دل جو جذبۂ عشق سے سرشار ہو۔ جس طرح شراب کے پیالے کی گردش سے محفل میں رونق کا سامان ہوتا ہے اسی طرح ایسے دل کی گردش زندگی کی رونق بنتی ہے۔

۳- جان/ روح عدم میں آرزو کے ذوق کے بغیر سکون میں تھی۔ میرے حلقہ دام (جال) میں اس (جان) نے مستانہ نغمے چھیڑے یا مستانہ آوازیں پیدا کیں۔ تخلیق آدم سے پہلے دوسری مخلوق وغیرہ میں زندگی تو تھی لیکن وہ ہنگامے پیدا کرنے سے قاصر تھی۔ تمنا یا آرزو صرف آدم یا انسانی زندگی کو نصیب ہوئی جس کی بنا پر اس دنیا میں ہنگامے برپا ہیں۔

۴- اے رنگ و بو کے عالم/ جہان ہماری آپس کی یہ صحبت (مل بیٹھنا) کب تک برقرار رہے گی' اس لیے کہ تیرا دوام تو موت ہے جبکہ میرا (یعنی انسان کا) دوام عشق ہے۔ اس صورت میں یہ ملاپ تا چند؟ رنگ و بو کی دنیا کو آخر فنا ہے جبکہ انسان جذبہ عشق سے سرشار ہونے کے باعث اپنی زندگی کی بقا کا سامان کر لیتا ہے۔

۵- وہ میرے ضمیر میں ظاہر بھی ہے اور میرے ضمیر میں پوشیدہ بھی ہے۔ یہ تو ہے اس کا مقام' اب تو میرا مقام سمجھ کہ وہ کیا ہے؟ یعنی سب کچھ وہی ذاتِ اقدس ہے' اس صورت میں میری یا انسان کی کیا حیثیت ہو سکتی ہے۔ گویا جب میرے (انسان کے) اندر اور باہر وہی ذات سمائی ہوئی ہے تو خدائی صفات کا مظہر ہونے کے باعث میں بھی تو وہی ہوں گا۔ علامہ نے اس شعر میں وجودی توحید کے عالموں کے نظریہ کے حوالے سے یہ بات کی ہے۔

غزل-۴۷

۱- کم سخن غنچہ کہ در پردۂ دل رازے داشت در ہجوم گل و ریحاں غم دم سازے داشت

۲- محرمے خواست ز مرغِ چمن و بادِ بہار تکیہ بر صحبت آں کرد کہ پروازے داشت

۱- وہ نہ بولنے والی کلی' جس کے دل میں کوئی راز تھا' اسے گل و ریحان کے ہجوم میں (ان کی محفل میں) کسی دوست یا غمگسار کا غم تھا۔ گویا کسی غم گسار کے ملنے کی آرزو پوری نہ ہونے کے باعث اس پر خاموشی طاری تھی۔ علامہ نے صنعت حسن تعلیل سے استفادہ کیا ہے۔ کلی تو خاموش ہی ہوتی ہے لیکن اس کا باعث ''غم دمساز'' ظاہر کیا ہے۔

۲- اس (کلی) نے چمن کے پرندے اور بہار کی ہوا سے اپنا محرم چاہا' انہیں اپنا دوست سمجھ لیا۔ اس طرح اس نے ان کی صحبت پر بھروسا کیا جو اڑنا جانتے تھے۔ گویا خزاں

کی آمد پر نہ تو وہ پرندہ (بلبل) رہا (کہیں اور اڑ گیا) اور نہ وہ بہار کی ہوا ہی رہی۔ یوں کلی کو احساس ہوا کہ وہ جن کی صحبت میں پھول بننے کی آرزومند تھی وہ تو اس کا ساتھ ہی چھوڑ گئے۔ اس استعارے سے یہ کہنا مقصود ہے کہ اس فانی دنیا کو دل لگانے کی جگہ نہ سمجھا جائے بلکہ یہ محض زندگی گذارنے کی جگہ ہے۔

غزل-۷۵

ا-	خود رائنم سجودے، دیر و حرم نماندہ	ایں در عرب نماندہ آں در عجم نماندہ
۲-	در برگِ لالہ وگل آں رنگ ونم نماندہ	در نالہ ہائے مرغاں آں زیر و بم نماندہ
۳-	درکار گاہِ گیتی نقش نوی نہ بینم	شاید کہ نقش دیگر اندر عدم نماندہ
۴-	سیارہ ہائے گردوں بے ذوقِ انقلابے	شاید کہ روز وشب را توفیق رم نماندہ
۵-	بے منزل آرمیدند پا از طلب کشیدند	شاید کہ خاکیاں را در سینہ دم نماندہ
۶-	یادر بیاضِ امکاں یک برگِ سادہ ے نیست	یا خامۂ قضارا تاب رقم نماندہ

ا- میں خود کو یا اپنے آپ کو سجدہ کرتا ہوں کیونکہ اب مندر اور مسجد (کعبہ) باقی نہیں رہے۔ یہ (کعبہ) عرب میں نہیں رہا اور وہ (مندر) عجم میں نہیں رہا۔ گویا عرب اور عجم میں کوئی ایسی ہستی نظر نہیں آرہی جو اس قابل ہو کہ اس کی پیروی کی جائے۔ اس صورتِ حال میں سوائے اس کے کہ میں اپنے ضمیر کی بات مانوں یا اپنے بزرگوں کے اعمال کو پیش نظر رکھوں اور ان کی پیروی کروں اور کیا کیا جا سکتا ہے۔

۲- لالہ وگل کی پتیوں میں وہ پہلے والا رنگ اور تازگی/نمی رہی۔ اسی طرح پرندوں کے نالوں یا ان کی فریادوں (چہچہوں) میں وہ پہلے والے زیر و بم نہیں رہے یعنی اس دور میں انگریز کی تہذیب کے باعث جو عیاری و مکاری کی حامل ہے نہ تو وہ پہلے والا انسانیت والا ماحول ہی رہا ہے اور نہ انسانوں میں اپنی قدر و قیمت اور اہمیت ہی کا کوئی احساس رہا ہے۔

۳- مجھے زمانے کے کارخانے میں یعنی اس کائنات میں کوئی نیا نقش نظر نہیں آرہا۔ شاید عدم میں کوئی دوسرا نقش ہی نہیں رہا۔ غالباً یہ کہنا چاہا ہے کہ کوئی ایسا انقلاب آتا نظر نہیں آرہا جس سے موجودہ دور کے شیطانی نظریات و افکار وغیرہ پورے طور پر ختم ہو

جائیں اور تعمیری اور انسان دوستی کے حامل افکار و نظریات ان کی جگہ لے لیں۔

۴۔ آسمان پر گردش کرنے والے ستارے کسی انقلاب کے ذوق سے محروم ہیں۔ شاید روز اور شب میں دوڑ نے یا حرکت کرنے کی توفیق نہیں رہی۔ اس استعارے سے یہ مقصود ہے کہ آج کے انسان یورپی تہذیب و ثقافت کی خباثتوں کے باعث گویا تاریکی میں زندگی گذار رہے ہیں۔ حالات کچھ ایسے نظر آ رہے ہیں کہ یہ تاریکی شاید ہی چھٹے۔ دوسرے لفظوں میں کسی مردِ حق کے آنے کی توقع نہیں رہی جو انقلاب برپا کر کے یہ خرابیاں دور کرتا۔

۵۔ انسانوں نے منزل کا خیال کیے بغیر آرام کیا یا سوئے رہے اور انہوں نے منزل کی طلب یا منزل تک پہنچنے کی خواہش میں کوئی قدم نہ اٹھایا۔ شاید ان کے سینے میں دم نہیں رہا یعنی وہ اپنی تخلیق کا مقصد تسخیر کائنات' خود شناسی' خدا شناسی اور حقیقی زندگی اور بقا کے لیے جہد و عمل کے جذبوں سے سرشار ہونا' بھول چکے ہیں۔ اپنی اس کوتاہی و خامی اور تن آسانی کے باعث وہ محض چلتی پھرتی لاش رہ گئے ہیں۔

۶۔ یا تو امکاں کی بیاض میں کوئی سادہ ورق نہیں رہا یا پھر قضا و قدر کے قلم میں لکھنے کی طاقت نہیں رہی۔ گویا ممکنات کے ظاہر ہونے کا وقت نہیں رہا اور اب سکوت یا جمود ہی رہے گا یا پھر قدرت کی رضا ایسی ہوگی کہ کوئی انقلاب نہ آئے۔ دوسرے لفظوں میں انسان اپنی بے حسی اور شیطانی یورپی تہذیب و ثقافت وغیرہ سے متاثر ہونے کے باعث اپنے مقصد تخلیق اور مقام کو فراموش کر چکے ہیں جب تک وہ اس مقصد و مقام کی طرف نہیں آتے' قدرت بھی انہیں تاریکیوں سے نہیں نکالے گی۔ سورۂ بنی اسرائیل' آیت 16 کا ترجمہ حالیؒ نے یوں کیا ہے:

کسی قوم کا جب الٹتا ہے دفتر
تو مسخ اس میں ہوتے ہیں پہلے توانگر

اگرچہ اس آیت میں توانگر کے حوالے سے بات ہوئی ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ انسانوں کی مذکورہ زندگی خود ان کی اپنی تباہی کا باعث بنتی ہے۔ ایک اور جگہ ارشاد ربانی ہے کہ جتنا کچھ تم کرو گے (یعنی عمل) اسی کے مطابق تمہیں ملے گا۔ تو جب انسان خود ہی بے عملی اور بے حسی کا شکار ہو جائے تو قدرت بھی اس پر توجہ نہیں دے گی۔

گلشن رازِ جدید

۱۔ بہ سوادِ دیدۂ تو نظر آفریدہ ام من   بہ ضمیر تو جہانے دگر آفریدہ ام من

۲۔ ہمہ خاوراں بخوابے کہ نہاں زچشم انجم   بہ سرودِ زندگانی سحر آفریدہ ام من

۱۔ (قاری سے خطاب ہے) میں نے تیری آنکھوں کی پتلی میں نظر پیدا کی ہے اور تیرے ضمیر میں نیا جہان پیدا کر دیا ہے یعنی میں نے اپنی شاعری سے تجھ میں ایسی صلاحیتیں پیدا کی ہیں جن کی بدولت تو حق و باطل میں تمیز کر سکتا ہے اور اپنے نفع یا نقصان سے آگاہ ہو سکتا ہے۔

۲۔ تمام مشرق یعنی اسلامی ممالک غفلت کی نیند میں کھوئے ہوئے ہیں جبکہ میں نے ستاروں کی آنکھوں سے چھپ کر زندگی (حقیقی زندگی) کے نغمے الاپنے سے صبح پیدا کر دی ہے یعنی اہل مشرق کی مخالف قوتوں سے بے خوف ہو کر اپنی شاعری کے ذریعے اہل مشرق کو اس غفلت سے بیدار کیا اور ان میں ایسے جذبے اور ولولے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جن سے وہ اپنی شام یا پسماندگی کو دور کر کے ترقی و استحکام کی راہ پر گامزن ہوں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گلشن راز جدید

تمہید

۱- زجانِ خاور آں سوزِ کہن رفت — دمش واماندو جانِ او زتن رفت

۲- چو تصویرے کہ بے تارِ نفس زیست — نمی داند کہ ذوقِ زندگی چیست؟

۳- دلش از مدعا بیگانہ گردید — نے او از نوا بیگانہ گردید

۴- بطرزِ دیگر از مقصود گفتم — جواب نامہ محمود گفتم

۵- زعہد شیخ تا ایں روزگارے — نزد مردے بجانِ ما شرارے

۶- کفن در بر بخا کے آرمیدیم — ولے یک فتنۂ محشر ندیدیم

۷- گذشت از پیش آں دانائے تبریز — قیامت ہا کہ رست از کشت چنگیز

۸- نگاہم انقلابے دیگرے دید — طلوعِ آفتابے دیگرے دید

۹- کشودم از رخِ معنی نقابے — بدست ذرہ دادم آفتابے

۱- مشرق کی جان سے وہ پرانا سوز ختم ہو گیا۔ اس کا دم (سانس) پھول گیا اور اس کی جان جسم سے نکل گئی یعنی مشرق کے مسلمان اپنے پرانے جوش اور ولولے بھلا بیٹھے اور بری طرح غفلت کا شکار ہو چکے ہیں۔ اس طرح وہ محض چلتی پھرتی لاش کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔

۲- ان (اہل مشرق) کی حالت اس تصویر کی سی ہے جو سانس کے تار کے بغیر زندہ رہی۔ اسے (انہیں) یہ علم ہی نہیں کہ ذوقِ زندگی کیا ہے؟ حقیقی زندگی جذبوں اور جہد و عمل سے بنتی ہے لیکن یہ مسلمان اس زندگی کی لذت ہی سے بے خبر اور محروم ہو چکے ہیں۔ تصویر کے حوالے سے وہی چلتی پھرتی لاش والی بات۔

۳- ان مسلمانوں کا دل آرزو ہی سے بیگانہ یا محروم ہو چکا ہے۔ ان کی بانسری نغمہ اور سر سے بیگانہ ہو چکی ہے۔ جب انسان کے دل میں کوئی عظیم آرزو ہوگی تو وہ اس کے حصول کے لیے جدوجہد کرے گا اور یوں اپنی بقا کا سامان کرلے گا لیکن بدقسمتی سے مسلمان اس سے محروم ہو چکا ہے۔

۴- میں نے ایک اور انداز میں اپنا مقصد و مدعا بیان کیا ہے اور محمود شبستری کے خط یعنی ان کی مثنوی ''گلشن راز'' کا جواب نئے انداز میں لکھا ہے۔

۵- شیخ (محمود شبستری) کے زمانے سے لے کر آج تک کسی بھی مرد نے ہماری جان پر کوئی چنگاری نہیں پھینکی۔ گویا گلشن راز نے مجھ میں عشق کا سوز و جذبہ پیدا کیا۔ اس سے پہلے کسی کے بھی کلام نے مجھ کو متاثر نہیں کیا۔

۶- ہم (مسلمان) پہلو میں کفن لیے ہوئے مٹی میں سوئے رہے لیکن ہم نے قیامت کا ایک فتنہ بھی نہ دیکھا۔ گویا ہماری زندگی مُردوں کی سی رہی اور ہم چلتی پھرتی لاش کی مانند ہونے کے باعث اپنی زندگی میں کوئی انقلاب نہ لا سکے اور نہ کوئی ہنگامہ و محشر ہی برپا کر سکے۔

۷- تبریز کے اس دانا (شیخ محمود شبستری) کے سامنے تو وہ قیامتیں برپا ہوئیں جو چنگیز کی کھیتی سے اُگیں، یعنی اس نے برپا کیں (فرہنگ دیکھیے)

۸- میری نگاہوں نے ایک اور طرح کا انقلاب دیکھا ہے' ایک اور طرح کا سورج طلوع ہوتے دیکھا ہے۔ محمود شبستری نے چنگیزی قیامت دیکھی تھی جبکہ میں نے یورپ والوں کی تہذیب و ثقافت' سیاسی اور فکری و اقتصادی یلغار کے نتیجے میں ہم اہل مشرق کو پہنچنے والی تباہی دیکھی ہے۔ اس پس منظر کے حوالے سے غالباً یہ کہنا چاہا ہے کہ اپنی شاعری کے ذریعے اس تاریکی کو دور کرنے کے لیے میں نے انقلاب کا سورج طلوع کیا ہے تاکہ مسلمان بیدار ہو کر اپنی سابقہ عظمت و سربلندی کا سامان کریں۔

۹- میں نے معنی (حقیقت) کے چہرے سے نقاب ہٹا دیا ہے اور ذرے کے ہاتھوں میں سورج تھما دیا یعنی میں نے اپنی شاعری میں دیئے گئے پیغام سے عوام کو حقیقت حال سے باخبر کر کے ان کی کمزوری اور مایوسیوں کو دور کیا اور یوں ان میں قوت اور جوش و جذبہ پیدا کرنے کا سامان کیا ہے۔

۱۰- نہ پنداری کہ من بے بادہ مستم مثالِ شاعراں افسانہ بستم

۱۱- نہ بینی خیر ازاں مردِ فرو دست | کہ برمن تہمت شعر و سخن بست
۱۲- بکوے دلبراں کارے ندارم | دلِ زارے غم یارے ندارم
۱۳- نہ خاکِ من غبار رہگذارے | نہ در خاکم دل بے اختیارے
۱۴- بجبریل امیں ہم داستانم | رقیب و قاصدو درباں ندانم
۱۵- مرا با فقر سامانِ کلیم است | فر شاہنشہی زیر گلیم است
۱۶- اگر خاکم بصحرائے نہ گنجم | اگر آبم بدریاے نہ گنجم
۱۷- دل سنگ از زجاج من بلرزد | یم افکار من ساحل نہ ورزد
۱۸- نہاں تقدیر ہا در پردۂ من | قیامت ہا بغل پروردۂ من
۱۹- دمے درخویشتن خلوت گزیدم | جہانے لازوالے آفریدم
۲۰- مرا زیں شاعری خود عار ناید | کہ در صد قرن یک عطاؔر ناید

۱۰- تو کہیں یہ نہ سمجھنا کہ میں شراب پیے بغیر مست ہوں اور میں نے عام شعرا کی طرح من گھڑت کہانیاں لکھی ہیں۔ مطلب یہ کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ اپنی قلبی واردات کے مطابق کہتا ہوں اور حقیقت کی نشاندہی کرتا ہوں۔

۱۱- تو اس گھٹیا یا پست فطرت انسان سے خیر نہیں دیکھے گا جس نے مجھ پر شعر وسخن کی تہمت لگائی ہے، میں نے تفریح خاطر کے لیے شاعری نہیں کی بلکہ اسے قوم میں بیداری اور جذبہ جُہد وعمل پیدا کرنے کے پیغام کا ذریعہ بنایا ہے۔ اس لیے مجھے عام شاعر سمجھنا گھٹیا پن کی علامت ہوگی۔

۱۲- مجھے حسینوں یا محبوبوں کے کوچے سے کوئی سروکار نہیں اور نہ میں دلِ زار رکھتا ہوں اور نہ کسی محبوب کا مجھے کوئی غم ہے۔ عام شاعری میں اسی قسم کے مضمون ہوتے ہیں، میری شاعری میں یہ باتیں نہیں ہیں۔ غالب کہتا ہے:

پھر پرسش جراحت دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے

حفیظ ہوشیار پوری:

زمانے بھر کے غم اور اِک ترا غم
یہ غم ہوگا تو کتنے غم نہ ہوں گے

غالبؔ ہی کے بقول:

غم فراق میں تکلیف سیر گل مت دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

نیز غالبؔ:

کیوں اندھیری ہے شب غم ہے بلاؤں کا نزول
آج ادھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا

۱۳- نہ تو میری خاک کسی راہ گذار کی گرد ہے اور نہ میری خاک (جسم) میں بے اختیار دل ہے۔ یہ بھی عام شاعری کے مضامین ہیں، مثلاً مومن خان مومنؔ:

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

غالبؔ:

پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال
دل گم گشتہ مگر یاد آیا

۱۴- میں (علامہ) تو جبرئیل امیں کا ہم زبان ہوں یعنی میں عام شاعروں کی طرح زمینی موضوعات و مضامین شعروں میں نہیں لاتا بلکہ عرشی سطح پر بات کرتا ہوں، اسی لیے میں رقیب، قاصدوں اور دربان کو نہیں جانتا۔ دوسرے مصرعے میں عام شاعری کے مضامین کی بات کی ہے۔ بقول غالبؔ:

تمہاری طرز و روش جانتے ہیں ہم کیا ہے
رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے
بیم رقیب سے نہیں کرتے وداع ہوش
مجبوریاں تلک ہوئے اے اختیار حیف
ع میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

غالبؔ:

قاصد کے آتے آتے میں خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

نیز غالبؔ:

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں

سر زیر بار منت درباں کیے ہوئے
دل ہی تو ہے سیاست درباں سے ڈر گیا
میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کیے

۱۵- میری شاعری میں فقر حضرت موسیٰ کلیم اللہ کی سی شان کے ساز و سامان کے ساتھ موجود ہے اور شہنشاہی شان و شوکت بوریا کے نیچے ہے یعنی اگر تو میرے شاعرانہ پیغام پر عمل پیرا ہوگا تو تجھ میں حضرت موسیٰ کی طرح خدا سے ہم کلامی کا فقر پیدا ہوگا جس کے نتیجے میں تیرے بوریا کے سامنے حکمرانوں پر لرزہ طاری ہوگا۔

۱۶- اگر میں خاک ہوں تو میں کسی صحرا میں نہیں سماتا اور اگر میں پانی ہوں تو کسی سمندر/دریا میں نہیں سماتا۔ دونوں صورتوں میں اپنے افکار کی وسعت بیان کی ہے۔

۱۷- پتھر کا دل میرے شیشے سے لرزتا ہے۔ میرے افکار کا سمندر ساحل اختیار نہیں کرتا (وہی وسیع افکار والی بات)

۱۸- تقدیریں میرے پردے میں پوشیدہ ہیں جبکہ قیامتیں میری آغوش کی پالی ہوئی ہیں یعنی میری شاعری پر عمل سے قاری اپنی تقدیر بدل سکتا ہے اور وہ (شاعری) عظیم انقلابات اور ہنگامے پیدا کرنے والی ہے۔

۱۹- میں نے کچھ دیر کے لیے اپنے آپ میں خلوت اختیار کی اور اس طرح ایک لازوال جہان پیدا کر لیا۔ میں نے اپنے من میں ڈوب کر جو افکار تخلیق کیے اپنی شاعری میں انہی کا اظہار کر رہا ہوں۔

۲۰- مجھے اس قسم کی خاص شاعری (جو عام ڈگر کی شاعری سے ہٹ کر ہے) سے کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ عطار جیسا بزرگ صوفی شاعر صدیوں کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ بقول علامہ:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

(شعر نمبر ۲۰ محمود شبستری کا ہے)

۲۱- بجانم رزم مرگ و زندگانی است نگاہم برحیاتِ جاودانی است
۲۲- زجاں خاک ترا بیگانہ دیدم باندام تو جانِ خود دمیدم
۲۳- ازاں نارے کہ دارم داغ داغم شب خود را بیفروز از چراغم

۲۴- بخاک من دلے چوں دانہ کشتند بلوحِ من خطِ دیگر نوشتند
۲۵- مرا ذوقِ خودی چوں انگبین است چہ گویم وارداتِ من ہمین است
۲۶- نخستیں کیف او را آزمودم دگر بر خاوراں قسمت نمودم

۲۱- میری جان میں موت اور زندگی کی جنگ رہتی ہے جبکہ میری نگاہ حیاتِ جاوداں پر لگی ہوئی ہے۔ میں ایسے افکار شاعری میں پیش کرتا ہوں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ زندگی اور موت کیا ہے اور کیونکر جہد و عمل سے اپنی بقا یا حیاتِ جاوداں کا سامان کیا جا سکتا ہے۔

۲۲- میں نے تیری خاک (جسم کو) روح سے بیگانہ پایا' لہٰذا میں نے تیرے جسم میں اپنی جان پیدا کر دی یعنی تجھ (ملت اسلامیہ یا فردِ ملت) میں حقیقی زندگی کے کوئی آثار نظر نہ آنے پر میں نے اپنی شاعری کے ذریعے تجھ میں حقیقی زندگی کا احساس پیدا کیا۔ اپنی جان سے مراد ایسی شاعری جو خونِ جگر پینے سے تخلیق ہوئی۔ بقولِ حالیؔ:

خشک سیروں تن شاعر میں لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اک مصرعِ تر کی صورت

۲۳- وہ آگ جو مجھ میں ہے اس سے میں سراپا داغ ہوں' تو اپنی رات کو میرے چراغ سے روشن کر یعنی میرے پر سوز جذبوں کی حامل شاعری کو اپنا کر اپنی ذلتیں اور خامیاں وغیرہ دور کر لے اور اس طرح عظمت و سربلندی حاصل کرے۔

۲۴- قدرت نے میرے جسم میں دل کو ایک بیج کی طرح بویا اور میری تختی پر ایک نئے انداز کا خط تحریر کیا ہے۔ قدرت نے مجھے ایک زندہ و بیدار دل سے نوازا جس کی بنا پر میری زندگی عام ڈگر کی زندگی سے ہٹ کر ہے۔

۲۵- میرے لیے خودی کا ذوق شہد کی مانند ہے۔ میں کیا کہوں کہ میری واردات قلبی ہی ایسی ہے یعنی میں خودی کی لذت میں اس قدر کھویا ہوا ہوں یا محو ہوں کہ اس کے علاوہ میں اپنی شاعری میں اور کچھ بیان نہیں کر سکتا (میری آرزو ہے کہ تجھے بھی اس لذت سے آشنا کر دوں)

۲۶- میں نے پہلے اس (خودی) کے لطف و سرور کو آزمایا اس کے بعد اس (لطف و سرور) کو مشرق یعنی اہل مشرق (مسلمان) میں تقسیم کر دیا' بانٹ دیا یعنی وہ اس سے آگاہ ہو کر اپنی بقا کا سامان کریں۔

۲۷- اگر ایں نامہ را جبریل خواند — چوں گرد آں نورِ ناب از خود فشاند
۲۸- بنالد از مقام و منزل خویش — بہ یزداں گوید از حالِ دلِ خویش
۲۹- تجلی راچناں عریاں نخواہم — نخواہم جز غمِ پنہاں نخواہم
۳۰- گذشتم از وصالِ جاودانے — کہ بینم لذتِ آہ و فغانے
۳۱- مرا نازو نیازِ آدمے دہ — بجانِ من گدازِ آدمے دہ

۲۷- اگر یہ خط (مراد گلشن راز جدید) جبرئیل فرشتہ پڑھ لے تو وہ اپنے خالص نور کو خود سے یوں جھاڑ دے جیسے گرد جھاڑی جاتی ہے۔ مطلب یہ کہ جذبہ عشق صرف مٹی کے بنے انسان میں ہوتا ہے۔ یہ ایسا جذبہ ہے کہ جبرئیل جیسے فرشتے بھی یہ خواہش کریں گے کہ ان کا جسم بھی مٹی کا ہوتا کہ وہ بھی اس جذبہ سے سرشار ہوسکیں۔

۲۸- وہ (جبرئیل) یہ نامہ پڑھ کر اپنے نورانی مقام و مرتبہ اور عرشی ٹھکانے پر رونے لگے اور خدا سے اپنا حالِ دل بیان کرنے لگے (حال دل اگلے شعروں میں بیان ہوا ہے)

۲۹- میں (جبرئیل) اے خدا! تیری تجلی کو اس قدر واضح یا بالکل سامنے نہیں دیکھنا چاہتا۔ میں تو پوشیدہ غم (جو دل میں ہوتا ہے) کے سوا اور کچھ نہیں چاہتا۔ گویا ہر وقت تجھ محبوبِ حقیقی کے سامنے ہونے کے باعث میں سوز و گداز کی لذت سے محروم ہوں۔ یہ سوز و گداز تو تیرے فراق ہی کے باعث پیدا ہوسکتا ہے یعنی تو مجھے بھی انسانوں کی طرح مٹی کا بنا دے تاکہ میں بھی تیرے عشق کی لذت اور فراق کے غم سے باخبر رہوں اور یوں میری زندگی سراپا سوز و گداز کی حامل ہو جائے۔

۳۰- میں ہمیشہ ہمیشہ کے وصل سے گذر گیا یعنی میں اسے چھوڑتا ہوں تاکہ میں آہ و فغاں کی لذت پاسکوں جو تیرے ہجر میں مجھے ملے گی۔

۳۱- مجھے تو آدمی کا سا ناز و نیاز عطا کر اور میری جان میں آدمی کا سا سوز و گداز پیدا کر یعنی جس طرح آدمی اپنے عاشق ہونے پر ناز کرتا اور محبوب کے حضور سراپا عجز و نیاز بنا ہوتا ہے تو مجھے بھی اس جذبے اور حالت کا حامل بنا دے۔ اس حصے میں علامہ نے دراصل جبرئیل کے حوالے سے جذبہ عشق اور سوز و گداز کی اہمیت و قدر بیان کی ہے جس سے فرشتے اور دوسری مخلوق محروم ہے۔

سوال (ا)

۱- نخست از فکر خویشم در تحیر | چہ چیز است آنکہ گویندش تفکر
۲- کدا میں فکر مارا شرطِ راہ است | چرا گہ طاعت و گاہے گنہ است

۱- پہلی بات تو یہ ہے کہ میں اپنی فکر کے بارے میں حیرت زدہ ہوں۔ وہ جسے ''تفکر'' کہتے ہیں' وہ کیا چیز ہے؟

۲- ہمارے لیے کون سی فکر راہ چلنے یعنی سلوک و معرفت کا راستہ طے کرنے کے لیے ضروری یا لازمی ہے اور یہ کہ یہ بھی ذرا واضح کر دیں کہ یہ فکر کیوں کبھی تو طاعت و عبادت ہے اور کبھی گناہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے؟

جواب

۱- درونِ سینۂ آدم چہ نور است | چہ نور است ایں کہ غیب او حضور است
۲- من او را ثابتِ سیار دیدم | من او را نور دیدم نار دیدم
۳- گہے نارش ز برہان و دلیل است | گہے نورش ز جانِ جبرئیل است
۴- چہ نورے جاں فروزے سینہ تابے | نیرزد با شعاعش آفتابے
۵- بخاک آلودہ و پاک از مکان است | بہ بند روز و شب پاک از زمان است
۶- شمارِ روزگارش از نفس نیست | چنیں جوئندہ و یابندہ کس نیست
۷- گہے وا ماندہ و ساحل مقامش | گہے دریائے بے پایاں بجامش
۸- ہمیں دریا ہمیں چوب کلیم است | کہ از وے سینۂ دریا دو نیم است
۹- غزالے مرغزارش آسمانے | خورد آبے ز جوئے کہکشانے
۱۰- زمین و آسماں اورا مقامے | میانِ کارواں تنہا خرامے

۱- آدم/آدمی کے سینے میں یہ کیسا نور ہے؟ یہ کیسا نور ہے کہ اس کا غیب بھی اس کے لیے حضور ہے' (اس پر ظاہر ہے) نور سے مراد خودی کا نور ہے جو در حقیقت انائے مطلق (خدا کی خودی) ہے۔ انائے مطلق کو غیب اور حضور دونوں عالموں کی خبر ہے۔ چونکہ خالق کائنات نے انسان کے سینے میں یہ نور رکھا ہے' اس لیے وہ بھی غیب و حضور دونوں سے آگاہ ہوگا۔

۲- میں نے اسے (نور خودی کو) ایک ایسا نور پایا/ دیکھا ہے جو سکون میں بھی ہے اور حرکت میں بھی۔ میں نے اسے نور کی حالت میں بھی دیکھا ہے اور آگ کی حالت میں بھی۔ نور سے مراد عشق اور وجدان ہے جبکہ نار سے مراد عقل و تدبیر ہے یا نور سے مراد جمالی اور نار سے مراد جلالی شان ہے۔

۳- کبھی تو اس کی نار دلیل و حجت کی صورت میں ہے اور کبھی اس کا نور جبرئیل کی جان سے ہے (...... جان کی صورت میں ہے)

۴- یہ کیسا نور ہے جو انسانی روح کو روشن کرنے اور سینے میں حرارت و تپش پیدا کرنے والا ہے۔ اس کی ایک شعاع کے مقابلے میں سورج کی بھی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ یہ سب اس نور خودی کی انتہائی عظمت کے بارے میں ہے۔

۵- وہ (نورِ خودی) مٹی سے لتھڑا ہوا یا آلودہ ہے لیکن مکان (زماں و مکاں) سے پاک ہے۔ وہ روز اور رات کے بندھن میں تو جکڑا ہوا ہے لیکن زمان سے پاک ہے۔ انسانی جسم میں ہونے کے باعث مٹی سے آلودہ کہا ہے اور چونکہ جسم کو دن اور رات سے واسطہ رہتا ہے اس لیے روز و شب کے بند کی بات کی، تاہم ان سب باتوں کے باوجود وہ زمان و مکاں سے ماورا یا اس کی قید سے آزاد ہے۔

۶- اس کے زمانہ یا اس کی زندگی کی گنتی سانسوں سے متعلق نہیں ہے۔ اس جیسا تلاش کرنے والا اور (اپنے مقصد کو) پالینے والا اور کوئی نہیں ہے۔ وہ جس چیز کو تلاش کرتا ہے اسے بہر طور پالیتا ہے اور یہ ایک کیفیت ہے جو ہر کسی میں نہیں ہے۔

۷- کبھی تو وہ تھکا ماندہ ہوتا ہے اور ساحل اس کا پڑاؤ ہوتا ہے اور کبھی اس کے جام میں ایک بے کنار (انتہائی وسیع) سمندر ہوتا ہے۔ خودی یا نورِ خودی کی دو کیفیتوں کو اس استعارے میں بیان کیا ہے۔

۸- یہی دریا ہے اور یہی حضرت موسیٰؑ کلیم اللہ کا عصا ہے (جسے انہوں نے دریائے نیل میں مارا تو وہ آدھا اِدھر اور آدھا ادھر ہو گیا اور یوں انہیں گذرنے کا راستہ مل گیا، (قرآنی تلمیح) کہ جس سے دریا دو نیم ہو جاتا ہے۔ یہ بھی خودی کی ایک عظیم علامت ہے۔

۹- وہ ایک ایسا ہرن ہے جس کی چراگاہ آسمان ہے جبکہ پانی وہ کہکشاں کی ندی سے پیتا ہے۔ یہ بھی عظمت و سربلندی کی بات ہے جو دوسرے استعارہ میں کی ہے۔

۱۰۔ زمین اور آسمان اس کا ٹھکانا ہیں' وہ قافلے میں ہوتے ہوئے بھی سب سے الگ چلتا ہے۔ گویا اس کائنات میں وہ ایک عظیم انفرادیت کا حامل ہے۔

۱۱۔ زاحوالش جہانِ ظلمت و نور صدائے صور و مرگ و جنت و حور
۱۲۔ ازو ابلیس و آدم را نمودے ازو ابلیس و آدم را کشودے
۱۳۔ نگہ از جلوۂ او ناشکیب است تجلی ہائے او یزداں فریب است
۱۴۔ بچشمے خلوتِ خود را بہ بیند بچشمے جلوتِ خود را بہ بیند
۱۵۔ اگر یک چشم بر بندد گناہے است اگر باہر دو بیند شرطِ راہے است
۱۶۔ زجوے خویش بحرے آفریند گہر گردد بہ قعر خود نشیند
۱۷۔ ہماں دم صورتِ دیگر پذیرد شود غواص و خود را باز گیرد
۱۸۔ درو ہنگامہ ہائے بے خروش است درو رنگ وصدا بے چشم و گوش است
۱۹۔ درونِ شیشۂ او روزگار است ولے برما بتدریج آشکار است

۱۱۔ تاریکی اور روشنی کی دنیا' صور کی آواز' موت اور جنت و حور یہ سب اس کے احوال میں سے ہیں۔

۱۲۔ اسی کے باعث ابلیس اور آدم کا وجود ہے اور اسی سے ابلیس و آدم کی کشود یا کشمکش ہے۔ گویا اس کائنات کی تمام اشیا کیا متضاد اور کیا موافق سبھی اسی نورِ خودی کے طفیل ہیں۔

۱۳۔ نگاہ اس کے جلوے سے بیقرار رہتی ہے۔ اس کی تجلیاں خدا کو بھی مرغوب یا پسند ہیں۔ گویا نور خودی کے جلوے میں کچھ ایسی دلکشی و دلربائی ہے کہ نہ تو انسان اسے دیکھ دیکھ کر معمولی سی بھی تھکاوٹ محسوس کرتا ہے اور نہ خدا ہی اُسے دیکھے بغیر رہ سکتا ہے۔

۱۴۔ وہ یعنی نورِ خودی ایک آنکھ سے تو اپنی خلوت کو دیکھتا ہے اور ایک آنکھ سے اپنی جلوت کو دیکھتا ہے۔ گویا اپنی متضاد کیفیات پر اس کی نظر رہتی ہے۔

۱۵۔ اگر وہ ایک آنکھ بند کر لے تو یہ گناہ ہے یا گناہ ہوگا اور اگر وہ دونوں آنکھوں سے دیکھے تو یہ راستے کی ضرورت یا شرط ہے۔ گویا ایک سالک کو اپنی ذات اور ذات سے باہر جو کچھ ہے سب پر نظر رکھنا ہوتی یا ان کا نظارہ کرنا ہوتا ہے۔ صوفیا کی اصطلاح میں ایک ''سیر انفسی'' (اپنی ذات کا نظارہ) ہے تو دوسری ''سیر آفاقی'' دونوں کا نظارہ سالک کے لیے ضروری ہے۔

۱۶۔ وہ اپنی ندی سے ایک سمندر پیدا کر لیتا ہے' پھر اس سمندر میں وہ موتی بن کر اپنی گہرائی

میں بیٹھ جاتا ہے۔ خودی ترقی کرتے کرتے صفاتِ خداوندی کی مظہر بن جاتی ہے اور اس طرح اس کی کیفیت ایک موتی کی سی ہو جاتی ہے جو سمندر کی گہرائی میں پڑا ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ اپنی ذات کی گہرائی میں ڈوب جاتی یا محو ہو جاتی ہے۔

۱۷- اسی وقت خودی ایک اور صورت اختیار کر لیتی ہے اور اس طرح وہ ایک غوطہ خور بن جاتی اور غوطہ لگا کر خود کو پھر پا لیتی ہے۔ گویا انسانی خودی انائے مقید اور خدا انائے مطلق ہے۔ انائے مطلق جب انائے مقید میں آتی ہے تو اسے اپنی صفات سے مزین کر دیتی ہے۔ یہاں خدائی صفات کا تعین ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ندی' بحر' موتی' گہرائی اور غواص سب اسی انائے مطلق کے انائے مقید کے مقام پر متعین ہونے کی علامتیں/ استعارے ہیں۔

۱۸- اس کے اندر ایسے ہنگامے ہوتے ہیں جن کا شور نہیں ہوتا۔ اس میں رنگ اور آواز آنکھ اور کان کے بغیر ہے۔ گویا جب مذکورہ تعینات میں خدا کی صفات ظاہر ہوتی ہیں تو اس سے کائنات میں ہنگامے برپا ہوتے ہیں لیکن انائے مطلق خود خاموش رہتی ہے یعنی ان کا اثر نہیں لیتی اور وہ (مطلق) خود رنگ اور آواز کے بغیر رہتی ہے۔

۱۹- اس کے شیشے میں زمانہ ہے لیکن وہ ہم پر درجہ بدرجہ ظاہر ہوتا ہے۔ گویا زندگی' خودی کے شیشے میں ظاہر ہوتی ہے۔ مسلسل زندگی ہی کا نام زمانہ ہے' یوں زمانہ بھی خودی کے شیشے میں ظاہر ہوتا ہے جو ایک تدریجی حقیقت ہونے کے باعث ایک ہی وقت میں نہیں بلکہ بتدریج ظاہر ہوتا ہے۔

۲۰- حیات از وے بر اندازد کمندے — شود صیاد ہر پست و بلندے
۲۱- ازو خود را بہ بند خود در آرد — گلوے ماسوا را ہم فشارد
۲۲- دو عالم می شود روزے شکارش — فتد اندر کمند تاب دارش
۲۳- اگر ایں ہر دو عالم را بگیری — ہمہ آفاق میرد تو نہ میری
۲۴- منہ پا در بیابان طلب ست — نخستیں گیر آں عالم کہ در تست
۲۵- اگر زیری زخود گیری زبر شو — خدا خواہی؟ بخود نزدیکتر شو
۲۶- بہ تسخیر خود افتادی اگر طاق — ترا آساں شود تسخیر آفاق

۲۰- زندگی' نورِ خدا سے کمند پھینکتی ہے' وہ ہر پست اور بلند کی شکاری بن جاتی ہے۔ گویا زندگی اگر اس کائنات کو مسخر کرتی ہے تو وہ صرف اسی خودی کی بدولت کر سکتی ہے۔

۲۱- زندگی خود کو اس (خودی) کی بدولت اپنی ہی قید میں لے آتی ہے (یا اپنی ہی قید میں آجاتی ہے) اور ماسوا کا گلا دبا دیتی ہے یعنی ہر شے کو زیر کر لیتی ہے۔ زندگی میں یہ قوت اپنی ذات کی معرفت ہی سے پیدا ہوتی ہے' اس لیے کہ اسے اس معرفت سے اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کا پتا چلتا ہے۔

۲۲- ایک دن دونوں جہان اس کا شکار ہو جاتے ہیں اور دونوں اس کی بل کھائی ہوئی کمند یعنی پھندے میں آجاتے ہیں۔ ایک دن سے مراد ہے ایک وقت ایسا آتا ہے جب گویا خودی کی معرفت کے نتیجے میں وہ انفس و آفاق کے دونوں جہانوں کو مسخر کر لیتی ہے۔

۲۳- اگر تو (اے مخاطب/ قاری) دونوں جہانوں کو مسخر کر لے تو ساری کائنات مر جائے گی (فنا کا شکار ہو گی) لیکن تو نہیں مرے گا۔ گویا جہانِ انفس جو تیرے اندر ہے اور جہانِ آفاق جو تیرے باہر ہے' دونوں نہیں رہیں گے جبکہ تجھے بقا حاصل ہو گی۔

۲۴- تو ان دونوں جہانوں کو زیر/مسخر کرنے کی آرزو کے بیابان میں سستی سے قدم نہ رکھ۔ سب سے پہلے تو اس جہان کو جو تیرے اندر ہے (جہانِ انفس) زیر یا قابو کر۔ گویا اپنی خودی کی معرفت کی بنا پر اپنی قوتوں اور صلاحیتوں سے عملی طور پر آگاہ ہو۔

۲۵- اگر تو زیر یعنی کمزور ہے تو اپنی معرفت حاصل کر کے زبر یعنی طاقتور بن جا۔ کیا تجھے خدا کی خواہش ہے؟ یا اگر تو خدا کو پانا چاہتا ہے تو اپنے آپ سے نزدیک تر ہو جا یعنی تو اپنی خودی کو پورے طور پر پالے' اس سے تجھ میں خدائی صفات پیدا ہو جائیں گی جو گویا خدا کو پالینا ہے۔

۲۶- اگر تو خود کو تسخیر کرنے میں طاق ہو جائے تو تیرے لیے آفاق کی تسخیر آسان ہو جائے گی۔ خود کو تسخیر کرنے سے مراد خودی کی عملی معرفت ہے جس کی بدولت کائنات کو بآسانی مسخر کیا جاسکتا ہے۔

۲۷- خنک روزے کہ گیری ایں جہاں را — شگافی سینۂ نہ آسماں را
۲۸- گذارد ماہ پیش تو سجودے — بروپیچی کمند از موجِ دودے
۲۹- دریں دیرِ کہن آزاد باشی — بتاں را بر مرادِ خود تراشی
۳۰- بکف بردن جہانِ چار سو را — مقامِ نور و صوت و رنگ و بورا
۳۱- فزونش کم' کم او بیش کردن — دگرگوں بر مرادِ خویش کردن
۳۲- برنج و راحت او دل نہ بستن — طلسم نہ سپہر او شکستن

۳۳- فرو رفتن چو پیکاں در ضمیرش ندادن گندم خود با شعیرش

۳۴- شکوہِ خسروی این است این است ہمیں ملک است کو توام بدین است

۲۷- وہ دن بڑا ہی مبارک دن ہوگا جب تو اس جہان کو تسخیر کر لے گا اور نو آسمانوں کا سینہ چیر ڈالے گا۔ مطلب یہ کہ خودی کی معرفت سے تیری رسائی آسمان کے اس پار ہو جائے گی یعنی محبوب حقیقی تک تیری رسائی ہو جائے گی

۲۸- مذکورہ صورت میں چاند تیرے حضور سجدہ کرے گا اور تو اس پر دھوئیں کی کمند لپیٹے گا' مطلب یہ کہ تیرے لیے اس کی تسخیر آسان ہو جائے گی۔

۲۹- تو اس پرانے مندر یعنی دنیا میں آزاد ہوگا اور بتوں کو اپنے حسب خواہش تراشے گا (وہ دن مبارک ہوگا) یعنی اپنی معرفت حاصل کرنے سے تو دنیا کا غلام نہیں رہے گا' دنیا تیری غلام ہوگی اور تو اس سے اپنی مرضی کے مطابق کام لے گا۔

۳۰- (اس معرفت کے طفیل) اس چار سمتوں والے جہان کو قابو میں لانا ہے' یہ جہان جو نور اور آواز اور رنگ و بو کا مقام ہے۔

۳۱- اس کے زیادہ کو کم اور کم کو زیادہ کرنا ہے اور اسے اپنی آرزو کے مطابق الٹ پلٹ کرنا یعنی اس میں انقلاب لانا ہے۔

۳۲- اس کی تکلیف اور راحت با خوشی اور غم سے دل نہ لگانا ہے اور اس کے نو آسمانوں کے جادو کا توڑ کرنا ہے یعنی جہان کو فانی اور خود کو صاحب بقا جاننا ہے۔

۳۳- اس کے ضمیر میں اسی طرح دھنس جانا ہے جس طرح نیزہ جسم میں دھنس جاتا ہے اور اپنی گندم کو اس کے جو کے بدلے نہ دینا ہے یعنی ساری قدر و قیمت اور اہمیت تو تیری ہے' تیرے آگے اس جہان کی کوئی قدر و وقعت نہیں ہے۔

۳۴- شان و شوکت یہی ہے' یہی ہے اور یہی ملک ہے جو دین کے ساتھ توام ہے۔ گویا ملکِ بقا کی بادشاہت ہی حقیقی معنوں میں بادشاہت ہے اور یہ ملکِ بقا ایسا ہے جس میں دین اور دنیا ساتھ ساتھ چلتے ہیں جبکہ اس فانی دنیا کی بادشاہت بھی عارضی و فانی ہے اور اس لحاظ سے اس کی کوئی قدر و اہمیت نہیں ہے۔

سوال (۲)

چہ بحر است ایں کہ علمش ساحل آمد؟ زقعرِ او چہ گوہر حاصل آمد؟

۱- یہ کیسا یا کون سا سمندر ہے جس کا ساحل، علم واقع ہوا ہے۔ اس سمندر کی گہرائی سے کون سا موتی حاصل ہوتا ہے؟

جواب

۱- حیاتِ پُر نفس ,بحرِ روانے — شعور و آگہی او را کرانے
۲- چہ دریائے کہ ژرف و موجدار است — ہزاراں کوہ و صحرا بر کنار است
۳- مپرس از موج ہائے بے قرارش — کہ ہر موجش بروں جست از کنارش
۴- گذشت از بحر و صحرا رانمے داد — نگہ را لذتِ کیف و کمے داد
۵- ہر آں چیزے کہ آید درحضورش — منور گردد از فیض شعورش
۶- بخلوت مست و صحبت ناپذیر است — ولے ہر شے زنورش مستیز است
۷ نخستیں می نماید مستیزش — کند آخر بہ آئینے اسیرش
۸- شعورش با جہاں نزدیک تر کرد — جہاں او را ز رازِ او خبر کرد
۹- خرد بند نقاب از رخ کشودش — ولیکن نطق عریاں تر نمودش
۱۰- نگنجد اندریں دیرِ مکافات — جہاں او را مقامے از مقامات

۱- سانسوں سے پر زندگی ایک بہتا ہوا سمندر ہے جس کا ساحل شعور اور آگہی ہے یعنی ایسی زندگی جو خودی کے سانسوں کی بدولت زندہ ہے۔

۲- وہ کیسا سمندر ہے جو بہت گہرا اور اٹھتی ہوئی لہروں والا ہے۔ اس کے ساحل پر ہزاروں کوہ وصحرا ہیں۔ یہ ایسے انسان کی زندگی کا سمندر ہے جو اپنی معرفت سے آگاہ ہوگیا ہے اور اس طرح وہ خدائی صفات کا مظہر ہو جاتا ہے اور اس میں ان صفتوں کی صلاحیتیں اور قوتیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔

۳- اس (سمندر) کی بیقرار لہروں کے بارے میں مت پوچھ' اس لیے کہ اس کی ہر لہر کنارے سے باہر اچھل گئی ہے۔ گویا خودی سکون کی نہیں حرکت وعمل کی حامل ہے۔ اس کی اس کیفیت کو بیقراری سے تشبیہ دی ہے۔

۴- وہ (خودی) سمندر سے گذر گئی اور اس نے صحرا کو نمی دی۔ اس نے نگاہ کو کیف وکم کی لذت عطا کی۔ ہر قسم کے اسرار واحوال کو دیکھنے کی لذت۔

۵- جو چیز بھی اس کے حضور آتی ہے' وہ اس کے شعور کے فیض سے روشن/ منور ہو جاتی

ہے۔گویا خودی دنیا کی ہر شے کی قدر اور اہمیت کا تعین کرتی ہے۔

۶- جب وہ خلوت میں ہو تو مست و محو ہوتی ہے اور صحبت قبول یا پسند نہیں کرتی، اس کے باوجود کائنات کی ہر شے اس کے نور سے روشن ہو جاتی ہے۔ گویا خودی انفرادیت پسند ہوتے ہوئے بھی ہر چیز کے فائدے کا سامان کرتی ہے۔

۷- پہلے وہ اسے (ہر چیز کو) منور کرتی ہے اور آخر اسے ایک آئین کی پابند کر دیتی ہے یعنی وہ ہر شے کو یونہی بیکار نہیں رہنے دیتی بلکہ اسے قانون و قاعدہ کے دائرے میں لے آتی ہے تاکہ زندگی بے مقصد نہ گذرے۔

۸- اس کے شعور نے اسے دنیا یا کائنات کے زیادہ نزدیک کر دیا جبکہ دنیا نے اسے اس کے راز سے باخبر کر دیا۔ گویا خودی نے جب اس کائنات پر غور و خوض کیا تو اس پر یہ واضح ہوا کہ وہ کائنات سے افضل ہے اور کائنات کا وجود اس کے باعث ہے۔

۹- خرد نے اس کے چہرے سے نقاب اٹھا/ ہٹا دیا جبکہ زبان نے زیادہ واضح طور پر اسے ظاہر کر دیا۔ مطلب یہ کہ خودی، عقل و خرد کی بھی حامل ہے اور اس میں بولنے کی بھی قوت ہے اور یہ قوت (قوتِ گویائی) اس کی قوتوں کے ظہور کی ہے۔

۱۰- وہ اس دیرِ مکافات میں نہیں سماتی۔ جہان اس کے مقامات میں سے ایک مقام ہے۔ گویا خودی اس کائنات میں نہیں سما سکتی بلکہ کائنات اس میں سمائی ہوئی ہے اور اس (خودی) کا یہی جہان مقام نہیں ہے بلکہ اس سے بھی آگے اور جہاں ہیں یعنی وہ بے پایاں وسعت کی حامل ہے (ان ۱۰ اشعار سے یہ واضح ہوتا ہے کہ خدا (انائے مطلق) اور خودی (انائے مقید) دونوں سمندر اور موج کی طرح ہیں۔ جس طرح موج سمندر کا ظہور ہے اسی طرح ظہور کے اعتبار سے انائے مطلق، انائے مقید میں جلوہ نما ہے۔ اس کی یہ جلوہ نمائی قسم قسم کے کرشموں اور رنگوں کی حامل ہے۔)

۱۱- بروں از خویش می بینی جہاں را | در و دشت و یم و صحرا و کاں را
۱۲- جہانِ رنگ و بو گلدستہ ما | زما آزاد و ہم وابستہ ما
۱۳- خودی او را بیک تارِنگہ بست | زمین و آسمان و مہر و مہ بست
۱۴- دل ما را باو پوشیدہ راہے است | کہ ہر موجود ممنونِ نگاہے است
۱۵- گر او راکس نہ بیند زار گردد | اگر بیند یم و کہسار گردد
۱۶- جہاں را فربہی از دیدنِ ما | نہالش رُستہ از بالیدنِ ما

۱۷۔ حدیث ناظر و منظور رازے است دلِ ہر ذرہ در عرضِ نیازے است

ق

۱۸۔ تو اے شاہد مرا مشہود گرداں زفیض یک نظر موجود گرداں

۱۹۔ کمال ذات شے موجود بودن برائے شاہدے مشہود بودن

۲۰۔ ز دانش در حضورِ ما نبودن منور از شعورِ ما نبودن

۲۱۔ جہاں غیر از تجلی ہائے ما نیست کہ بے ما جلوہ نور و صدا نیست

۲۲۔ تو ہم از صحبتش یاری طلب کن نگہ را از خم و پیچش ادب کن

۲۳۔ یقیں می داں کہ شیرانِ شکاری دریں رہ. خواستند از مور یاری

۱۱۔ تو نہ صرف اس جہان کو خود سے باہر دیکھتا ہے بلکہ وادی، بیابان اور سمندر اور صحرا اور کان یعنی کائنات کی ہر شے کو ایسا دیکھتا ہے گویا تو خود کو دیکھنے کی بجائے اس جہان پر نظر رکھتا یا اسے دیکھتا ہے جبکہ یہ سب کچھ تیرے لیے یا تیرے نظارے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔

۱۲۔ رنگ و بو کی یہ دنیا ہمارا گلدستہ ہے، گو وہ ہم سے آزاد ہے لیکن ہم سے مربوط و وابستہ بھی ہے۔ گویا ہم سے باہر ہوتے ہوئے بھی ہم سے جدا نہیں ہے، اس لیے کہ ہمارے وجود ہی سے اس کا وجود ہے۔

۱۳۔ خودی نے اسے (جہانِ رنگ و بو کو) نگاہ کے ایک تار میں باندھ لیا۔ اس نے زمین اور آسمان اور سورج اور چاند کو (جن کا تعلق اس جہان سے ہے) اس (نگاہ کے تار) میں باندھ لیا۔ گویا اس ساری کائنات کا وجود خودی کے اسے دیکھنے (اس کا نظارہ کرنے) کا محتاج ہے۔

۱۴۔ ہمارے دل کو اس جہان سے ایک پوشیدہ تعلق یا رابطہ ہے، اس لیے کہ ہر موجود ایک نگاہ کا احسان مند ہے یعنی اگر ہم اس جہان کو نہ دیکھیں، اس پر نظر نہ دوڑائیں تو اس میں موجود ہر شے کا وجود گویا نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس لیے یہ جہان ہمارے شعور و ادراک اور نظر کا محتاج ہے۔

۱۵۔ اگر اسے (جہان کو) کوئی نہ دیکھے تو وہ کمزور اور ناتواں ہو جاتا ہے اور اگر اسے دیکھے تو وہ گویا سمندر اور کوہسار بن جاتا ہے۔ وہی بات کہ ہمارے دیکھنے ہی سے اس کا ہر طرح کا وجود برقرار ہے اور اگر نہ دیکھیں تو وہ بیکار ہے یا کچھ بھی نہیں ہے۔

۱۶- جہان کا موٹاپا ہمارے دیکھنے ہی سے ہے۔ اس کا درخت یا پودا ہمارے ہی اگنے (وجود میں آنے) سے اُگا ہے۔ نئے استعارے میں وہی بات۔

۱۷-۱۸: ناظر اور منظور کی بات ایک راز ہے۔ ہر ذرے کا دل اپنی نیازمندی یا عاجزی کا اظہار کررہا ہے۔ وہ یہ عرض کررہا ہے کہ اے شاہد/ ناظر تو مجھے مشہود/ منظور بنادے اور اپنی ایک نظر کے فیض سے مجھے موجود (صاحب وجود) بنادے۔ وہی بات کہ اس جہان کا وجود دیکھنے والے کی نظروں کا محتاج ہے، یعنی انسان کے دم سے ہے۔

۱۹- کسی شے کی ذات کا کمال اس کا موجود (صاحب وجود) ہونا ہے، اس کا مشہود ہونا کسی شاہد کی خاطر ہے۔ مطلب یہ کہ اگر ناظر اس کائنات کو دیکھے تو یہ کائنات کے کمال کا باعث ہوگا، بصورت دیگر کائنات زوال کا شکار ہوگی، گویا اس کا وجود نہ ہونے کے برابر ہوگا۔

۲۰- عقل کی رو سے اس کا ہمارے سامنے موجود ہونا' نہ ہونا ہے اور اس کا ہمارے شعور سے روشن ہونا' نہ ہونا ہے۔ وہی بات کہ کسی بھی شے کا وجود ناظر/ شاہد کی نگاہوں کا احسان مند و محتاج ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی دلیل نہیں جو اس کے وجود کا اثبات کردے۔

۲۱- یہ کائنات ہماری تجلیوں کے سوا کچھ نہیں ہے، اس لیے کہ ہمارے بغیر نور اور صدا کا جلوہ نہیں ہے۔ کائنات کی رنگارنگی اور رونق ہمارے شعور کے احساس ہی کی بنا پر ہے۔

۲۲- تو بھی اس کی صحبت سے یاری طلب کر (فائدہ اٹھا) اور اپنی نگاہ کا اس کے خم و پیچ سے ادب کر۔ گویا تو حالات اور اشیا کے تقاضوں کے مطابق کائنات پر نگاہ ڈال اور ان سے فائدہ اٹھانے یا استفادہ کرنے کی کوشش کر۔ جیسا کہ پہلے شعروں میں کہا گیا ہے کہ کائنات ہماری نگاہوں کی محتاج ہے لیکن اب اس شعر سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ کائنات جو اپنے نور/ روشنی اور آواز یعنی ہمارے کانوں (صدا) اور ہماری آنکھوں کے لیے دل کش نظاروں کی حامل ہے اسے موہوم سمجھ کر اس سے قطع نظر کرنا زندگی کے مقصد کے خلاف ہے، لہٰذا اس کے وجود سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہیے۔

۲۳- تو یقین کر کہ شکار کرنے والے شیروں نے اس راہ میں چیونٹی سے مدد چاہی ہے۔ مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ سلوک و معرفت کی راہ پر چلنے والے شیر دل عارفوں/ صوفیوں کے سامنے اس کائنات کی حیثیت اگرچہ ایک چیونٹی کی سی ہے لیکن انہوں نے بھی اس سے استفادہ کیا ہے اور وہ یوں کہ انہیں اس کائنات کے ذرے ذرے

میں اس محبوبِ حقیقی کا جلوہ نظر آیا ہے جو ان کے لیے راہ معرفت میں ہر لحہ آگے بڑھنے میں مدد و معاون ثابت ہوا ہے۔

۲۴- بیاری ہائے او از خود خبر گیر	تو جبریل امینی بال و پر گیر
۲۵- بہ بسیاری کشا چشم خرد را	کہ دریابی تماشائے احد را
۲۶- نصیب خود زبوئے پیرہن گیر	بہ کنعاں نکہت از مصر و یمن گیر
۲۷- خودی صیاد و نخچیرش مہ و مہر	اسیر بند تدبیرش مہ و مہر
۲۸- چو آتش خویش را اندر جہاں زن	شبیخوں برمکان و لامکاں زن

۲۴- تو اس (کائنات) کی یاریوں یعنی طور وطریقوں سے اپنے آپ کی خبر حاصل کر، اپنی معرفت حاصل کر، تو امانت دار جبرئیل فرشتہ ہے تو اپنے بال و پر پیدا کر (شعر ۲۳ کی شرح کو پیش نظر رکھیں) یعنی تو اس کائنات سے بلند بھی رہ اور اس پر غور وخوض اور اس کا نظارہ کر کے یہ جان لے کہ تیرا مقام زمینی نہیں آسمانی ہے۔ اس سے تجھ پر تیری حقیقت (افضل البشر ہونا) بھی واضح ہو جائے گی۔

۲۵- تو کائنات میں موجود کثرتِ اشیا پر اپنی چشم خرد کھول تا کہ تو احد کا نظارہ/ تماشا کر لے یعنی چونکہ کائنات کے ہر ذرے میں اس ذات کی جلوہ گری ہے، جب تو اس پر غور کرے گا تو تجھے اس کثرت میں وحدت نظر آئے گی۔

۲۶- تو اپنا نصیب قمیص کی خوشبو سے حاصل کر، کنعان میں بیٹھے ہوئے ملک یمن اور ملک مصر کی خوشبو حاصل کر (فرہنگ دیکھیے) مطلب یہ کہ مذکورہ خوشبو کی طرح ایک عارف و سالک کو کائنات کی اشیا میں سے محبوب حقیقی کی صفات کی خوشبو آ جاتی ہے اور یوں اسے کثرت میں وحدت نظر آ جاتی ہے۔

۲۷- خودی ایک شکاری ہے اور چاند اور سورج اس کے شکار ہیں۔ چاند اور سورج اس (خودی) کی تدبیر کے قیدی ہیں یعنی تو اگر کثرت میں وحدت کا نظارہ کر کے اپنی ذات کا نظارہ کرے تو اس میں بھی تجھے اس ذات کے ظہور کی جھلک نظر آئے گی اس کا باعث خودی ہو گی جس سے آگاہی کے بعد اس کائنات پر تیری حکمرانی ہو گی۔

۲۸- تو آگ کی طرح خود کو جہان میں ڈال یا پھینک اور یوں مکان و لامکاں پر شب خون مار۔ گویا تو ماسوا اللہ کو خس و خاشاک کی طرح جلا ڈال اور خودی کی بنا پر تجھ میں خدائی صفات آ جائیں گی جن کے زور پر تو اس جہان اور اُس جہان دونوں کو تسخیر کر سکے گا۔

سوال (۳)

وصالِ ممکن و واجب بہم چیست؟ حدیث قرب و بُعد و بیش و کم چیست؟

ممکن اور واجب میں باہمی وصال سے کیا مراد ہے۔ قرب اور دوری اور زیادہ اور کم کی بات کیا ہے؟ (صوفیا کے مطابق صرف بندہ ہی خدا سے رابطے کا خواہش مند نہیں ہے بلکہ خدا کو بھی اپنے بندے سے رابطے کی خواہش رہتی ہے' یہی وصال باہم ہے)۔ اس رابطے میں شدت قرب کا باعث ہے اور کبھی اس کے برعکس (شدت نہ ہونے کے باعث) دوری کا باعث بنتا ہے۔ کبھی یہ زیادہ اور کبھی کم ہو جاتا ہے۔ اسی حوالے سے یہ سوال پوچھا گیا ہے کہ ایسا کیوں ہے)

جواب

۱۔ سہ پہلو ایں جہانِ چون و چند است — خرد کیف و کم او را کمند است

۲۔ جہانِ طوسی واقلیدس است ایں — پے عقل زمیں فرسا بس است ایں

۳۔ زمانش ہم مکانش اعتباری است — زمین و آسمانش اعتباری است

۴۔ کماں را زہ کن و آماج دریاب — زحرفم نکتہ معراج دریاب

۵۔ مجو مطلق دریں دیر مکافات — کہ مطلق نیست جز نور السموات

۶۔ حقیقت لازوال و لامکان است — مگو دیگر کہ عالم بے کران است

۷۔ کرانِ او درون است و بروں نیست — درونش پست بالا کم فزون نیست

۸۔ درونش خالی از بالا و زیر است — ولے بیرونِ او وسعت پذیر است

۹۔ ابد را عقل ما ناسازگار است — ''یکی'' از گیرو دارِ او ہزار است

۱۰۔ چولنگ است وسکوں را دوست دارد — نہ بیند مغز و دل بر پوست دارد

۱۱۔ حقیقت را چوما صد پارہ کردیم — تمیز ثابت و سیارہ کردیم

۱۲۔ خرد در لامکاں طرح مکاں بست — چو زنارے زماں را بر میاں بست

۱۳۔ زماں را در ضمیر خود ندیدم — مہ و سال و شب و روز آفریدم

۱۴۔ مہ و سالت نمی ارزد بیک جو — بحرفِ ''کم لبثتم'' غوطہ زن شو

۱۵۔ بخود رس از سر ہنگامہ برخیز — تو خود را در ضمیر خود فرو ریز

۱- اس جہانِ چند و چون کے تین پہلو ہیں۔ عقل اس کے کیف و کم کے لیے کمند ہے یعنی یہ جہان مادیات کا محسوسات کا جہان ہے' اس کے تین پہلو یہ ہیں: طول' عرض اور گہرائی۔ عقل اس کا احاطہ کرنے میں لگی رہتی ہے۔

۲- یہ طوسی اور اقلیدس کا جہان ہے (فرہنگ دیکھیے) زمین گھساتی ہوئی عقل کے لیے یہ کافی ہے یعنی یہ جہان جو مادی ہے اور جسے عقل' حکمت اور نجوم اور ہندسہ و ریاضی وغیرہ کے زاویوں سے دیکھا جاتا ہے۔

۳- اس جہان کا زمان بھی اور مکان بھی دونوں اعتباری/ فرضی ہیں۔ اس کے زمین و آسماں بھی اعتباری ہیں۔ گویا یہ جہان اور اس کی تمام اشیا اس لحاظ سے اعتباری ہیں کہ وہ اپنے آپ وجود میں نہیں آئیں بلکہ وہ خالق کائنات کے وجود کی محتاج ہیں۔ گویا خالق نہ ہوتا تو یہ بھی نہ ہوتیں۔

۴- تو کمان کی زہ میں تیر رکھ اور نشانہ پہچان لے۔ میری بات سے معراج کی گہری رمز سمجھ لے۔ حضور اکرمؐ کے واقعہ معراج شریف کے حوالے سے یہ کہنا چاہا ہے کہ اگر تم زمان و مکاں کو مسخر کر لو تو اس کا مطلب ہوگا تمہارا تیر نشانے پر لگا ہے یعنی تم نے اپنی پوشیدہ صلاحیتوں اور قوتوں سے آگاہ ہو کر اپنی حقیقت پالی ہے۔ حضور اکرمؐ عرش پر گئے اور واپس تشریف لے آئے۔ سو اگر تمہیں بھی اس نورِ مطلق کی خواہش ہے تو اس جہانِ زمان و مکاں سے آزاد ہو جاؤ۔

۵- تو اس دیرِ مکافات میں اس وجودِ مطلق کو تلاش نہ کر' اس لیے کہ وجود مطلق (ذاتِ خداوندی) نور السمٰوات کے سوا کچھ نہیں ہے۔ گویا اس ذات کا نور اس مادی/ ظاہری جہان میں نہیں بلکہ اس کے باطن میں نظر آئے گا یعنی اس کا نور ذرے ذرے میں ہے تو اس ذات کو اس کے نور کے آئینے میں دیکھ سکتا ہے۔

۶- حقیقت لازوال (جسے کوئی زوال نہیں) اور لامکاں ہے۔ پھر تو یہ نہ کہہ کہ عالم بیکراں (لامحدود) ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں ہے۔ صرف حقیقت ہی بے پایاں ہے اور وہ زمان و مکاں سے ماورا ہے جبکہ یہ کائنات اور اس میں موجود ہر شے مقید بھی ہے اور اس کی حدود بھی ہیں۔

۷- زمانے کی حقیقت کا کنارہ (انتہا) خارج میں یعنی ماہ و سال گذرنے میں نہیں ہے بلکہ اس کے باطن میں ہے۔ اس کا باطن ایسا ہے جس میں ظاہر کی طرح نیچ اونچ اور کم اور

زیادہ نہیں ہے۔ گویا وہ ایک مسلسل رو ہے۔

۸- اس کا باطن/اندر بالا یعنی اوپر اور زیر (نیچے) سے خالی ہے لیکن اس کا باہر وسعت اختیار کرنے والا یعنی ہر لحہ آگے بڑھنے والا ہے۔

۹- ابد کے لیے ہماری عقل ناموافق ہے، یعنی وہ ایک لاانتہا زمانہ ہے جسے سمجھنا عقل کے بس کی بات نہیں۔ ابد ایک اکائی (ناقابل تقسیم) ہے جو عقل کی پکڑ دھکڑ (سوچ بچار) کے باعث ہزاروں میں تقسیم ہوگئی ہے۔ گویا عقل ابد کو جو لاانتہا ہے دنیاوی زمانے کے مطابق سمجھتی ہے جو سال وماہ اور صبح وشام وغیرہ میں بٹا ہوا ہے۔

۱۰- وہ (عقل) لنگڑی ہونے کے باعث سکون (عدم حرکت) کو پسند کرتی ہے۔ وہ مغز یعنی باطن کو نہیں دیکھتی بلکہ اپنا دل اس کے ظاہر پر لگائے ہوئے ہے یعنی اس میں حقیقت تک پہنچنے کی اہلیت ہی نہیں ہے اسی لیے وہ سکون پسند ہے۔

۱۱- جب ہم نے حقیقت کو (جو اکائی ہے) سوٹکڑے کر دیا تو اس طرح ہم نے ساکن اور متحرک میں تمیز پیدا کر دی۔ مطلب یہ کہ صحیح صورت تو یہ ہے کہ تمام اشیائے کائنات میں اس خالق ہی کی جلوہ گری ہے، اس لیے تمام اشیا ہر چند شکل وصورت اور فعل وعمل میں الگ الگ سہی لیکن مذکورہ وجہ کی بنا پر وہ ایک ہی ہیں۔

۱۲- عقل نے لامکاں میں مکاں کی بنیاد رکھی اور اس طرح اس نے گویا زنار کو کمر پر باندھ لیا۔ مطلب یہ کہ درحقیقت زمان ومکاں نہیں ہیں جو کچھ ہے وہ خالق ہے، علامہ ہی کے بقول:

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری
نہ ہے زماں نہ مکاں، لا الٰہ الا اللہ

۱۳- میں نے زماں کو اپنے ضمیر میں نہ دیکھا، اس لیے میں نے ماہ وسال اور شب وروز پیدا کر لیے یعنی وہ تو غیر منقسم اور لامحدود ہے جبکہ میں اس ظاہری زمانے ہی میں کھو کے رہ گیا۔

۱۴- تیرے یہ ماہ وسال تو قیمت کے لحاظ سے ایک جو کے برابر بھی نہیں ہیں، تو "کم لبثتم" کے حرف میں غوطہ زن ہو جا تاکہ تجھ پر حقیقت واضح ہو جائے (نیز فرہنگ دیکھیے) گویا جب دنیا کی ایک طویل مدت بھی پل دو پل کے برابر معلوم ہو تو پھر اس ظاہری زمانے پر بھروسا کیسا لیکن انسان پھر بھی گویا اس کے شکنجے میں گرفتار ہے۔

۱۵- تو خود تک پہنچ اور ہنگامہ کے سر پر سے اٹھ جا۔ تو اپنے آپ کو اپنے ضمیر میں ڈال لے۔ مطلب یہ کہ اس زمانے میں کھویا رہنے کی بجائے اپنی ذات میں محو ہو جا' اپنی معرفت حاصل کر۔ گویا علامہ کے بقول:

ع اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی

۱۶- تن و جاں را دوتا گفتن کلام است | تن و جاں را دوتا دیدن حرام است

۱۷- بجاں پوشیدہ رمزِ کائنات است | بدن حالے ز احوالِ حیات است

۱۸- عروسِ معنی از صورت حنا بست | نمود خویش را پیرایہ ہا بست

۱۹- حقیقت روئے خود را پردہ باف است | کہ او را لذتے در انکشاف است

۱۶- جسم اور جان کو دو الگ الگ چیزیں کہنا صحیح بات نہیں ہے۔ جسم اور جان کو دو کہنا حرام ہے۔ گویا دونوں اس خالق کی ایک ہی شانِ تخلیق کے مظہر ہیں۔ اس لیے دونوں کی اہمیت ہے اور کسی ایک کو نظر انداز کرنا درست نہیں۔

۱۷- کائنات کی رمز جاں میں پوشیدہ ہے' بدن زندگی کے حالات میں سے ایک حال ہے۔ گویا زندگی کے اظہار کے لیے بدن ضروری ہے۔ اگر بدن نہ ہو تو روح کا ظہور کیونکر ہو سکتا ہے' نہیں ہو سکتا۔

۱۸- معنی کی دلہن نے صورت کی مہندی لگائی اور اپنے اظہار کے لیے مختلف قسم کے لباس پہنے۔ گویا روح کے لیے بدن اس طرح باعث آرائش ہے جس طرح ایک دلہن کی آرائش کے لیے مہندی اور نئے نئے لباس استعمال کیے جاتے ہیں۔ گویا بدن کے بغیر روح کی اہلیتیں اور صلاحیتیں سامنے نہیں آتیں یا روح ان سے کام نہیں لے سکتی۔

۱۹- حقیقت اپنے چہرے کے لیے پردہ بنتی ہے یا پردہ بننے والی ہے' اس لیے کہ اس کے واسطے انکشاف میں لذت ہے۔ گویا روح کے لیے بدن میں پوشیدہ رہ کر ہی اپنی اہلیتوں کے اظہار میں لذت حاصل ہوتی ہے یعنی وہ اپنی اس کیفیت کو پسند کرتی ہے۔

۲۰- بدن را تا فرنگ از جاں جدا دید | نگاہش ملک و دیں راہم دوتا دید

۲۱- کلیسا سبحۂ پطرس شمارد | کہ او با حاکمی کارے ندارد

۲۲- بکارِ حاکمی مکروفنے بیں | تن بے جان و جانِ بے تنے بیں

۲۳- خرد را بادلِ خود ہم سفر کن | یکے بر ملت ترکاں نظر کن

۲۴- بہ تقلید فرنگ از خود رمیدند | میانِ ملک و دیں ربطے ندیدند

۲۰- جب یورپ والوں نے بدن کو جان سے جدا سمجھا' ان کی نگاہ نے ملک اور دین کو بھی الگ الگ دیکھا۔ گویا انہوں نے دین و مذہب کو ملک اور سیاست سے الگ کر دیا جبکہ یہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔

۲۱- گرجا والے پطرس کی مالا جپتے رہتے ہیں' اس لیے کہ اسے حکمرانی سے کوئی واسطہ و تعلق نہیں ہے (فرہنگ دیکھیے) مطلب یہ کہ عیسائی مذہب نے مذہب کو الگ اور نظام حکومت کو الگ رکھا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ زندگی کا نظام اور دنیا کا انتظام دونوں درہم برہم ہو کے رہ گئے ہیں۔

۲۲- تو ذرا حکومت/ حاکمیت کے معاملے میں اہل یورپ کا مکروفن دیکھ' بے جان بدن اور بدن کے بغیر جان دیکھ۔ دوسرے مصرعے میں پہلے مصرع کو تمثیل سے واضح کیا ہے یعنی مذہب کو سیاست وحکومت سے الگ کر کے یہ لوگ بدن پرست یا مادہ پرست ہو گئے ہیں اور روح سے بیگانہ ہو گئے ہیں۔

۲۳- ۲۴: تو خرد کو اپنے دل کا ہم سفر بنا۔ ذرا ترکوں کی قوم پر نظر ڈال' وہ (ترک) یورپ والوں کی پیروی میں اپنے آپ سے دور ہو گئے۔ انہیں بھی یورپ والوں کی طرح ملک وسیاست اور دین میں کوئی باہمی ربط نظر نہ آیا۔ اسلام کی رو سے دین اور ملک / سیاست کا باہمی گہرا تعلق ہے۔ دین بغیر ملک کے اور ملک بغیر دین کے گویا بیکار ہے یعنی دین بغیر ملک کے رہبانیت اور ملک بغیر دین کے ایک طرح سے ظلم وستم کا حامل نظام ہے۔ ترکوں نے فرنگی مکروفریب میں آنے کے باعث بے دین حکومت قائم کر لی اور یوں وہ اپنے عظیم مذہبِ اسلام سے باغی ہو گئے۔

۲۵- ''یکی را آں چناں صد پارہ دیدیم — عدد بہر شمارش آفریدیم
۲۶- کہن دیرے کہ بینی مشت خاک است — دمے از سرگذشت ذات پاک است
۲۷- حکیماں مردہ را صورت نگار اند — یدموسیٰ ' دم عیسیٰ ندارند
۲۸- دریں حکمت دلم چیزے ندید است — برائے حکمت دیگر تپید است
۲۹- من ایں گویم جہاں در انقلاب است — درونش زندہ و در پیچ و تاب است
۳۰- ز اعداد و شمار خویش بگذر — یکے در خود نظر کن پیش بگذر
۳۱- درآں عالم کہ جزو از کل فزون است — قیاس رازیؔ و طوسیؔ جنون است
۳۲- زمانے با ارسطو آشنا باش — دمے باسازِ بیکنؔ ہم نوا باش

۳۳- ولیکن از مقام شاں گذر کن مشوگم اندریں منزل ' سفر کن
۳۴- بآں عقلے کہ داند بیش و کم را شناسد اندرونِ کان و یم را
۳۵- جہانِ چند وچوں زیر نگیں کن بگردوں ماہ و پرویں را مکیں کن
۳۶- ولیکن حکمت دیگر بیاموز رہاں خود را ازیں مکر شب و روز
۳۷- مقام توبروں از روزگار است طلب کن آں یمیں کو بے یسار است

۲۵- ہم نے اکائی/ وحدت کو کچھ اس طرح سینکڑوں ٹکڑوں میں دیکھا کہ ان (ٹکڑوں) کے گننے یا ان کی گنتی کی خاطر ہم نے عدد پیدا کر لیے۔ ہم نے وحدت کے ٹکڑے کر دیئے اور ایسا ہم نے حقیقت سے بیگانگی و بے خبری کے باعث کیا۔

۲۶- یہ پرانا مندر یعنی دنیا جو تو دیکھ رہا ہے محض خاک کی ایک مٹھی ہے اور اس ذاتِ پاک (وجودِ مطلق) کی سرگذشت/ داستان کا ایک لحہ ہے۔ مطلب یہ کہ خالق کائنات کے لیے اس مادی دنیا کی حیثیت محض ایک پل کی ہے۔

۲۷- فلسفی مردوں کی صورت نگاری کرنے والے ہیں۔ وہ حضرت موسیٰؑ کے ید بیضا اور حضرت عیسیٰؑ کے دم سے محروم ہیں (فرہنگ دیکھیے) گویا جو انسان دین اور سیاست نیز روح اور بدن میں دوئی کے قائل ہونے کے سبب انسانیت سے ہٹ گئے اور ایک طرح سے مردے ہیں' انہیں انسان بنانا اور ان میں نئی روح پھونکنا فلسفیوں کے بس کی بات نہیں ہے۔

۲۸- میرے دل کو اس فرنگی حکمت میں کوئی چیز ایسی نظر نہیں آئی جو (انسانیت کے لیے مفید ہو) میرا دل کسی اور حکمت کے لیے تڑپا ہے۔ مطلب یہ کہ میرے دل کی مطلوبہ حکمت صرف اور صرف اسلام ہے جو توحید و وحدت کا علمبردار اور دوئی کا منکر ہے۔

۲۹- میں تو یہ کہتا ہوں کہ یہ دنیا حالتِ انقلاب میں ہے اور اس کا اندر/ باطن زندہ اور بے قرار ہے یعنی یہ دنیا ایک ہی حالت پر قائم نہیں رہتی۔ اس میں تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں۔ گویا خالق کائنات ہر لحہ اپنی جلوہ گری میں مصروف رہتا اور ہر مرتبہ ایک نئی شان میں ظاہر ہوتا ہے اور اسی بنا پر کائنات بھی ہر لحہ بدلتی رہتی ہے۔ جو کچھ پہلے تھا وہ اب نہیں ہے اور جو اب ہے وہ پھر نہیں ہوگا۔

۳۰- تو اپنے اعداد و شمار سے گذر۔ کچھ دیر اپنے اندر نظر کر اور آگے بڑھ۔ گویا تو عقل و خرد' منطق اور طبعیات (Physics) وغیرہ کے چکر سے باہر آ' اپنی معرفت حاصل کر اور اپنی حقیقت سے باخبر ہو کر ہر طرح کے ظاہری علم و فلسفہ سے بے نیاز ہو جا اور یوں

اپنی بقا کا سامان کر۔

۳۱- اس جہان میں جہاں جز وکل سے بڑھ کر یا زیادہ ہے' وہاں رازی اور طوسی کا قیاس محض دیوانگی ہے۔ مطلب یہ کہ جو آدمی اپنی خودی سے باخبر ہو جاتا ہے' اس پر یہ حقیقت کھل جاتی ہے کہ اس کی خودی' کائنات کا ایک جزو ہوتے ہوئے بھی اپنی وسعت کے لحاظ سے کائنات سے کہیں بڑھ کر ہے، اس حقیقت کو جاننا بڑے بڑے فلسفیوں اور ہیئت دانوں کے بھی بس کی بات نہیں ہے۔

۳۲- تو کچھ وقت کے لیے حکیم ارسطو سے آشنا ہو اور کچھ دیر بیکن کے ساز کے ساتھ ہم آواز ہو جا۔ (فرہنگ دیکھیے) یعنی تو ان کے فلسفہ وحکمت کا ضرور مطالعہ کر لیکن اس کا اثر قبول نہ کر۔

۳۳- لیکن ان (ارسطو اور بیکن) کے مقام سے گذر جا۔ تو اس منزل میں گم نہ ہو بلکہ آگے سفر اختیار کر' وہی شعر ۳۲ والی بات یعنی ان کا اثر قبول نہ کر، ہاں مطالعہ کے دوران کوئی خاص بات آجائے تو اس سے استفادہ کر ورنہ اثر قبول کرنے کی صورت میں تو عشق کے جذبوں سے محروم ہو جائے گا۔

۳۴-۳۵: تو اس عقل سے' جو زیادہ اور کم یعنی نفع اور نقصان سے بخوبی آگاہ ہے' جو سمندر اور کان کے اندر موجود ہر شے کو پہچانتی یا اس سے آگاہ ہے' اس چند و چون کی دنیا (اسباب کی دنیا) کو اپنے زیر نگیں کر اور آسمان پر چاند اور پروین ستارے کو ساکن کر دے' یعنی انہیں مسخر کر لے۔

۳۶- لیکن تو کوئی اور حکمت سیکھ اور حکمت سے (آگاہ ہو) اور خود کو رات اور دن کے مکر و فریب سے نجات دلا۔ مطلب یہ کہ زمان و مکاں کے گورکھ دھندے سے نکل' اس لیے کہ تیرا مقام اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔

۳۷- تیرا مقام زمان و مکاں سے باہر (بڑھ کر) ہے تو اس دائیں کو طلب کر جس کا بایاں نہیں ہے یعنی ایسی دنیا جس میں طرفیں اور جہتیں نہیں ہیں' اس لیے کہ تو جہتوں سے ماورا اور وجودِ مطلق کے عکس کا حامل ہے۔ دوسرے لفظوں میں تو اس جہان میں گم نہ ہو بلکہ اسے خود میں گم کر۔

سوال (۴)

۱- قدیم و محدث از ہم چوں جدا شد ۔۔۔ کہ ایں عالم شد آں دیگر خدا شد

۲- اگر معروف و عارف ذاتِ پاک است چہ سودا در سرِ ایں مشت خاک است

ا- قدیم اور محدث ایک دوسرے سے کیونکر جدا ہو گئے کہ ان میں سے ایک تو یہ کائنات/ عالم بن گیا یا ہو گیا اور دوسرا خدا ہو گیا؟

۲- اگر معروف اور عارف وہی ذاتِ پاک ہے تو پھر آدمی کے سر میں (جو غیر خدا ہے) یہ کیسا سودا سمایا ہوا ہے (اس ذات یا خالق سے ملنے کا سودا)

جواب

ا- خودی را زندگی ایجادِ غیر است فراقِ عارف و معروف خیر است

۲- قدیم و محدث ما از شمار است شمارِ ما طلسم روزگار است

۳- دمادم دوش و فردا می شماریم بہ ہست و بود و باشد کار داریم

۴- ازو خود را بریدن فطرتِ ماست تپیدن' نارسیدن' فطرت ماست

۵- نہ مارا در فراقِ او عیارے نہ او را بے وصالِ ما قرارے

۶- نہ او بے ما نہ ما بے او! چہ حال است فراقِ ما فراق اندر وصال است

۷- جدائی خاک رابخشد نگاہے دہد سرمایہ کوہے بکاہے

۸- جدائی عشق را آئینہ دار است جدائی عاشقاں را سازگار است

۹- اگر ما زندہ ایم از درد مندی است وگر پایندہ ایم از دردمندی است

۱۰- من و او چیست؟ اسرارِ الٰہی است من و او بر دوام ما گواہی است

۱۱- بخلوت ہم بجلوت نورِ ذات است میانِ انجمن بودن حیات است

۱۲- محبت دیدہ ور بے انجمن نیست محبت خود نگر بے انجمن نیست

ا- خودی کی زندگی اسی میں ہے کہ وہ اپنا غیر (ماسوا) پیدا کرے۔ عارف اور معروف میں فراق (ظاہری غیریت) ایک اچھی بات ہے۔ اس انائے مطلق (خدا) کا ارشاد ہے کہ میں نے چاہا کہ میں خود کو دیکھوں' میں نے یہ کائنات پیدا کر لی یعنی اس کی جلوہ گری کے لیے اس کے غیر (انائے مقید) کی ضرورت تھی۔ گویا اکائی نے دو کی حیثیت اختیار کر لی لیکن دونوں کا باہم تعلق برقرار ہے۔ دونوں میں جدائی صرف ظاہری ہے۔

۲- ہمارے قدیم اور محدث گنتی کے باعث ہیں۔ ہماری یہ گنتی زمانے کا طلسم ہے یعنی ہم

قدیم کو اپنے وجود میں اول اور محدث کو دوم شمار کرتے ہیں حالانکہ قدیم ہی نے محدث کو پیدا کیا ہے۔ ہم زمانے کو دن رات اور ماہ و سال میں تقسیم شدہ دیکھتے ہیں جبکہ وہ (زمانہ) ایک مسلسل رو ہے جو تقسیم نہیں ہوتی۔ گویا ظاہری زمانے کے اعتبار سے ایک وجود کو قدیم اور دوسرے وجود کو محدث کہنا پڑتا ہے ورنہ دونوں میں کوئی فرق یا دوری نہیں ہے۔

۳- ہم ہر پل گذری ہوئی کل اور آنے والی کل کو گنتے رہتے ہیں۔ ہمیں بس اس بات سے کام یا دلچسپی ہے کہ "یہ ہے" "یہ تھا" اور "یہ ہوگا" یعنی زمانہ ماضی و حال اور مستقبل ہی کی بات کرتے رہتے ہیں اور یوں قدیم و محدث کو گنتی کے لحاظ سے اول اور دوم سمجھتے ہیں۔ ہمارا یہ عمل یا یہ سوچ لاعلمی کے باعث ہے اور غلط ہے۔

۴- ہمارا اس سے کٹ کر یعنی جدا رہنا ہماری فطرت کا تقاضا ہے' بے قرار ہونا اور اس اصل (معروف اور قدیم) تک نہ پہنچنا ہماری فطرت ہے۔ محدث (انسان) اپنی ہستی کی خاطر اس ذات قدیم سے جدا ہونے پر مجبور تھا۔ اگر وہ ذات اپنے نظارے کے لیے کائنات پیدا نہ کرتی تو نہ کائنات ہوتی اور نہ ہمارا وجود ہوتا۔ بیقراری اس سے دوبارہ ملنے کے باعث اور اس تک نہ پہنچنا ہماری اس مجبوری کے باعث ہے کہ اگر ہم پھر اس میں شامل ہو گئے تو ہمارا وجود ختم ہو جائے گا۔

۵- نہ تو اس کی جدائی میں ہماری کوئی قدر و اہمیت ہے اور نہ اسے ہی ہمارے وصال کے بغیر قرار ہے۔ گویا اس کے لیے ہمارا وجود اپنی صفات کی جلوہ گری کی خاطر ضروری ہے جبکہ ہمیں اپنے وجود کی خاطر اس کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ اگر وہ اپنی صفات کی جلوہ گری نہ کرے تو ہمارا وجود نہ ہوگا۔ اس لحاظ سے قدیم (خدا) اور محدث (کائنات' انسان) کا باہمی ربط دونوں کے لیے بنیادی ضرورت ہے۔

۶- نہ تو وہ ہمارے بغیر ہے اور نہ ہم اس کے بغیر ہیں' یہ کیسی صورت حال ہے۔ ہمارا فرق گویا وصال کے اندر فراق ہے یعنی ہم اس ذات سے الگ ہوتے ہوئے بھی الگ نہیں ہیں۔ وہی صفات کی جلوہ گری کے حوالے سے کہا ہے۔ ہم صفاتِ الٰہی کا مظہر ہونے کے باعث گویا وصال کے مقام پر ہیں جبکہ وجود کے اعتبار سے ہم فراق میں ہیں۔

۷- جدائی خاک میں نگاہ پیدا کرتی ہے۔ ایک تنکے کو پہاڑ کا سرمایہ عطا کرتی ہے یعنی اس ذات نے اپنی جلوہ گری کے لیے اپنا غیر تخلیق کیا جو خاک کا یا مادی ہے اور اسے حیات

سے نوازا ہے۔ بصورت دیگر یہ غیر جس کی حیثیت تنکے کی سی تھی، عظمت سے محروم رہتا۔

۸۔ جدائی عشق کی آئینہ دار ہے۔ جدائی عاشقوں کے لیے سازگار ہے۔ خالق کائنات معشوق اور اس کا غیر عاشق ہے۔ جلوہ گری کے حوالے سے وہی بات دوسرے انداز میں کہی ہے۔

۹۔ اگر ہم زندہ ہیں تو یہ دردمندی کے باعث ہے اور اگر ہم پائندہ ہیں تو یہ بھی دردمندی کے باعث ہے۔ گویا انسان سوزِ عشق ہی کی بدولت زندہ و پائندہ یعنی صاحب بقا ہے ورنہ وہ محض ایک چلتی پھرتی لاش ہے۔ (اس سے پہلے شعروں میں جو کچھ کہا گیا ہے اس حوالے سے سوزِ عشق کی بات کی ہے)

۱۰۔ ''میں'' اور ''وہ'' کیا ہیں؟ یہ اللہ کے راز ہیں۔ ''میں'' اور ''وہ'' ہماری ہیشگی یا بقا کی گواہی دے رہے ہیں یعنی انائے مقید اور انائے مطلق میں جو باہمی ربط و تعلق ہے۔ وہ ایسا راز ہے جسے پالینا عقل کے بس کی بات نہیں ہے۔

۱۱۔ کیا خلوت اور کیا جلوت دونوں میں اس ذات کا نور جلوہ گر ہے۔ انجمن (جلوت) میں ہونا زندگی ہے۔ انجمن عشق کی بنیادی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ حسن کی قدر و قیمت عشق ہی کی بدولت ہے۔ اسی باعث اس ذات نے اپنا غیر پیدا کیا۔

۱۲۔ محبت انجمن کے بغیر دیدہ ور نہیں بنتی۔ محبت انجمن کے بغیر اپنا نظارہ کرنے والی بھی نہیں بنتی۔ محبت اسی وقت صحیح معنوں میں محبت بنتی ہے جب اس کا تعلق یا واسطہ انجمن سے رہے۔

۱۳۔ بہ بزمِ ما تجلی ہاست بنگر | جہاں ناپید و او پیداست بنگر

۱۴۔ در و دیوار و شہر و کاخ و کو نیست | کہ ایں جا ہیچ کس جز ما و او نیست

۱۵۔ گہے خود را ز ما بیگانہ سازد | گہے مارا چو سازے می نوازد

۱۶۔ گہے از سنگ تصویرش تراشیم | گہے نادیدہ بروے سجدہ پاشیم

۱۷۔ گہے ہر پردۂ فطرت دریدیم | جمالِ یار بے باکانہ دیدیم

۱۸۔ چہ سودا در سرایں مشت خاک است؟ | ازیں سودا درونش تابناک است

۱۹۔ چہ خوش سودا کہ نالد از فراقش | ولیکن ہم ببالد از فراقش

۲۰۔ فراقِ او چناں صاحب نظر کرد | کہ شام خویش را بر خود سحر کرد

۲۱۔ خودی را دردمند امتحاں ساخت | غمِ دیرینہ راعیش جواں ساخت

۲۲- گہر ہا سلک سلک از چشم تر برد	زنخل ماتمے شیریں ثمر برد
۲۳- خودی را تنگ در آغوش کردن	فنا را با بقا ہم دوش کردن

۱۳- ہماری محفل میں حسن معشوق کی تجلیاں ہیں' تو ذرا دیکھ یا غور کر۔ جہان کا وجود نہیں ہے جبکہ وہ (محبوب حقیقی) ظاہر ہے' دیکھ تو سہی۔ گویا اس کائنات کا وجود اس ذات کی اپنی جلوہ گری کی خواہش کے باعث ہے۔

۱۴- یہ درو دیوار اور شہر اور محل اور گلی کوچے (یعنی تمام کائنات) بے وجود ہیں' ان کا وجود نہیں ہے۔ اس لیے یہاں ہمارے اور اس کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ گویا یہ سب کچھ اس حسنِ ازل کی جلوہ گری کے نتیجے میں وجود پذیر ہوا ہے اور یہاں صرف اس محبوبِ حقیقی کا وجود حقیقی وجود ہے اور ہمارا وجود ہے کہ ہم اس حسن کی جلوہ گری کے باعث وجود میں آئے ہیں۔ ہم سے یہاں مراد ایسے انسان جو خودی کی معرفت سے آگاہ ہیں' باقی کائنات کی تمام اشیا کا وجود غیر حقیقی ہے۔

۱۵- کبھی ''وہ'' خود کو ''ہم'' سے بیگانہ بنالیتا ہے اور کبھی ہم کو ساز کی طرح بجاتا ہے۔ گویا کبھی اپنے بے رنگ ہونے کی صورت میں وہ ہم سے بیگانہ رہتا ہے اور کبھی رنگ میں آنے کی صورت میں ہمارا اپنا یا آشنا بن جاتا ہے۔

۱۶- کبھی تو ہم پتھر سے اس کی تصویر تراشتے / بناتے ہیں اور کبھی اسے دیکھے بغیر اس پر سجدے نچھاور کرنے لگتے ہیں یعنی وہ ایسا ان دیکھا مصور/ خالق ہے جس نے ہماری تصویر بنائی ہے (ہمیں وجود سے نوازا ہے) ہمارا اس کی تصویر تراشنا اور سجدے نچھاور کرنا سب اس کی دید/ اس کے نظارے کی خاطر ہے۔

۱۷- (اس کے دیدار کی خاطر) کبھی ہم نے فطرت (Nature) کا ہر پردہ چاک کر ڈالا اور محبوب کے حسن و جمال کا بیباکانہ نظارہ کیا۔ گویا خودی سے معرفت کی بدولت ہم نے اس کائنات کو مسخر کیا اور یوں یہاں کی ہر ہر شے میں ہمیں اس کے حسن کا جلوہ نظر آیا۔

۱۸- اس مٹھی بھر خاک (آدمی) کے سر میں اس محبوب کے دیدار کا یہ کیسا سودا سمایا ہے کہ اس سودا کی بدولت اس (انسان) کا باطن تابناک یا منور ہے؟ چونکہ اسے ہر ہر شے میں اس محبوب کا جلوہ نظر آتا ہے اس لیے یہ امر اس کے باطن کو روشن کرنے کا باعث بنتا ہے۔

۱۹- یہ کیسا اچھا سودا ہے کہ جو اس کے ہجر میں نالہ وزاری کر رہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اسی محبوب کے فراق میں نشوونما بھی پا رہا ہے۔ گویا وہ (انسان جو معرفت خودی

سے آشنا ہے) ارتقائی منزلیں طے کر کے خدا کا نائب بن رہا ہے یعنی حقیقی معنوں میں وہ کائنات میں خدا کا خلیفہ بن رہا ہے۔

۲۰۔ اس (ذات) کے فراق نے اسے ایسا صاحب نظر کر دیا کہ اس نے اپنی شام کو خود پر سحر کر لیا۔ گویا حسن ازل نے جب کائنات میں جلوہ نمائی کی اور خود سے جدا ہوا تو اس (حسن) نے اپنی قدر و اہمیت سے آگاہی رکھنے والا تخلیق کر لیا جو صاحب نظر بن کر اس کے نظارے میں محو ہے۔

۲۱۔ اس نے خودی کو فراق کی آزمایش کا دردمند بنا دیا اور پرانے غم کو تازہ اور شاداب کر کے عیش کی صورت دے دی۔ گویا اس جدائی کی بدولت خودی درد سے آشنا ہو گئی اور اس کے لیے غم، عیش بن گیا۔

۲۲۔ وہ بھیگی آنکھوں سے آنسوؤں کے موتیوں کی بہت سی لڑیاں لے گیا اور ماتمی درخت سے میٹھا پھل لے گیا۔ گویا غم کی جگہ عیش و مسرت نے لے لی۔

۲۳۔ خودی کو مضبوطی کے ساتھ اپنے پہلو میں لینا گویا فنا کو بقا کا ہم پلہ/ برابر کا کرنا ہے۔ گویا خودی مطلق (یا انائے مطلق) جب پوری طرح انائے مقید میں سما جاتی ہے تو اس میں انائے مطلق کی صفات آ جانے سے اس کی بقا کا سامان ہو جاتا ہے۔

۲۴۔ محبت؟ در گرہ بستن مقامات — محبت؟ درگذشتن از نہایات
۲۵۔ محبت ذوقِ انجامے ندارد — طلوعِ صبح او شامے ندارد
۲۶۔ براہش چوں خرد پیچ و خمے ہست — جہانے در فروغِ یک دمے ہست
۲۷۔ ہزاراں عالم افتد در رہِ ما — بپایاں کے رسد جولان گہ ما
۲۸۔ مسافر! جاوداں زی جاوداں میر — جہانے را کہ پیش آید فراگیر
۲۹۔ بہ بحرش گم شدن انجام مانیست — اگر اورا تو در گیری فنانیست
۳۰۔ خودی اندر خودی گنجد محال است — خودی را عین خود بودن کمال است

۲۴۔ محبت کیا ہے؟ محبت مقامات کو گرہ میں باندھنا ہے۔ محبت کیا ہے؟ محبت حدود یا انتہاؤں سے گذر جانا ہے۔ گویا راہِ معرفت و سلوک کی منزلیں طے کرتے ہوئے محبوب حقیقی تک رسائی کا نام محبت ہے۔ ریاضت، مجاہدہ اور مراقبہ وغیرہ ایک طرح سے منزلیں ہیں اور سالک ان سے اور زمان و مکاں کی حدود سے گذر کر اصل منزل (دیدار محبوب) تک پہنچتا ہے۔

۲۵- محبت میں انجام کا ذوق نہیں ہے۔اس کی صبح کے طلوع کی کوئی شام نہیں ہے۔محبت میں محبوب تک رسائی کے لیے ایک مسلسل تڑپ اور جذبہ برقرار رہتا ہے اور یہ تڑپ اور جذبہ محبوب کی بارگاہ میں پہنچ کر بھی زندہ و پایندہ رہتا ہے، ختم نہیں ہوتا۔اگر ختم ہو جائے تو محبت بھی ختم ہو جاتی ہے۔مومن خان مومن نے مجازی محبت سے متعلق کچھ یہی بات کی ہے:

مرگ ہے انتہائے شوق یاں رہی ابتدائے عشق
زندگی اپنی ہو گئی رنجش بار بار میں

۲۶- اس کی راہ میں عقل و خرد کی طرح بل اور خم ہیں۔اس (محبت) کے ایک پل کی تجلی میں ایک دنیا ہوتی ہے۔محبت کی راہ میں بڑے دشوار گذار مرحلے آتے ہیں جن سے گھبرا کر عقل یہ سفر چھوڑ دیتی ہے جبکہ ایک سچا عاشق ان دشوار گذار مرحلوں کی پروا کیے بغیر انہیں طے کرتے ہوئے ہر لمحہ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ایک پل کی تجلی میں ایک دنیا ہونے سے مراد بھی کچھ یہی بنتی ہے۔

۲۷- ہمارے یعنی محبت کے راستے میں ہزاروں دنیائیں آتی ہیں۔ہماری جولان گاہ کیونکر اختتام کو پہنچے گی، اس لیے کہ یہ تو لامحدود اور بے پایاں ہے۔محبت کا سفر ختم نہیں ہوسکتا، یہ جاری رہتا ہے، اس کے ختم ہونے کا سوچنا محبت سے دور ہونے والی بات ہوگی۔

۲۸- اے راہِ معرفت کے مسافر ہمیشہ زندہ رہ اور ہمیشہ مر، جو جہان بھی سامنے آئے اسے پکڑ لے یعنی مسخر کر۔مطلب یہ کہ ہمیشہ کا زندہ رہنا خود کو اس ذات اقدس کی صفات کا مظہر بنا کر اپنی بقا کا سامان کرنا ہے جبکہ خود کو اس میں فنا کر لینا ہمیشہ کا مرنا ہے۔یہ گویا قطرے کا دریا میں پڑ کر دریا بن جانا اور اپنا وجود ختم کر لینا ہے۔

۲۹- اس کے سمندر میں گم ہو جانا ہمارا انجام نہیں ہے۔اگر تو اسے خود میں سما لے تو یہ فنا نہیں بقا ہوگی۔گویا خودی کا کمال یہ ہے کہ وہ خود کو کسی اور کی خودی میں جذب کرنے کی بجائے اسے خود میں جذب کر لے۔

۳۰- خودی کا (کسی اور کی) خودی میں سمانا مشکل ہے۔خودی کا کمال تو اپنے ظہور میں ہے۔شعر ۲۹ والی بات۔

سوال (۵)

کہ من باشم مرا از ''من'' خبر کن　　　چہ معنی دارد ''اندر خود سفر کن؟''

= میں کون ہوں، مجھے ''من'' (میں) سے آگاہ کر اور ''خود میں سفر کر'' کا کیا مطلب ہے؟

جواب

۱- خودی تعویذِ حفظِ کائنات است ‌‌ نخستیں پرتو ذاتش حیات است

۲- حیات از خوابِ خوش بیدار گردد ‌‌ درونش چوں یکی بسیار گردد

۳- نہ او را بے نمود ما کشودے ‌‌ نہ مارا بے کشودِ او نمودے

۴- ضمیرش بحر ناپیدا کنارے ‌‌ دلِ ہر قطرہ موجِ بیقرارے

۵- سر و برگِ شکیبائی ندارد ‌‌ بجز افراد پیدائی ندارد

۶- حیات آتش، خودی ہا چوں شرر ہا ‌‌ چو انجم ثابت و اندر سفر ہا

۷- زِخود نارفتہ بیروں غیر بین است ‌‌ میانِ انجمن خلوت نشین است

۸- یکے بنگر بخود پیچیدنِ او ‌‌ زخاکِ پے سپر بالیدنِ او

۹- نہاں از دیدہ ہا درہائے و ہوئے ‌‌ دمادم جستجوئے رنگ و بوئے

۱۰- زسوزِ اندروں درجست و خیز است ‌‌ بہ آئینے کہ با خود درستیز است

۱۱- جہاں را از ستیز او نظامے ‌‌ کف خاک از ستیز آئینہ فامے

۱۲- نریزد جز خودی از پر تو او ‌‌ نخیزد جز گہر اندر زوِ او

۱۳- خودی را پیکر خاکی حجاب است ‌‌ طلوعِ او مثالِ آفتاب است

۱۴- درونِ سینہ ما خاورِ او ‌‌ فروغِ خاکِ ما از جوہر او

۱- (خدا کی) خودی کائنات کے تحفظ کا تعویذ ہے۔ اس کی ذات کا پہلا پرتو حیات ہے۔ گویا جب اس ذات میں تجلی کا شوق پیدا ہوا تو وہ تنہا تھا اور اس کی صفات بھی اسی میں گم تھیں۔ اس (ذات) نے سب سے پہلے آئینہ نورِ محمدیؐ میں خود کو ظاہر کیا اور یوں نورِ محمدیؐ ہی سے اس نے کائنات اور اس کی ہر شے تخلیق کی۔

۲- حیات میٹھی/گہری نیند سے بیدار ہو جاتی ہے (یا ہوگئی) اس کی اندر کی اکائی کثرت کی صورت اختیار کر لیتی ہے (یا اختیار کر لی) گویا وحدتِ ایزدی نے اپنے ظہور کی خاطر کثرت اختیار کر کے ہر شے میں جلوہ گر ہوگئی۔

۳- نہ تو اس کا ہمارے ظہور/وجود کے بغیر ظہور ہو سکتا ہے اور نہ اس کے ظہور کے بغیر ہمارا نمود ممکن ہے۔ مطلب یہ کہ خودی/انائے مطلق اور انائے مقید دونوں کا وجود ایک

دوسرے کے لیے ضروری ہے۔ وہ الگ بات کہ اس کے وجود ہی سے ہمارا وجود ہے' ہمارا وجود نہ بھی تو بھی اس کا وجود تو قائم ہے۔

۴- اس کا ضمیر ایک بے حد وسیع سمندر ہے۔ اس سمندر کے ہر قطرے کا دل ایک بیقرار موج ہے۔ قطرہ سے مراد انائے مقید اور سمندر سے مراد انائے مطلق ہے۔ جس طرح قطرہ سمندر سے جدا نہیں اسی طرح انائے مقید' انائے مطلق سے جدا نہیں اور اس میں ذات کی صفات جلوہ گر ہیں۔

۵- اس (حیات) میں صبر و قرار کا حوصلہ نہیں ہے۔ افراد کے بغیر ظاہر نہیں ہوتی۔ گویا حیات بالصفات اپنے ظہور کے لیے ہر وقت بیقرار رہتی ہے اور ہر لمحہ نت نئی صورتوں میں جلوہ گر ہو کر اکائی سے کثرت میں نمودار ہوتی ہے۔

۶- زندگی' آگ ہے اور مختلف چیزوں کی خودیاں گویا چنگاریاں ہیں۔ وہ (زندگی) ستاروں کی طرح ساکن بھی ہے اور سفروں میں بھی رہتی ہے۔ زندگی سے مراد حیات جو ذات بالصفات ہے۔ جس طرح چنگاریاں آگ سے جدا نہیں ہوتیں اسی طرح صفات اور ذات باہم لازم و ملزوم ہیں یا صفات بھی ذات سے جدا نہیں ہیں۔ حیات اپنی ذات میں تو ساکن ہے لیکن جب اس کا ظہور اشیا میں ہوتا ہے تو وہ جیسے سفر کرنے لگتی ہے۔

۷- وہ (حیات) اپنی ذات سے باہر نہ جا کر یعنی اپنی جگہ برقرار رہ کر دوسروں کو دیکھنے والی ہے۔ وہ محفل میں بھی خلوت نشیں ہے۔ مطلب یہ کہ وہ اگرچہ تمام اشیا میں موجود ہے پھر بھی ان سب سے الگ تھلگ یا جدا ہے۔

۸- تو ذرا اس کا اپنے آپ سے لپٹنا / چمٹنا دیکھ اور پاؤں تلے روندی ہوئی خاک سے اس کا باہر آنا ملاحظہ کر۔ گویا حیات اپنی نمود کے لیے بے چین رہتی ہے اور اس کی خاطر وہ معمولی ترین شے میں بھی ظہور پذیر ہو جاتی ہے۔

۹- وہ (حیات) ہماری نظروں سے تو چھپی ہوئی ہے لیکن ہر جگہ اس کا ہنگامہ جاری ہے۔ وہ اپنے ظہور کی خاطر ہر لحظہ رنگ و بو کی تلاش میں رہتی ہے۔ گویا اشیا کے وجود سے حیات کے وجود کا پتا چل جاتا ہے۔ یہاں بھی اس کی بیقراری کے حوالے سے اس کی رنگ و بو کی تلاش کی بات کی ہے۔

۱۰- وہ اپنے اندر کے سوز سے کچھ اس انداز میں حرکت و عمل میں رہتی ہے کہ جیسے وہ خود

سے نبرد آزما ہو یا خود سے جنگ کر رہی ہو۔ اپنے ظہور و وجود کے لیے خود سے تقاضا کرتی اور اس خاطر خود کو مصروفِ عمل رکھتی ہے۔

۱۱۔ اس کائنات کا نظام اس کی اسی خود سے جنگ کے باعث ہے۔ مٹھی بھر مٹی اسی ستیز (جنگ سے) آئینہ فام بن جاتی ہے۔ گویا انسان بھی اس کے مصروفِ عمل رہنے سے منور ہو جاتا ہے۔

۱۲۔ اس کے پرتو سے خودی کے سوا اور کچھ نہیں ٹپکتا اور اس کے سمندر سے موتی کے سوا اور کچھ نہیں ابھرتا۔ گویا انائے مطلق خود سے لپٹنے کے عمل سے قبل حیات میں ظہور کرتی اور پھر اس (حیات) کے ذریعے تمام اشیا میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔

۱۳۔ خودی کے لیے آدم خاکی کا جسم گویا حجاب ہے۔ اس (خودی) کا طلوع سورج کی مانند ہے۔ یہاں خودی سے مراد خالق کی جلوہ گری ہے جو انسانی سینے کو منور کیے ہوئے ہے۔ پیکر خاکی سے مراد مادی جسم ہی ہو سکتا ہے۔ گویا انسان روحانیت پر توجہ دے تو اسے یہ جلوہ نمائی واضح طور پر نظر آئے گی۔

۱۴۔ ہمارے سینے میں اس کا آفتاب ہے۔ ہماری مٹی کی چمک دمک اس جوہر کے باعث ہے۔ گویا وہ ذاتِ مطلق صفاتی رنگ میں ہم میں سمائی ہوئی ہے۔ رونق افروز یا جلوہ نما ہے:

۱۵۔ تو می گوئی مرا از "من" خبر کن — چہ معنی دارد "اندر خود سفر کن؟"
۱۶۔ ترا گفتم کہ ربط جان و تن چیست — سفر در خود کن و بنگر کہ "من" چیست
۱۷۔ سفر در خویش؟ زادن بے اب و مام — ثریا را گرفتن از لب بام
۱۸۔ ابد بردن بیک دم اضطرابے — تماشا بے شعاعِ آفتابے
۱۹۔ ستردن نقش ہر امید و بیمے — زدن چا کے بدریا چوں کلیمے
۲۰۔ شکستن ایں طلسم بحر و برّرا — ز انگشتے شگافیدن قمر را
۲۱۔ چناں باز آمدن از لامکانش — درونِ سینہ او' در کف جہانش
۲۲۔ ولے ایں راز راگفتن محال است — کہ دیدن شیشہ و گفتن سفال است
۲۳۔ چہ گویم از "من" واز توش و تابش — کند "اناعرضنا" بے نقابش
۲۴۔ فلک را لرزہ برتن از فرِ او — زمان و ہم مکاں اندر برِ او
۲۵۔ نشیمن را دلِ آدم نہاد است — نصیب مشت خاکے او فتاد است
۲۶۔ جدا از غیر وہم وابستہ غیر — گم اندر خویش و ہم پیوستہ غیر

۲۷- خیال اندر کفِ خاکے چسان است؟ کہ سیرش بے مکان و بے زمان است

۲۸- بزندان است و آزاد است' ایں چیست؟ کمند و صید و صیاد است' ایں چیست؟

۲۹- چراغے درمیان سینہ تست چہ نور است ایں کہ در آئینہ تست؟

۳۰- مشو غافل کہ تو او را امینی چہ نادانی کہ سوئے خود نہ بینی

۱۵- تو یہ کہتا ہے کہ مجھے ''من'' (میں) کے بارے میں بتا' بھلا ''اپنے اندر سفر کر'' سے کیا مراد ہے۔

۱۶- میں نے تجھے بتایا تھا کہ جان اور جسم کا باہمی ربط کیا ہے۔ تو اپنے اندر سفر کر اور دیکھ لے کہ ''من'' کیا ہے۔ اس ربط کو سمجھنے پر تجھ پر یہ کھل جائے گا کہ ''من'' انائے مطلق ہی کی تعیناتی صورت کا نام ہے۔

۱۷- اپنے اندر سفر کرنا کیا ہے۔ وہ ماں باپ کے بغیر پیدا ہونا یا وجود میں آنا ہے اور پروین ستاروں کو (جو تعداد میں چھ ہیں) آسمان سے چھت سے پکڑ لینا ہے۔ مطلب یہ کہ خود کو اس انائے مطلق کے جلوے کی آماجگاہ بنا کر ایک نیا وجود (یا نئی صورت) دینا ہے اور یوں خود کو مٹی سے گویا سونا بنانا ہے۔ دوسرے لفظوں میں خود میں ڈوب کر یعنی اپنی معرفت حاصل کرنے کے بعد انسان صحیح معنوں میں خدا کا نائب بنے گا اور اس طرح کائنات کی ہر شے (زمین و آسمان کی ہر شے) اس کی تابع ہو جائے گی۔

۱۸- بیقراری کو ایک پل میں ہمیشہ کے لیے لے جانا گویا سورج کی شعاع کے بغیر تماشا کرنا (دیکھنا) ہے۔ جب انسان ابدی زندگی پا لے تو اس میں ایسی اہلیتیں اور صلاحیتیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ وہ ظاہری روشنی کے بغیر بھی کائنات کی اشیا دیکھ لیتا ہے۔

۱۹- (ان شعروں میں اپنے اندر سفر کرنے کے نتیجے میں حاصل ہونے والی صلاحیتوں کا تذکرہ ہے) یہ (سفر) ہر امید و خوف کا نقش مٹا دیتا ہے اور حضرت موسیٰؑ کلیم اللہ کی طرح دریا میں شگاف پیدا کر دینا ہے (قرآنی تلمیح)

۲۰- بحر و بر کے اس طلسم کا توڑ کرنا ہے اور انگلی کے اشارے سے چاند کو دو ٹکڑے کر دینا ہے۔ حضور اکرمؐ کے معجزے کے حوالے سے بات کی ہے (گویا سمندر کا طلسم حضرت موسیٰؑ نے اور خشکی کا طلسم حضور اکرمؐ نے توڑا۔ یہ مثال ہے)

۲۱- اس (ذاتِ اقدس) کے لامکاں سے اس طرح واپس آنا ہے کہ سینے/ دل میں وہ ذاتِ اقدس سمائی ہو جبکہ ہتھیلی میں یہ جہان ہو۔ حضور اکرمؐ کے واقعۂ معراج کی طرف

اشارہ ہے۔

۲۲۔ (اس سے پہلے شعر میں جو کہا ہے' اس کے حوالے سے علامہ کہتے ہیں) لیکن اس راز کے بارے میں کچھ کہنا محال ہے کہ شیشہ دیکھ کر یہ کہنا کہ یہ تو ٹھیکرا ہے۔ گویا اس حقیقت کی وضاحت الفاظ میں نہیں ہو سکتی' اس صورت میں تو اور الجھاؤ پڑ جائے گا۔

۲۳۔ میں ''من'' اور اس کی قوت اور چمک/تجلی کے بارے میں کیا کہوں۔ اسے ''انا عرضنا'' بے نقاب کرتی ہے یعنی لفظوں میں اس کی وضاحت مشکل ہے۔ اس ضمن میں سورۂ الاحزاب' آیت ۷۲ کا حوالہ دیا ہے (فرہنگ دیکھیے) اس آیت کے حوالے سے شیخ سعدی' حافظ شیرازی اور میر تقی میر اور بعض دوسرے شعرا نے بھی بات کی ہے۔

سعدی:

مرا گناہِ خود است ار ملامت تو برم
کہ عشق بارِ گراں بود و من ''ظلوم و جہول''

(اگر میں تیری ملامت اٹھاتا ہوں تو اس میں میرا اپنا گناہ یا میری اپنی خطا ہے' کیونکہ عشق بہت بھاری بوجھ تھا اور میں ٹھہرا ظلوم و جہول)

حافظ:

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

(آسمان' امانت کا بوجھ نہ اٹھا سکا' چنانچہ قضا و قدر کے کارکنوں نے قرعہ فال مجھ دیوانے کے نام پر ڈال دیا)

میر:

کی عرض جو متاعِ امانت ازل کے بیچ
جب اور لے سکے نہ' خریدار ہم ہوئے

۲۴۔ اس (من) کی شان و شوکت سے آسمان پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ زمان اور مکاں دونوں اس کے پہلو میں ہیں یعنی اسی کے تابع ہیں۔

۲۵۔ اس کے آشیانے کے لیے انسان کا دل بنیاد ہے اور وہ یعنی دل صرف آدم خاکی/انسان ہی کو نصیب ہوا ہے۔ گویا یہ انسانی دل ہی تھا جس کی بدولت انسان نے عشق الٰہی کی امانت کا بوجھ اٹھا لیا جبکہ دوسری مخلوق محروم رہی۔

۲۶- وہ (من) غیر یعنی ماسوا سے جدا بھی ہے اور اس سے وابستہ بھی۔ وہ اپنے آپ میں گم/محو بھی ہے اور غیر سے پیوستہ (ملا ہوا) بھی ہے۔ گویا وہ ہر شے سے جدا ہوتے ہوئے بھی اس میں موجود ہے)

۲۷- مٹھی بھر خاک یعنی انسان میں خیال کیا چیز ہے؟ کہ اس کی سیر زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہے۔ وہ (خیال) جہاں چاہے اور جب چاہے جا سکتا ہے۔

۲۸- وہ قید خانے میں ہے اور پھر بھی آزاد ہے' یہ کیا بات ہے؟ وہی کمان ہے' وہی شکار ہے اور وہی شکاری ہے' یہ کیا عجیب بات ہے۔

۲۹- یہ تیرے سینے کے اندر ایک چراغ ہے۔ یہ کیسا نور ہے جو تیرے آئینے میں ہے۔ سینے یا دل کو آئینے سے تشبیہ دی ہے۔ جس طرح آئینے میں بڑی چمک ہے۔ اسی طرح مذکورہ سفر سے دل سراپا نور بن جاتا ہے۔

۳۰- تو اس سے غافل نہ ہو کہ تو اس کا امانت دار ہے۔ تو کیسا نادان ہے کہ اپنی طرف نہیں دیکھتا۔ اتنی اہم اور قدر و قیمت والی شے پر توجہ نہ کرنا نادانی ہے' لہٰذا اس نادانی اور غفلت سے بچ کر اپنی بقا کا سامان کر۔

سوال (۶)

چہ جزو است آں کہ او از کل فزون است؟ طریق جستن آں جزو چون است؟

= وہ کون سا جزو ہے جو کل سے بڑھ کر ہے۔ اس جزو کو تلاش کرنے کا کیا طریقہ ہے؟

جواب

۱- خودی ز اندازہ ہائے ما فزون است — خودی زاں کل کہ تو بینی فزوں است
۲- زگردوں بار بار افتد کہ خیزد — بہ بحر روزگار افتد کہ خیزد
۳- جز او در زیر گردوں خودنگر کیست؟ — بہ بے بالی چناں پرواز گر کیست
۴- بہ ظلمت ماندہ و نورے در آغوش — بروں از جنت و حورے در آغوش
۵- بہ آں نطقے دل آویزے کہ دارد — زقعر زندگی گوہر بر آرد
۶- ضمیر زندگانی جاودانی است — بچشم ظاہرش بینی' زمانی است
۷- بتقدیرش مقام ہست و بود است — نمودِ خویش و حفظ ایں نمود است

۸- چہ می پرسی چہ گون است و چہ گوں نیست | کہ تقدیر از نہادِ او بروں نیست

۹- چہ گویم از چگون و بے چگونش | بروں مجبور و مختار اندرونش

۱۰- چنیں فرمودۂ سلطان بدر است | کہ ایماں درمیانِ جبر و قدر است

۱۱- تو ہر مخلوق را مجبور گوئی | اسیر بند نزد و دور گوئی

۱۲- ولے جاں از دمِ جاں آفرین است | بچندیں جلوہ ہا خلوت نشین است

۱۳- زجبر او حدیثے درمیاں نیست | کہ جاں بے فطرتِ آزاد جاں نیست

۱۴- شبیخون بر جہانِ کیف و کم زد | زمجبوری بہ مختاری قدم زد

۱- خودی ہمارے اندازوں سے بڑھ کر ہے' خودی اس کل سے جسے تو دیکھتا ہے' بڑھ کر ہے۔کل سے مراد کائنات ہے' جس میں خودی کو عام انسان محض ایک نقطہ سمجھتا ہے جبکہ درحقیقت اور اربابِ بصیرت کی نظر میں خودی کائنات سے افضل و برتر ہے۔

۲- وہ آسمان سے بار بار گرتی ہے تاکہ ابھرے۔وہ (خودی) زمانے کے سمندر میں گرتی ہے تاکہ ابھرے یعنی خودی میں بلندی ہے' وہ انسانی بدن میں اس خاطر مقید ہو جاتی ہے تاکہ جہد و عمل سے وہ اس قید سے آزاد ہو جائے۔دوسرے لفظوں میں خودی اپنا غیر ایجاد کرتی ہے تاکہ اس سے ٹکرا کر وہ اپنی اہلیتوں صلاحیتوں کا اظہار کرے۔

۳- اس کے سوا آسمان کے نیچے (زمان و مکاں میں) اور خودنگر کون ہے؟ بال و پر نہ ہونے کے باوجود اس قدر پرواز کرنے والا اور کون ہے؟ گویا اپنی ذات کی معرفت کائنات میں انسانی خودی کے سوا کسی دوسری مخلوق میں نہیں ہے۔

۴- وہ تاریکی میں (انسانی بدن میں) رہنے کے باوجود جنت سے تو باہر ہے لیکن حور اس کی آغوش میں ہے۔گویا خودی خودنورانی ہے۔اس کی وضاحت یوں کی ہے کہ جنت سے باہر رہنے کے باوجود حور اس کی گود میں ہے۔

۵- وہ اپنی دل نشین قوتِ گویائی سے زندگی کے سمندر کی گہرائی سے موتی باہر لاتی ہے۔ قوتِ گویائی سے مراد ادراک کلیات اور موتی سے مراد اسرار و رموزِ زندگی ہے یعنی اپنی خودی سے آشنا ہونے والا انسان علمی حقیقتیں بیان کرسکتا ہے۔

۶- زندگی کا ضمیر ہمیشہ رہنے والا ہے۔اگر تو اسے ظاہری آنکھ سے دیکھے گا تو وہ زمانی یعنی عارضی ہے۔زمانے سے تعلق رکھنے کی بنا پر وہ زمانے کی طرح بظاہر تبدیلیوں کا شکار نظر آئے گی لیکن اہل مشاہدہ کے دیدۂ باطن میں وہ انائے مطلق کا پرتو نظر آتی ہے'

اس بنا پر وہ انائے مطلق کی طرح جاودانی ہے۔

۷- اس کی تقدیر میں ہست و بود کا یہ مقام (کائنات) ہے جس میں ماضی و حال کے زمانے ہیں' وہ اس زمانے میں رہ کر اپنی نمود چاہتی ہے' جو وہ کرتی ہے اور اس کا تحفظ بھی کرتی ہے۔

۸- تو یہ کیا پوچھتا ہے کہ وہ کیسی ہے اور کیسی نہیں ہے؟ کہ اس کی تقدیر اس کی فطرت سے باہر نہیں ہے یعنی وہ اپنی تقدیر خود بناتی ہے۔ علامہ نے ''اپنی تقدیر خود بنانے'' کے حوالے سے اردو میں یوں کہا ہے:

عبث ہے شیوۂ تقدیر یزداں
تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے

۹- میں اس کے کیسے ہونے اور کیسے نہ ہونے (اس کی ماہیت) کے بارے میں کیا بتاؤں۔ بس یوں سمجھو کہ وہ اپنے ظاہر میں مجبور اور اندر/ باطن سے مختار ہے۔ بظاہر وہ انسانی جسم میں ہونے کے باعث مجبور معلوم ہوتی ہے لیکن چونکہ وہ جو چاہے کر سکتی ہے اس لیے وہ صحیح معنوں میں مختار ہے۔

۱۰- سلطانِ بدر حضور اکرمؐ کا یہ فرمان (حدیث) ہے کہ ایمان جبر اور قدر کے درمیان ہے۔ گویا انسان نہ تو مکمل طور پر مجبور ہے کہ کچھ نہ کر سکے اور نہ مکمل طور پر مختار ہے کہ جو خواہش رکھے پوری کر لے۔ اسی طرح انسانی خودی بھی انسانی جسم میں قید (مجبور) تو ہے' تاہم کئی ایک معاملات میں با اختیار ہے۔

۱۱-۱۲: تو ہر مخلوق کو مجبور کہتا ہے اور نزدیک اور دور یعنی زمان و مکاں کا اسیر کہتا ہے لیکن جان اس جان پیدا کرنے والے کے دم سے ہے جو (جان/ روح) اپنے بہت سے جلوؤں کے باوجود خلوت نشین ہے۔ ارشادِ ایزدی ہے کہ جب میں نے آدم کو بنا لیا تو اس میں اپنی روح پھونک دی۔ اس بنا پر جان کو فنا نہیں ہے' یہاں جان سے مراد وہ جان نہیں جو ہر جاندار اور جانور میں ہوتی ہے جس کے نکلنے سے وہ مر جاتا ہے بلکہ اس سے مراد روحِ ایزدی ہے جسے فنا نہیں ہے۔

۱۳- جب جبر کی بات کی جاتی ہے تو اس روح کے جبر کی بات درمیان میں نہیں ہوتی' اس لیے کہ روح' آزاد فطرت کے بغیر روح نہیں ہے یعنی وہ مجبورِ محض نہیں ہے۔

۱۴- اس نے اس کیف و کم کے جہان یعنی مادی اور زمان و مکاں والی دنیا پر شب خون مارا

اور یوں مجبوری سے مختاری کی طرف قدم زن ہوئی (چلی) خودی اس جبر کی دنیا سے باہر اور اختیار کی دنیا میں ہے جس کی بنا پر اس میں یہ قوت ہے کہ وہ کائنات کی ہر شے کو تسخیر کر سکتی ہے' بصورت دیگر وہ ایسا نہ کر سکتی۔

۱۵- چو از خود گردِ مجبوری فشاند جہانِ خویش را چوں ناقہ راند
۱۶- نگردد آسماں بے رخصت او نہ تابد اخترے بے شفقت او
۱۷- کند بے پردہ روزِ مضمرش را بچشم خویش بیند جوہرش را
۱۸- قطارِ نوریاں در رہ گذار است پے دیدار او در انتظار است
۱۹- شراب افرشتہ از تاکش بگیرد عیارِ خویش از خاکش بگیرد

۱۵- جب وہ (خودی) اپنے آپ سے مجبوری کی گرد جھاڑ دیتی ہے تو پھر وہ اپنی دنیا کو اونٹنی کی طرح ہانکتی ہے۔ درجۂ اختیار پا لینے کے بعد وہ دوسروں کی محتاجی سے بچ جاتی ہے۔

۱۶- (پھر یہ صورت ہو جاتی ہے کہ) آسمان بھی اس کی اجازت کے بغیر گردش نہیں کرتا اور کوئی ستارہ بھی اس کی شفقت کے بغیر نہیں چمکتا یعنی کائنات اس کی تابع ہو جاتی ہے۔

۱۷- وہ (خودی) اس (زمانے) کے پوشیدہ/ چھپے ہوئے دن کو بے پردہ کر دیتی یعنی ظاہر کر دیتی ہے اور پھر اپنی آنکھوں سے اس کے جوہر کو دیکھتی ہے۔ گویا زمانے کی ہر طرح کی حقیقت اس کے سامنے آجاتی یا اس پر منکشف ہو جاتی ہے اور وہ اس (کائنات/ زمانے) کے باطن کا بھی تماشا کر لیتی ہے۔

۱۸- فرشتوں کی قطاریں اس کی راہ گذر میں لگی ہوئی ہیں اور وہ اس کے دیدار کے منتظر رہتے ہیں۔ گویا ایک صاحبِ خودی کا مقام فرشتوں سے بڑھ کر اور افضل ہے اور انہیں بھی ایسے انسان کو دیکھنے کی خواہش ہوتی ہے۔

۱۹- فرشتہ اس کی تاک سے شراب حاصل کرتا ہے جبکہ اپنی قدر و قیمت اس کی خاک سے حاصل کرتا ہے۔ فرشتے جیسی مخلوق بھی اس صاحبِ خودی کی تابع فرمان اور اس کی مشتاق بن جاتی ہے۔

۲۰- چہ پرسی از طریق جستجویش فرو آرد مقامِ ہائے و ہویش
۲۱- شب و روزے کہ داری بر ابد زن فغانِ صبح گاہے بر خرد زن
۲۲- خرد را از حواس آید متاعے فغاں از عشق می گیرد شعاعے
۲۳- خرد جز را فغاں کل را بگیرد خرد میرد فغاں ہرگز نہ میرد

۲۴۔ خرد بہر ابد ظرفے ندارد نفس چوں سوزنِ ساعت شمارد

۲۵۔ تراشد روز ہا شب ہا، سحرہا نگیرد شعلہ و چیند شرر ہا

۲۶۔ فغانِ عاشقاں انجامِ کارے است نہاں دریک دم او روزگارے است

۲۰۔ تو اس (صاحب خودی) کو تلاش کرنے کے طریقے کے بارے میں کیا پوچھتا ہے۔ وہ اس ذات اقدس کے مقام عشق کو اپنے اندر سمو لیتا ہے۔

۲۱۔ تو اپنے شب و روز یعنی حالت عشق میں گذرنے والے شب و روز (زمانہ) کو جاودانی کرلے اور اپنی صبح کی آہ و فغاں یا فریاد کو عقل پر لگا۔ دوسرے لفظوں میں عقل کی بجائے عشق کی پیروی اختیار کر۔

۲۲۔ عقل کو تو حواس سے دولت ہاتھ لگتی ہے جبکہ فریاد و فغاں عشق سے شعاع/ روشنی حاصل کرتی ہے۔ خرد کا سارا زور حواس خمسہ کے حوالے سے ہے اور عشق سے روشنی حاصل کرنے کا مطلب ہوگا کہ فریاد و فغاں بھی گویا عشق ہی ہے۔

۲۳۔ خرد تو جزو کو اور فغاں کل کو اپنے قابو میں لاتی ہے۔ خرد تو مرجاتی ہے لیکن فغاں نہیں مرتی۔ خرد جاودانی نہیں بلکہ عارضی اور وقتی ہے جبکہ عشق ابدی و جاودانی ہے۔

۲۴۔ خرد میں اپنے جاودانی یا صاحب بقا ہونے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ وہ تو اپنے سانس گھڑی کی سوئی کی طرح گنتی رہتی ہے۔ مطلب یہ کہ اس کی تمام تر توجہ زمانے کے ظاہر پر ہے۔

۲۵۔ وہ (خرد) دن، راتیں اور صبحیں تراشتی رہتی ہے، شعلہ حاصل نہیں کرتی بس چنگاریاں ہی چنتی رہتی ہے یعنی وہ دن رات ہی کے چکر میں پڑی رہتی ہے اور کوئی عظیم کارنامہ انجام نہیں دے سکتی۔ اس شعر میں فاعل معلوم نہیں۔ اگر یہ عشق سے متعلق ہے تو اس کا مطلب ہوگا کہ عشق اپنے دن رات خود پیدا کرتا ہے اور وہ زمانے کا پابند تو نہیں البتہ زمانہ پر عبور رکھتا ہے اور اپنی دنیا آپ پیدا کرتا ہے۔ علامہ ہی کے بقول:

ع اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے

۲۶۔ عاشقوں کی فریاد انجام کو پہنچنے والی ہے۔ اس کے ایک پل میں ایک زمانہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ عشق عقل کی طرح نتیجہ سے عاری نہیں بلکہ نتیجہ خیز ہوتا ہے اور وہ زمانے کا نہیں بلکہ زمانہ اس کا محتاج ہے۔

۲۷- خودی تا ممکناتش وا نماید گرہ از اندرونِ خود کشاید
۲۸- ازاں نورے کہ وابینند نداری تو اورا آنی و فانی شماری
۲۹- ازاں مرگے کہ می آید چہ باک است خودی چوں پختہ شد از مرگ پاک است
۳۰- زمرگِ دیگرے لرزد دلِ من دلِ من، جانِ من، آب و گلِ من
۳۱- زکارِ عشق و مستی برفتادن شرارِ خود بخاشاکے ندادن
۳۲- بدست خود کفن بر خود بریدن بچشمِ خویش مرگِ خویش دیدن
۳۳- ترا ایں مرگ ہر دم در کمین است بترس ازوے کہ مرگِ ما ہمین است
۳۴- کند گورِ تو اندر پیکر تو نکیر و منکر او در بر تو

۲۷- خودی، اس خاطر کہ وہ اپنے ممکنات کا اظہار کرے، اپنے اندر کی گرہ/ گتھی کھول لیتی ہے۔ یہ جان کر کہ وہ کیا کچھ کر سکتی ہے، وہ اپنے اندر پوشیدہ صلاحیتوں اور قوتوں کو باہر لاتی اور ان سے دنیا والوں کے لیے کام لیتی ہے۔

۲۸- وہ نور، جس سے واضح طور پر دیکھا جا سکے، تجھ میں نہیں ہے۔ تو تو اسے یعنی خودی کو وقتی/ عارضی اور فانی سمجھتا ہے۔ اگر تجھے خودی کی حقیقت و اہمیت معلوم ہو جائے تو تیرا یہ نظریہ بدل جائے گا اور تو بھی اس کی معرفت حاصل کر کے اپنی بقا کا سامان کر سکے گا۔

۲۹- وہ موت جو آتی ہے (یعنی جسمانی موت) اس سے کیا ڈرنا۔ خودی جب پختہ/ مضبوط ہو جاتی ہے تو وہ موت سے پاک ہو جاتی ہے یعنی وہ جاودانی ہو جاتی ہے۔ (واضح رہے کہ خودی کی جو بھی کیفیات بیان ہو رہی ہیں وہ درحقیت صاحب خودی کے بارے میں ہیں)

۳۰-۳۱: میرا دل تو ایک اور موت کے ڈر سے کانپتا ہے، وہ موت جس سے میرا دل، میری جان اور میرا جسم سبھی کانپتے ہیں، وہ ہے عشق و مستی کے کام سے ہاتھ اٹھا لینا (کام چھوڑ دینا) اور اپنی چنگاری کو کسی تنکے پر نہ ڈالنا یعنی جذبہ عشق کے بغیر کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا جا سکتا اور اسی بنا پر آدمی محض ایک چلتی پھرتی لاش یا مٹی کا مادھو بن کے رہ جاتا ہے۔

۳۲- یہ موت گویا اپنے ہاتھوں کفن اپنے اوپر چڑھانا/ پہننا ہے اور اپنی آنکھوں سے اپنی موت کو دیکھنا ہے۔ وہی چلتی پھرتی لاش والی بات۔

۳۳- یہ موت ہر لحہ تیری گھات میں لگی ہوئی ہے تو اس سے ڈر کہ ہماری موت یہی ہے۔ ہماری یعنی ان انسانوں کی جو جذبہ عشق اور خودی کی معرفت سے بیگانے ہیں۔

۳۴- یہ موت تیری قبر تیرے جسم ہی میں تیار کرتی ہے۔ اس کے نکیر اور منکر تیرے پہلو میں ہوتے ہیں۔ دوسرے استعارے میں وہی بات جو پہلے کہی ہے یعنی جذبہ عشق اور معرفت خودی سے بیگانہ رہنا خود کو ایک طرح کا مردہ بنا کے رکھنا ہے۔

سوال (۷)

مسافر چوں بود' رہرو کدام است؟ کرا گویم کہ او مردِ تمام است؟

= مسافر کس قسم کا یا کیسا ہوتا ہے اور راستہ چلنے والا کون ہے۔ میں کسے کہوں کہ وہ (حقیقی معنوں میں) مردِ کامل ہے؟

جواب

۱- اگر چشمے کشائی بر دلِ خویش درونِ سینہ بینی منزلِ خویش
۲- سفر اندر حضر کردن چنین است سفر از خود بخود کردن ہمین است
۳- کسے ایں جا نداند ما کجائیم کہ در چشم مہ و اختر نیائیم
۴- مجو پایاں کہ پایانے نداری بپایاں تا رسی جانے نداری
۵- نہ مارا پختہ پنداری کہ خامیم بہر منزل تمام و ناتمامیم
۶- بپایاں نا رسیدن زندگانی است سفر مارا حیاتِ جاودانی است
۷- زماہی تا بمہ جولان گہ ما مکان و ہم زماں گردِ رہِ ما
۸- بخود پیچیم و بے تاب نمودیم کہ ماموجیم و از قعرِ وجودیم
۹- دما دم خویش را اندر کمیں باش گریزاں از گماں سوئے یقیں باش
۱۰- تب و تاب محبت را فنا نیست یقین و دید را نیز انتہا نیست
۱۱- کمالِ زندگی دیدارِ ذات است طریقش رستن از بندِ جہات است
۱۲- چناں باذاتِ حق خلوت گزینی ترا او بیند و او را تو بینی
۱۳- منور شو ز نورِ "من یرانی" مژہ برہم مزن تو خودنمانی
۱۴- بخود محکم گذر اندر حضورش مشو ناپید اندر بحر نورش

۱۵- نصیب ذرہ کن آں اضطرابے   کہ تابد در حریم آفتابے
۱۶- چناں در جلوہ گاہِ یار می سوز   عیاں خود رانہاں او را برافروز
۱۷- کسے کو "دید" عالم را امام است   من و تو ناتمامیم او تمام است

۱- اگر تو اپنے دل پر نظر ڈالے تو تو سینے میں اپنی منزل پائے گا۔ دل جذبہ عشق کا منبع ہے۔ جب اس پر توجہ ہو تو اسی سے اپنی خودی کی معرفت حاصل کر کے تو اپنی بقا کا سامان کر سکے گا۔

۲- حضر میں سفر کرنا یہی ہے (اسی کو کہتے ہیں) خود سے خود کی طرف سفر کرنا یہی ہے۔ انسان کے اندر عشق کے جذبوں میں جب اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے تو یہ گویا خود سے خود کی طرف سفر کرنا ہے۔

۳- یہاں کسی کو بھی یہ خبر نہیں کہ ہم کہاں ہیں (یا ہم کون ہیں؟) اس لیے کہ ہم تو چاند اور ستاروں کی نظروں میں بھی نہیں آتے۔ مذکورہ مسافروں (خود سے خود کی طرف سفر کرنے والوں) کو صرف اہل نظر ہی جانتے ہیں اور کسی کو ان کے ٹھکانوں کا علم نہیں۔

۴- تو (اس سفر) کی حد تلاش نہ کر' اس لیے کہ تو خود بے حد ہے۔ جب تک تو حد کو پہنچے گا تو خود نہیں ہوگا۔ مطلب یہ کہ تجھے فنا کا مقام حاصل ہو جائے گا' ایسی فنا جو بقا و ابد کی حامل ہوتی ہے۔

۵- تو کہیں ہمیں پختہ نہ سمجھ لینا' اس لیے کہ ہم خام ہیں۔ ہر منزل پر ہم تمام اور ناتمام ہیں یعنی ہم مسلسل سفر میں رہتے ہیں اور سکون و جمود سے بیگانہ ہیں۔ خام اسی لیے کہا کہ ان (عشاق) کا سفر کبھی ختم نہیں ہوتا۔ پختہ اس کے برعکس ہے۔

۶- حد یا کسی منزل کو نہ پہنچنا ہی صحیح معنوں میں اور حقیقی زندگی ہے۔ یہ سفر (سفرِ عشق) ہمارے لیے ابدی زندگی ہے۔

۷- مچھلی سے لے کر چاند تک ہماری جولان گاہ ہے (یعنی زمین کی تہ/پستی سے آسمان کی بلندی تک) یہ مکان اور زمان بھی ہمارے راستے کی گرد ہیں۔ ہم اس کائنات سے ماورا ہیں۔

۸- ہم خودی کو خود یا اپنے آپ پر لپیٹتے ہیں اور نمود کی تاب کے بغیر ہیں' اس لیے کہ ہم لہر ہیں اور وجود کے سمندر کی گہرائی سے ہیں۔ لہر سمندر سے الگ نظر آنے کے باوجود سمندر ہی کا حصہ ہوتی ہے۔ اسی طرح خودی بھی اس خالق کا پرتو ہونے کے باعث اس

کی صفات کی حامل اور یوں انائے مطلق کی مانند حد اور احتیاج سے ماورا ہوتی ہے۔

۹- تو مسلسل اپنی گھات میں لگا رہ۔ گماں سے دور رہتے ہوئے یقین کی طرف بڑھ۔ گویا اپنی خامیوں اور گمان وغیرہ کو دور کرتے ہوئے مسلسل اپنی خودی کی پختگی کا سامان کرتا رہ۔

۱۰- محبت کی تڑپ اور حرارت کو فنا نہیں ہے۔ اسی طرح یقین اور مشاہدہ کی بھی انتہا نہیں ہے۔

۱۱- زندگی کا کمال ذات کا دیدار ہے اور اس (دیدار) کا طریقہ جہات یعنی زمان و مکاں کی حدود کی قید سے آزاد ہونا ہے۔

۱۲- تو اس ذاتِ حق کے ساتھ کچھ اس انداز میں خلوت اختیار کرے کہ تجھے وہ دیکھے اور تو اسے دیکھے (شعرا کی وضاحت)

۱۳- تو خود کو ''من یرانی'' کے نور سے منور کر۔ نگاہ/ پلکوں کو الٹ پلٹ نہ کر ورنہ تو خود نہیں رہے گا۔ گویا خود کو حضور اکرمؐ سے پوری طرح وابستہ کر کے ذاتِ حق کے دیدار سے منور ہو جا اور اس موقع پر اس ذات میں پوری طرح محو ہو جا۔ ادھر ادھر نظریں نہ کر، نہ آنکھیں جھپکا کہ یہ اس مجلس کے آداب کے خلاف ہے اور اگر ایسا کرے گا تو کہیں کا نہ رہے گا۔

۱۴- اس ذات کے حضور میں تو خود کو مضبوط کر کے حاضر ہو۔ اس کے نور کے سمندر میں ناپید نہ ہو جا۔ گویا قطرہ سمندر میں رہتے ہوئے بھی اپنا وجود برقرار رکھے یا لہر سمندر میں ہوتے ہوئے بھی لہر ہی رہے۔

۱۵- تو ذرے کو (یعنی اگر تو ذرہ ہے) ایسا اضطراب عطا کر کہ وہ آفتاب کے گھر میں چمکے۔ گویا آفتاب میں پہنچ کر بھی اپنی چمک برقرار رکھ سکے یعنی اگر تو سورج میں ذرہ یا سمندر میں قطرہ ہے تو ہر صورت میں اپنی انفرادیت برقرار رکھ کہ اسی میں تیری بقا ہے۔

۱۶- تو اس محبوب حقیقی کی جلوہ گاہ میں کچھ اس طرح جل یا جلتا رہ کہ خود کو ظاہر اور اس کو پوشیدگی میں چمکا۔ چونکہ تیری چمک جلوۂ یار کی چمک ہے' اس لیے دونوں لازمی طور پر ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔

۱۷- جس کسی نے اس محبوب کے جلوہ کا مشاہدہ کر لیا وہ جہان کا امام ہو گیا۔ میں اور تو یعنی باقی سب نامکمل یا ناقص ہیں اور صرف وہی کامل ہے (یعنی مردِ کامل)

۱۸- اگر او را نیابی در طلب خیز   اگر یابی بدامانش در آویز

۱۹- فقیہ و شیخ و ملا را مدہ دست　　مرو مانند ماہی غافل از شست
۲۰- بکارِ ملک و دیں او مردِ راہے است　　کہ ماکوریم و او صاحب نگاہے است
۲۱- مثالِ آفتابِ صبح گاہے　　دمداز ہر بن مویش نگاہے
۲۲- فرنگ آئینِ جمہوری نہاد است　　رسن از گردنِ دیوے کشاد است
۲۳- نوابے زخمہ و سازے ندارد　　ابے طیارہ پروازے ندارد
۲۴- زِباغش کشت ویرانے نکوتر　　زشہر او بیابانے نکوتر
۲۵- چو رہزن کاروانے در تگ و تاز　　شکم ہا بہر نانے در تگ و تاز
۲۶- رواں خوابید و تن بیدار گردید　　ہنر با دین و دانش خوار گردید
۲۷- خرد جز کافری کافر گری نیست　　فن افرنگ جز مردم دری نیست
۲۸- گرو۔ہے راگرو ہے درکمین است　　خدایش یار اگر کارش چنین است
۲۹- زمن دہ اہل مغرب را پیامے　　کہ جمہور است تیغ بے نیامے
۳۰- چہ شمشیرے کہ جانہامی می ستاند　　تمیز مسلم و کافر نداند
۳۱- نہ ماند درغلافِ خود زمانے　　برد جانِ خود و جانِ جہانے

۱۸- اگر تو اسے نہ پائے تو اس کی تلاش میں لگ جا اور اگر تو اسے (مردِ کامل کو) پالے تو اس کے دامن سے لپٹ جا۔ اس کا دامن تھام لے۔

۱۹- تو فقیہ و ملا اور شیخ کے ہاتھ میں ہاتھ نہ دے۔ مچھلی کی طرح شست سے غافل رہ کر نہ چل۔ گویا فقیہ وغیرہ ظاہری علوم کے تو ضرور حامل ہوتے ہیں لیکن باطنی علوم تک رسائی ان کے بس کی بات نہیں جبکہ مردِ کامل دونوں علوم سے باخبر ہوتا اور اپنی نظر فیض اثر سے ناقص کو کامل بنا سکتا ہے۔

۲۰- ملک اور دین کے معاملے میں وہ مردِ راہ ہے' ہم تو اندھے ہیں جبکہ وہ صاحب نگاہ ہے۔ مطلب یہ کہ وہ دین و سیاست دونوں کے اسرار و رموز اور نشیب و فراز سے پوری طرح آگاہ ہوتا ہے بالکل اس آدمی کی طرح جو راستوں کے نشیب و فراز اور منزلوں اور مرحلوں سے کما حقہ باخبر ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں عام آدمی گویا بے خبر ہونے کے باعث' اندھوں کی مانند ہے۔

۲۱- صبح کے سورج کی مانند اس کے ہر ہر بال کی جڑ سے نگاہ پھوٹتی / پیدا ہوتی ہے۔ مردِ کامل ہر طرح کی نظر فیض اثر کا حامل ہوتا ہے۔

۲۲- یورپ یا انگریزوں نے جمہوری آئین کی بنیاد رکھی ہے' اس طرح اس/ انہوں نے شیطان کے گلے سے رسّی کھول دی ہے۔ یہ نظام ایک طرح سے ابلیسی نظام ہے جس میں شیطان فطرت لوگ پیدا ہو رہے ہیں اور معاشرے کو نام نہاد جمہوریت کے حوالے سے بگاڑ رہے ہیں۔ دنیا میں جہاں بھی یہ نام نہاد جمہوری نظام قائم ہے وہاں یہی صورتِ حال ہے۔ اس ضمن میں راقم یزدانی کا یہ قطعہ ملاحظہ ہو بعنوان ''جمہوریت'':

یہ ڈاکے یہ دھماکے اور یہ قتل نسل انسانی
عوام اس صورتِ حالات سے غمگیں ہیں اور بیزار بیٹھے ہیں
مگر یہ مدعی جمہوریت کے عیش میں ڈوبے ہوئے ہر دم
بنے ہیں راہزن جمہور کے اور درپے آزار بیٹھے ہیں

۲۳- ان جمہوری آئین والوں کی نوا مضراب کے بغیر ہے اور ان کا ساز بھی کوئی نہیں ہے۔ ہوائی جہاز کے بغیر ان کی پرواز ہی نہیں ہوتی۔ گویا وہ محض ظاہری اسباب پر تکیہ کرتے اور مادیت پسندی ہی میں کھوئے ہوئے ہیں۔ روحانی و باطنی جلووں سے انہیں کوئی تعلق یا دلچسپی نہیں ہے۔

۲۴- ان کے باغ سے ایک ویران کھیتی کہیں بہتر ہے اور ان کے شہر کی نسبت ایک بیابان زیادہ اچھا ہے۔ گویا اس قسم کا جمہوری نظام سراسر انسانیت کی حقیقت سے دور ہے۔

۲۵- لٹیرے کی طرح قافلہ ہی (لیڈرز' رہنما) لوٹ مار میں بھاگ دوڑ کر رہا ہے اور سب لوگ پیٹ کے لیے روٹی کے حصول میں بھاگ دوڑ کر رہے ہیں۔ شکم پرستی اور مادہ پرستی میں محو ہونے کے باعث روحانیت یا روحانی جذبوں سے بالکل خالی ہو گئے ہیں۔

۲۶- روح سو گئی یا محوِ خواب ہو گئی اور جسم بیدار ہو گئے ہیں۔ ہنر اور دین و دانش سب خوار ہو گئے ہیں۔ وہی بات ذرا بدل کر۔

۲۷- خرد کافری اور دوسروں کو کافر بنانے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یورپ کا فن مردم دری کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس نظام کے نتیجے میں ظاہر ہونے والے افکار نے انسانوں کو دین سے دور کر دیا ہے۔ یورپ کا یہ نظام ایک طرح سے اپنی تہذیب و ثقافت کے ذریعے انسانیت کے جذبوں کو ختم کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

۲۸- ایک گروہ دوسرے گروہ کی گھات میں لگا ہوا ہے۔ انسانوں کا اللہ ہی محافظ ہو۔ اگر ان

انگریزوں کا معاملہ ایسا ہے' گویا ہر طرف طبقاتی اور گروہی استحصال کا دور دورہ ہے۔

۲۹- تو میری طرف سے اہل مغرب کو یہ پیغام دے کہ یہ جمہوریت ایک ننگی تلوار ہے (آگے وضاحت ہے)

۳۰- یہ کیسی تلوار ہے جو جانوں کو ہلاک کرتی اور مسلم اور کافر میں فرق نہیں جانتی یعنی مذکورہ نظام عوام کے حق میں ہلاکت ہے اور عوام خواہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں سب کی روحوں کو تباہ کر رہا ہے یا روحانی جذبوں کو مٹا رہا ہے جس طرح ننگی تلوار ہر سامنے آنے والے کو قتل کر ڈالتی ہے۔

۳۱- یہ تلوار (جمہوری نظام) ایک پل بھی اپنی نیام میں نہیں رہتی۔ یہ اپنی بھی اور جہان کی جان بھی لے جاتی ہے۔ گویا عوام تو اس نظام کی زد میں ہیں ہی' اسے چلانے والے خود بھی ہلاکت وتباہی سے محفوظ نہیں ہیں۔

سوال (۸)

کدا میں نکتہ را نطق است انا الحق　　چہ گوئی ہرزہ بود آں رمز مطلق؟

= ''انا الحق'' کس نکتہ (گہری بات) کا بیان ہے۔ تیرا کیا خیال ہے کہ وہ رمز بالکل فضول تھی۔

جواب

۱- من از رمزِ ''انا الحق'' بازگویم　　دگر با ہند و ایراں راز گویم

۲- مغے در حلقہ دیر ایں سخن گفت　　حیات از خود فریبے خورد و من گفت

۳- خدا خفت و وجودِ ما ز خوابش　　وجودِ ما نمودِ ما ز خوابش

۴- مقام تحت و فوق و چار سو خواب　　سکون و سیر و شوق و جستجو خواب

۵- دلِ بیدار و عقل نکتہ بیں خواب　　گمان و فکر و تصدیق و یقیں خواب

۶- ترا ایں چشم بیدارے بخواب است　　ترا گفتار و کردارے بخواب است

۷- چو او بیدار گردد دیگرے نیست　　متاعِ شوق را سودا گرے نیست

۱- میں ''انا الحق'' کی رمز پھر بیان کرتا ہوں اور پھر ہندوستان اور ایران والوں سے اس کا راز بیان کرتا ہوں چونکہ ایران و ہند کی فارسی اور اردو شاعری میں حضرت

منصور کے اس واقعہ کا بہت ذکر ہوا ہے' پھر دونوں ملکوں کے صوفیا نے بھی ''انا الحق'' کو زیر بحث رکھا ہے' اسی بنا پر علامہ نے کہا ہے کہ میں پھر بیان کرتا ہوں۔

۲- ایک مغ (مے فروش) نے اپنے مندر کے حلقہ میں یہ بات کہی کہ حیات نے آپ ہی آپ (یا خود ہی) فریب کھایا اور ''من'' (میں) کہا۔ بصورت دیگر ''من'' کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

۳- خدا سو گیا اور ہمارا وجود اس کا خواب ہے۔ ہمارا وجود' ہمارا ظہور سب اس کا خواب ہے۔ گویا یہ کائنات اور اس میں جو کچھ ہے سب خواب و خیال ہے یعنی وجود نہیں ہے۔ قدیم ایرانی اور برصغیر کے فلاسفہ نے بھی اس کائنات کو محض ایک وہم (جس کا وجود نہیں) قرار دیا ہے۔

۴- یہ سب زیر و بالا (اونچ' نیچ) مقام اور چاروں طرفیں (مشرق' مغرب' شمال' جنوب) محض خواب ہیں' سکون اور حرکت اور شوق اور جستجو سب خواب ہیں۔

۵- دل بیدار اور گہری باتیں دیکھنے والی عقل بھی خواب ہی ہے اور گمان اور فکر اور تصدیق اور یقین سب خواب ہے۔

۶- تیری یہ بیدار چشم بھی خواب میں یعنی نیند میں ہے یا خواب میں جاگ رہی ہے۔ تیری گفتار (بول چال یا بولنے کی قوت) اور تیرا کردار (عمل یا قوت عمل) سب کچھ نیند میں ہے' محض خواب ہے۔

۷- جب وہ یعنی خالق کائنات / خدا جاگ اٹھے گا تو پھر اور کسی کا وجود نہ رہے گا' سب کچھ فنا کا شکار ہو جائے گا۔ اس وقت شوق کی متاع کا کوئی سوداگر نہ ہوگا۔ گویا کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔

۸- فروغِ دانش ما از قیاس است ــــ قیاسِ ماز تقدیرِ حواس است
۹- چو حس دیگر شد ایں عالم دگر شد ــــ سکون و سیر و کیف و کم دگر شد
۱۰- تواں گفتن جہانِ رنگ و بو نیست ــــ زمین و آسمان و کاخ و کو نیست
۱۱- تواں گفتن کہ خوابے یا فسونے است ــــ حجاب چہرۂ آں بے چگونے است
۱۲- تواں گفتن ہمہ نیرنگ ہوش است ــــ فریب پردہ ہائے چشم و گوش است
۱۳- خودی از کائنات رنگ و بو نیست ــــ حواسِ ماميانِ ماو او نیست
۱۴- نگہ را در حریمش نیست راہے ــــ کنی خود را تماشابے نگاہے

۱۵- حساب روزش از دورِ فلک نیست بخود بینی ظن و تخمین و شک نیست

۸- ہماری عقل و دانش کی ترقی ' قیاس کی بنا پر ہے اور ہمارا قیاس حواس کے معتدل اندازے کے باعث ہے۔ علم منطق کے مطابق حجت کی تین قسمیں ہیں، جن میں ایک قیاس ہے۔ مختلف مسائل کا نتیجہ اسی قیاس سے نکالا جاتا ہے اور نتیجے کا تعلق چونکہ حواس سے ہے اور ہر ایک کے حواس ایک جیسے نہیں ہوتے اس لیے ہر کوئی اپنے حواس کے مطابق نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ اسی بنا پر قیاس کو قابل اعتماد نہیں سمجھا جاتا۔ علامہ کی یہ بات اسی حوالے سے ہے۔

۹- جب حس بدل گئی تو اس جہان میں بھی تبدیلی آگئی۔ سکون اور حرکت اور کیفیت و کمیت کی صورت میں تبدیلی آگئی اور یہ امر قیاس کے بدلنے کا بھی باعث بنے گا۔

۱۰- یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس رنگ و بو کے جہان کا وجود نہیں ہے اور یہ زمین و آسمان، محل اور کوچے نہیں ہیں یعنی جب یہ واضح ہے کہ استدلال (دلیل دینے کا عمل) کا طریقہ جب قیاس ہی ہے جس میں حواس کے بدلنے سے تبدیلی آجاتی ہے تو ایک قیاس کے مطابق یہ نتیجہ بھی سامنے آئے گا کہ مذکورہ چیزوں (جہان وغیرہ) کا کوئی وجود نہیں ہے۔

۱۱- یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ کائنات کوئی خواب یا فسوں (فریب) ہے اور یہ اس خدا کے چہرے کا پردہ ہے جس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ گویا جب وہ یہ پردہ اٹھا دے گا تو اس کائنات کا وجود نہیں رہے گا۔ اس بنا پر وہ (کائنات) محض وہم و قیاس ہے۔

۱۲- یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ سب کچھ عقل و ہوش کا شعبدہ ہے اور یہ آنکھوں اور کانوں کے پردوں کا فریب ہے یعنی جو کچھ ہمیں دکھائی دیتا ہے اور جو کچھ ہم سنتے سناتے ہیں' اس کی کوئی حقیقت نہیں یہ محض فریب ہے اور یوں یہ کائنات بھی محض مکر و فریب ہے۔

۱۳- خودی کا تعلق اس رنگ و بو کی دنیا سے نہیں ہے۔ ہمارے حواس اس (کائنات) کے اور ہمارے درمیان یعنی ہم میں حائل نہیں ہیں۔ عقل کی بنیاد تو قیاس پر ہے اور قیاس حواس خمسہ کے باعث ہے جبکہ خودی کائنات وغیرہ سے ہٹ کر کوئی شے ہے جس کا حواس و قیاس پر کوئی انحصار نہیں ہے۔

۱۴- نگاہ کے لیے خودی کے گھر کی کوئی راہ نہیں ہے (دخل نہیں ہے) تو خود کا تماشا نگاہ کے بغیر کرتا ہے یعنی نگاہ جو کچھ دیکھتی ہے ضروری نہیں کہ وہ حقیقت ہو یا صحیح ہو کیونکہ وہ دھوکا کھا سکتی ہے جبکہ خودی اپنا تماشا اس نگاہ کے بغیر ہی کرتی ہے۔

۱۵- خودی کے دنوں کا حساب یا شمار آسمان کی گردش سے تعلق نہیں رکھتا۔ آسمان کی گردش سے جو صبح و شام طلوع و غروب ہوتے ہیں خودی ان سے بے نیاز ہے۔ اس کا خود کا تماشا کرنا گمان، اندازہ اور شک کے باعث نہیں ہے بلکہ حقیقت کا حامل ہے۔

۱۶- اگر گوئی کہ "من" وہم گمان است — نمودش چوں نمودِ این و آن است
۱۷- بگو با من کہ دارائے گماں کیست؟ — یکے در خودنگر آں بے نشاں کیست؟
۱۸- جہاں پیدا و محتاجِ دلیلے — نمی آید بفکر جبرئیلے
۱۹- خودی پنہاں ز حجت بے نیاز است — یکے اندیش و دریاب ایں چہ راز است
۲۰- خودی را حق بداں، باطل مپندار — خودی را کشت بے حاصل مپندار
۲۱- خودی چوں پختہ گردد لازوال است — فراقِ عاشقاں عین وصال است
۲۲- شرر را تیز بالے می تواں داد — تپید لایزالے می تواں داد
۲۳- دوامِ حق جزائے کارِ او نیست — کہ او را ایں دوام از جستجو نیست
۲۴- دوام آں بہ کہ جانِ مستعارے — شود از عشق و مستی پایدارے
۲۵- وجودِ کوہسار و دشت و در ہیچ — جہاں فانی، خودی باقی، دگر ہیچ
۲۶- دگر از شنکر و منصور کم گوے — خدا راہم براہِ خویشتن جوئے
۲۷- بخود گم بہر تحقیق خودی شو — "انا الحق" گوے و صدیق خودی شو

۱۶-۱۷: اگر تو یہ کہتا ہے کہ "من" وہم و گمان ہے (اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے) اور اس کا وجود اِس اور اُس کی نمود (وجود) کی مانند ہے یعنی عام اشیا کا سا ہے تو پھر تو مجھے یہ بتا کہ "من" کو محض گمان و وہم کہنے والا کون ہے۔ تو ذرا اپنے اندر دیکھ/غور کر کہ وہ بے نشان کون ہے؟ مطلب یہ کہ ایسا کہنے والا ہی تو تیرا "من" ہے اور تیرے اندر یا سینے میں وہ بے نشان تو تیری خودی یا تیری انائے مقید ہی تو ہے۔

۱۸- جہان/کائنات ظاہر ہے اور اس کے باوصف اسے اپنے وجود کے لیے دلیل کی ضرورت ہے۔ وہ جبرئیل جیسے فرشتے کی فکر میں بھی نہیں آتا۔ مطلب یہ کہ اس موضوع (وجود کائنات) پر بڑی بڑی بحثیں کی گئی ہیں اور اس کے وجود پر شک کا اظہار کیا گیا ہے، حالانکہ ظاہری طور پر اس کا وجود ہے۔

۱۹- جبکہ خودی، اس ظاہری کائنات کے برعکس، پوشیدہ اور ہر طرح کی دلیل سے بے نیاز ہے۔ تو ذرا غور کر اور سمجھ کہ یہ کیا راز ہے؟

۲۰- تو خودی کو حق/حقیقت سمجھ' اسے باطل قرار نہ دے اور خودی کو بے حاصل کھیتی نہ سمجھ یعنی کوئی بیکار شے نہیں ہے بلکہ ایک حقیقی اور عظیم کیفیت ہے۔

۲۱- خودی جب پختہ ہو جاتی ہے تو اسے زوال نہیں ہوتا' اس لیے کہ عاشقوں کا فراق سراپا یا بالکل وصل ہی ہوتا ہے۔ گویا خودی (انائے مقید) اپنے خالق (انائے مطلق) سے جدا ہو کر ہی خودی بنی ہے۔ تاہم انائے مطلق چونکہ اس میں جلوہ گر ہے' اس لیے مذکورہ فراق سراپا وصل ہے۔

۲۲- چنگاری کو تیز بال و پر دیئے جا سکتے ہیں اور اسے لازوال تڑپ دی جا سکتی ہے۔ گویا اسے خودی کی آنچ دے کر بلند پرواز بنایا جا سکتا ہے اور یوں خودی کی پرورش کے عمل سے اسے خالق کائنات کا مظہر بنا کر خالق کی طرح لازوال کیا جا سکتا ہے۔ چنگاری سے اگر معمولی انسان مراد لیا جائے تو وہ بھی خودی کی بدولت اس مقام پر پہنچ سکتا ہے۔

۲۳- حق/ خدا کا دوام اس کے عمل یا جدوجہد کے باعث نہیں ہے' اس لیے کہ اس کا یہ دوام اس کی جستجو کی وجہ سے نہیں ملا۔ اس لیے کہ یہ دوام اس کے وُجودِ مطلق ہونے کے باعث اس کی ذات کا تقاضا ہے جبکہ خودی کا دوام اس کی ریاضت ومجاہدہ اور جہد وعمل کے نتیجے میں ہوتا ہے کیونکہ اس سے اس میں خدا کی صفات ظہور پذیر ہو جاتی ہیں۔

۲۴- دوام وہ بہتر ہے کہ جس میں خدا کی طرف سے عطا کردہ ادھار جان عشق ومستی کے نتیجے میں پایدار ہو جائے یعنی فنا سے بقا کی طرف گامزن ہو جائے۔

۲۵- یہ پہاڑ' بیابان اور وادیاں' آبادیاں سب ہیچ ہیں۔ جہان فانی ہے جبکہ خودی باقی ہے یا صاحب بقا ہے' باقی سب کچھ ہیچ ہے۔

۲۶- تو اب شنکر اور منصور کی بات نہ کر (فرہنگ دیکھیے) تو خدا کو اپنے راستے سے تلاش کر۔ مطلب یہ کہ اپنی خودی کی معرفت حاصل کر کے خدا کی معرفت پالے۔

۲۷- تو خودی کی تحقیق کے لیے خود میں محو/گم ہو جا۔ ''انا الحق'' کہہ اور یوں خودی کی تصدیق کرنے والا بن جا۔ خودی کو حق جان' خودی کی معرفت خدا کا عرفان ہے۔

سوال (۹)

کہ شد بر سر وحدت واقف آخر؟ شناسائے چہ آمد عارف آخر؟

= وحدت (توحید ایزدی) کے راز سے آخر کون باخبر ہوا۔ عارف نے آخر کس چیز سے

آگاہی پائی یا شناسائی حاصل کی ہے۔

جواب

۱- تہ گردوں مقام دل پذیر است ولیکن مہر و ماہش زود میر است
۲- بدوش شام نعش آفتابے کواکب را کفن از ماہ تابے
۳- پرد کہسار چوں ریگ روانے دگرگوں می شود دریا بہ آنے
۴- گلاں را در کمیں بادِ خزان است متاعِ کارواں از بیم جان است
۵- زشبنم لالہ را گوہر نماند دمے ماند دمے دیگر نماند
۶- نوانشنیدہ در چنگے بمیرد شرر ناجستہ در سنگے بمیرد
۷- مپرس ازمن ز عالم گیری مرگ من و تو از نفس زنجیری مرگ

۱- آسمان کے نیچے دل پذیر مقام (یہ دنیا) ہے لیکن اس کا سورج اور چاند جلد ڈوب جانے والا ہے۔ یہ دنیا بڑی دلکش سہی لیکن اس کی اشیا کو بقا نہیں ہے۔ سورج ادھر طلوع ہوا شام کو غروب ہو گیا۔ یہی معاملہ چاند کا ہے' ان دونوں کا ذکر محض مثال کے طور پر آیا ہے ورنہ سب اشیا مراد ہیں۔

۲- شام کے کندھوں پر آفتاب کی نعش ہوتی ہے (وہ شام کو غروب ہو جاتا ہے) جبکہ ستاروں کا کفن چاند بن جاتا ہے۔ چاند کی چاندنی میں ستاروں کی روشنی مدھم پڑ جاتی ہے۔

۳- پہاڑ ریت کی طرح اڑ جاتے ہیں جبکہ سمندر یا دریا ایک لمحہ ہی میں کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ یہ سب عارضی و فانی ہونے کی علامت ہے۔

۴- موسم خزاں کی ہوا پھولوں کی گھات میں لگی رہتی ہے (اس موسم میں پھول کھلنے بند ہو جاتے ہیں)۔ قافلے کی متاع' جان کا خوف ہے۔ قافلے والوں کو رہزنوں/لٹیروں کا خوف مارے دیتا ہے۔ گویا یہ دنیا ہے تو دل کش لیکن صرف دیکھنے میں' اور عارضی و فانی ہونے کے علاوہ اس میں اور بھی کئی خرابیاں ہیں۔

۵- لالہ کے پھول پر شبنم کا موتی نہیں رہتا۔ ایک وقت رہتا ہے تو دوسرے وقت نہیں ہوتا۔ گویا لالہ کچھ اس طرح کا پھول ہے جس پر شبنم کے قطرے کچھ دیر تک نہیں رہ سکتے۔ (یہ سب مثالیں ہیں کائنات کے عارضی و فانی ہونے کی۔

۶- جو نغمہ نہیں سنا جاتا وہ رباب/ساز کے اندر ہی مر جاتا ہے (اس کا وجود یا ظہور نہیں

ہوتا) اور نہ نکلنے والی چنگاری پتھر ہی میں مرجاتی ہے۔ گویا نغمہ تو اسی وقت نغمے بنے گا جب ساز کو چھیڑا جائے گا ورنہ وہ کچھ بھی نہ ہوگا۔ یہی حال چنگاری کا ہے۔ پتھر پر چوٹ لگے گی تو چنگاری پیدا ہوگی ورنہ نہیں۔

۷۔ تو مجھ سے موت کی عالم گیری کے بارے میں مت پوچھ۔ میں اور تو سانس کی بنا پر موت کی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں۔ مطلب یہ کہ جب تک سانس آتا رہتا ہے انسان زندہ رہتا ہے ورنہ (سانس بند ہونے پر) وہ مرجاتا ہے۔

غزل

۱۔ فنا را بادۂ ہر جام کردند　　چہ بے دردانہ او را عام کردند

۲۔ تماشا گاہِ مرگِ ناگہاں را　　جہانِ ماہ و انجم نام کردند

۳۔ اگر یک ذرہ اش خوے رم آموخت　　بافسونِ نگاہے رام کردند

۴۔ قرار از ماچہ می جوئی کہ مارا　　اسیر گردشِ ایام کردند

۵۔ خودی در سینہ چا کے نگہ دار　　ازیں کوکب چراغِ شام کردند

(یہ غزل علامہ نے عراقیؔ کی مشہور غزل کے جواب میں کہی ہے جس کا مطلع ہے:)

نخستیں بادہ کاندر جام کردند
زچشم مست ساقی وام کردند

۱۔ فنا کو کارکنانِ قضا وقدر (یا قدرت) نے ہر جام کی شراب بنا دیا ہے۔ انہوں نے اسے کس بے دردی کے ساتھ عام کردیا ہے یعنی کائنات کی ہر شے کو فنا ہے۔

۲۔ اچانک کی موت کی تماشا گاہ کو چاند اور ستاروں کی دنیا کا نام دے دیا گیا ہے۔ گویا موت یا فنا ہر شے کا مقدر ہے لیکن پھر بھی ہم اسے دل کش سمجھتے ہیں۔

۳۔ اگر اس کائنات کے ایک ذرے نے بھی اس (کائنات) سے دور ہونے کی عادت سیکھ لی تو انہوں (مذکورہ کارکنوں) نے ایک نگاہ کے جادو سے اسے رام کرلیا/ مطیع یا گرفتار کرلیا۔ گویا اس کائنات کی دل فریبیاں اور دل کشیاں کچھ اس انداز کی ہیں کہ اگر کوئی اس (کائنات) سے دور بھی بھاگنا چاہے تو وہ بھاگنے نہیں دیتیں۔

۴۔ تو ہمارے قرار (ہمارے ابدی اور دوامی ہونے) کے بارے میں کیا جستجو کررہا ہے (یا کیا پوچھ رہا ہے) اس لیے کہ ہمیں تو زمانے کی گردش کا اسیر بنا رکھا ہے۔ زمانہ

ایک ڈگر پر نہیں رہتا۔ اس میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ کچھ یہی حال انسان کا ہے اور آخر اسے فنا ہے۔

۵- تو اپنے پھٹے ہوئے سینے میں خودی کا تحفظ کر' اس لیے کہ اس ستارے کو شام کا چراغ بنایا گیا ہے۔ مطلب یہ کہ ہر چند کائنات کی ہر شے فنا کا اور تغیر و تبدل کا شکار ہے لیکن اگر تو اپنی خودی سے آگاہ ہو جائے تو تو اپنی بقا کا سامان کر سکتا ہے۔ شام کے چراغ سے مراد ہے فنا کی تاریکی میں ابدیت و دوام اور بقا کی روشنی پھیلانے والا یعنی خودی ایسا کرتی ہے۔

دوسرا بند

۱- جہاں یکسر مقام آفلین است — دریں غربت سرا عرفان ہمین است

۲- دلِ مادر تلاشِ باطلے نیست — نصیب ماغمِ بے حاصلے نیست

۳- نگہ دارند ایں جا آرزو را — سرورِ ذوق و شوقِ جستجو را

۴- خودی را لازوالے می تواں کرد — فراقے را وصالے می تواں کرد

۵- چراغے از دمِ گرمے تواں سوخت — بسوزن چاکِ گردوں می تواں دوخت

۱- یہ کائنات سراسر مقام آفلین ہے (فرہنگ دیکھیے) اس غربت سرا میں عرفان یہی ہے یعنی انسان اسے (کائنات کو) غروب ہونے یعنی فنا ہونے والی سمجھے اور یوں اس محبوب حقیقی کی طرف' حضرت ابراہیمؑ کی طرح متوجہ ہو جائے اور صرف اسے واحد اور معبودِ مطلق سمجھے۔

۲- ہمارا دل کسی باطل کی تلاش میں نہیں ہے۔ ہمارے مقدر میں کوئی بے حاصل غم نہیں ہے۔ گویا غم سے بھی ہم بہت کچھ حاصل کرتے یعنی درس حاصل کرتے ہیں جس سے ہم اپنی زندگی میں انقلاب لا سکتے ہیں۔

۳- یہاں آرزو کو نگاہ میں رکھا جاتا یا اس کا تحفظ کیا جاتا ہے' اسی طرح ذوق کے سرور اور جستجو کے شوق کو نگاہ میں رکھا جاتا ہے یعنی ان سب کی بدولت ہی بقا کا سامان ممکن ہے۔

۴- خودی کو لازوال بنایا جا سکتا ہے اور فراق و ہجر کو وصل کی صورت دی جا سکتی ہے۔ جب انسان صحیح معنوں میں اپنی خودی سے آگاہ ہو کر جہد و عمل میں مصروف ہو جاتا ہے تو اس کے لیے مذکورہ کام مشکل نہیں رہتے۔

۵- ایک گرم سانس سے چراغ جلایا جا سکتا ہے۔ سوئی سے آسمان کا چاک / پھاڑ سیا جا سکتا ہے۔ عشق کے جذبہ سے سرشار خودی جب لازوال ہو جائے تو انسان ناممکن امور کو بھی اپنے لیے ممکن بنا کر انہیں انجام دینے لگتا ہے۔

۶- خدائے زندہ بے ذوقِ سخن نیست | تجلی ہائے او بے انجمن نیست
۷- کہ برقِ جلوۂ او بر جگر زد؟ | کہ خورد آں بادہ و ساغر بسر زد؟
۸- عیارِ حسن و خوبی از دلِ کیست؟ | مہ او در طوافِ منزلِ کیست؟
۹- الست از خلوت نازے کہ برخاست | بلیٰ از پردۂ سازے کہ برخاست؟
۱۰- چہ آتش عشق در خاکے برافروخت | ہزاراں پردہ یک آوازِ ما سوخت
۱۱- اگر مائیم گرداں جام ساقی است | بیزمش گرمی ہنگامہ باقی است
۱۲- مرا دل سوخت بر تنہائی او | کنم سامانِ بزم آرائی او
۱۳- مثالِ دانہ می کارم خودی را | برائے او نگہ دارم خودی را

۶- زندہ خدا سخن یا بات چیت کے ذوق سے خالی نہیں ہے۔ اس کی تجلیاں محفل کے بغیر نہیں ہیں۔ مطلب یہ کہ اپنے اسی ذوق کی خاطر اس نے انسان کو بولنے کے لیے زبان دی تا کہ وہ اس سے ہم کلام ہو سکے اور یہ کہ چونکہ یہ کائنات اور انسان اس کی تجلی گاہ ہیں، اس لیے وہ اس کی گویا محفل ہیں۔

۷- کس نے اس کے جلوے کی بجلی اپنے جگر پر گرائی۔ کس نے وہ شراب پی اور پھر جام کو سر پر دے مارا یعنی توڑ دیا۔ مطلب یہ کہ اس کی شرابِ محبت پی کر پھر کوئی اور شراب نہیں پی۔ دوسرے لفظوں میں جو کوئی بھی اس محبوب حقیقی کے عشق کے جذبہ سے سرشار ہو گیا، وہ پھر اور کسی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ ''کس نے'' سے مراد انسان ہی ہے۔

۸- حسن و خوبی کا معیار کس کے دل سے ہے؟ اس کا چاند کس کی منزل کے طواف میں ہے؟ گویا ایسا کونسا انسان ہے جس کے دل میں یہ خوبی ہے کہ وہ صحیح معنوں میں حسن و خوبی کی پرکھ رکھتا ہے۔

۹- ''الست بربکم'' کی آواز کس کے ناز کی خلوت سے بلند ہوئی اور ''بلیٰ'' کا نغمہ کس کے ساز کے سُر سے بلند ہوا۔ (فرہنگ دیکھیے)

۱۰- عشق نے آدم کے جسم میں کیسی آگ روشن کی کہ ہماری ایک آواز نے ہزاروں پردے جلا دیئے۔ گویا ''بلیٰ'' خدا کے ساتھ پیمانِ محبت باندھنا تھا، اس طرح آدم یا

انسان نے اپنے آپ میں اس محبوبِ حقیقی کے عشق کی آگ روشن کر لی۔ جس (عشق) کی بدولت اس نے اپنے اور خدا کے درمیان حائل ہزاروں پردے اٹھا کر اس محبوبِ حقیقی کے جلوے سے خود کو شاد کام کر لیا۔

۱۱۔ اگر ہم ہیں تو ساقی کا جام گردش میں ہے اور اس کی محفل میں ہنگامہ کی گرمی باقی ہے۔ محفل میں رندوں کے بغیر ساقی جام گردش میں نہیں لاتا اور نہ کوئی رونق یا ہنگامہ ہی ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح خدا کے لیے اس کائنات اور انسان کا وجود ضروری ہے تاکہ اس کی خدائی کا عمل جاری و ساری رہے۔

۱۲۔ میرا دل اس (خالق) کی تنہائی پر جل گیا ہے۔ اس لیے میں اس کی خاطر بزم سجانے کا سامان کر رہا ہوں۔ اگلے شعر میں جو بات کی ہے وہ مراد ہے۔

۱۳۔ (چنانچہ) میں اپنی زندگی کی کھیتی میں خودی کا بیج بو رہا ہوں اور اس (خدا) کے لیے خودی کا تحفظ کر رہا ہوں۔ گویا میں اپنی خودی کی معرفت حاصل کر کے خدا کی معرفت حاصل کروں گا۔ دوسرے لفظوں میں خودی کو پانا خدا کو پانا ہے۔

خاتمہ

۱۔ تو شمشیری ز کامِ خود بروں آ — بروں آ از نیامِ خود بروں آ

۲۔ نقاب از ممکناتِ خویش برگیر — مہ و خورشید و انجم را بہ برگیر

۳۔ شب خود روشن از نورِ یقیں کن — ید بیضا بروں از آستیں کن

۴۔ کسے کو دیدہ را بر دل کشود است — شرارے کشت و پروینے درود است

۵۔ شرارے جستہ ئے گیر از درونم — کہ من مانند رومیؒ گرم خونم

۶۔ وگرنہ آتش از تہذیبِ نو گیر — برونِ خود بیفروز اندروں میر

۱۔ تو (اے انسان) تلوار ہے اپنی نیام سے باہر آ۔ باہر آ اپنی نیام سے باہر آ۔ مطلب یہ کہ تجھ میں بہت سی قوتیں اور صلاحیتیں ہیں، ان سے کام لے۔

۲۔ تو اپنے ممکنات (کے چہرے) سے نقاب اٹھا دے یا ہٹا دے اور یوں چاند اور سورج اور ستاروں کو اپنے پہلو میں لے لے یعنی تو اپنی قوتوں اور صلاحیتوں سے کام لے اور اس کائنات کو تسخیر کر۔

۳۔ تو یقین کے نور سے اپنی رات روشن کر۔ اپنا ید بیضا آستین سے باہر نکال۔ حضرت موسیٰؑ

کے معجزے کے حوالے سے بات کی ہے۔ وہ اپنا ہاتھ آستین سے باہر نکالتے تو وہ روشن ہو جاتا۔ گویا تو خدا کے نور سے اپنی زندگی کی تاریکی دور کر لے۔

۴۔ جس کسی انسان نے دل پر آنکھیں کھولی ہیں (یوں سمجھو) اس نے ایک چنگاری بوئی ہے اور پروین (ستاروں کے جھرمٹ) کی فصل کاٹی ہے۔ مطلب یہ کہ جس نے اپنے دل پر توجہ کی اور اسے دلِ زندہ بنالیا کہ معرفت خودی وخدا اسی سے ممکن ہے' اس نے بلند مقام حاصل کر لیے اور کائنات کو بھی تسخیر کر لیا ہے۔

۵۔ تو میرے اندر سے ابھرا ہوا شرارہ حاصل کر لے کیونکہ میں رومی کی طرح گرم خون ہوں یعنی میری شاعری سے جو میرے دل سے ابھری ہے اس سے استفادہ کر کیونکہ جس طرح مولانا رومی کی شاعری جوش وجذبہ عشق کی حامل ہے' میری شاعری میں بھی یہی کیفیت ہے۔ یوں خود کو زندۂ جاوید کر لے۔

۶۔ (اگر تو ایسا نہیں کرتا یا نہیں کرنا چاہتا تو پھر تو) جدید یا مغربی تہذیب کی آگ لے اور اس سے اپنا ظاہر روشن کر لے لیکن باطن یا دل کے لحاظ سے مر جا یعنی یہ تہذیب سراسر مادہ پرستی پر زور دیتی ہے اور روح و دل کو مٹا دیتی ہے' لہٰذا تو اس تہذیب سے بے شک اپنا ذہن اور جسم روشن کر لے لیکن اس کے نتیجے میں تیری روح زندہ نہ رہے گی۔ تو جذبۂ عشق سے محروم ہو جائے گا۔

بندگی نامہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ گفت با یزداں مہ گیتی فروز — تاب من شب را کند مانند روز

۲۔ یادِ ایامے کہ بے لیل و نہار — خفتہ بودم در ضمیرِ روزگار

۳۔ کوکبے اندر سوادِ من نہ بود — گردشے اندر نہادِ من نہ بود

۴۔ نے زِنورم دشت و در آئینہ پوش — نے بہ دریا از جمالِ من خروش

۵۔ آہ زیں نیرنگ و افسونِ وجود — وائے زیں تابانی و ذوقِ نمود

۶۔ تافتن از آفتاب آموختم — خاکدانے مردہ ے افروختم

۷۔ خاکدانے با فروغ و بے فراغ — چہرۂ او از غلامی داغ داغ

۸- آدم او صورت ماہی بہ شست آدمے یزداں کشے آدم پرست
۹- تا اسیر آب و گل کردی مرا از طوافِ او خجل کر دی مرا
۱۰- ایں جہاں از نورِ جاں آگاہ نیست ایں جہان شایانِ مہر و ماہ نیست
۱۱- در فضائے نیلگوں او را بہل رشتہ ما نوریاں ازوے گسل
۱۲- یا مرا از خدمتِ او واگذار یا زِ خاکش آدم دیگر بیار
۱۳- چشم بیدارم کبود و کور بہ اے خدا ایں خاکداں بے نور بہ

۱- دنیا کو روشن کرنے والے چاند نے خدا سے کہا کہ میری روشنی رات کو دن کی مانند (روشن) کر دیتی ہے (اس حصے میں غلامی کے باعث انسانوں میں جو خرابیاں اور برائیاں وغیرہ پیدا ہوتی ہیں انہیں مختلف استعاروں اور تشبیہوں سے واضح کیا گیا ہے)

۲- مجھے وہ دن (آج تک) یاد ہیں جب رات اور دن کے بغیر میں زمانے کے ضمیر میں سویا رہتا تھا۔ مطلب یہ کہ ابھی میری تخلیق نہیں ہوئی تھی یا میرا وجود نہیں تھا۔

۳- میری حدود میں کوئی ستارہ نہیں تھا اور میری فطرت میں کوئی گردش نہ تھی۔ ظاہر ہے جب وجود ہی نہیں تھا تو یہ سب کچھ کیسے ہوتا۔

۴- نہ تو میری روشنی سے بیابان اور وادیاں ہی روشن تھیں اور نہ میرے جمال/حسن یعنی روشنی سے سمندر میں مدوجزر پیدا ہوتا تھا۔

۵- وجود کی یہ فریب کاری اور شعبدہ بازی دکھ کی بات ہے۔ اس چمک اور ظاہر ہونے کے ذوق پر افسوس ہے۔ گویا جب میں عدم میں تھا تو سکون و راحت میں تھا۔

۶- (جب میں وجود میں آیا تو) میں نے سورج سے چمکنا سیکھا اور پھر اس چمک سے مردہ مٹی کے گھر یعنی دنیا کو روشن کیا۔ سائنس کی رو سے چاند' سورج سے اپنی روشنی حاصل کرتا ہے۔

۷- یہ مادی دنیا اگرچہ عقل و خرد اور علم وغیرہ کی بنا پر روشن تو ہے لیکن سکون و راحت سے محروم ہے۔ غلامی کے باعث اس کا چہرہ داغدار ہے۔ گویا انسان مذکورہ روشنی کے باوجود سیاسی طور پر غلام ہیں اور ذہنی اور روحانی اعتبار سے ان کی فطرت میں غلامی رچی بسی ہوئی ہے۔

۸- اس دنیا کے انسان مچھلی کی طرح کانٹے لگائے بیٹھے ہیں۔ یہ ایسے انسان ہیں جو خدا کو بھلائے ہوئے یا اس کے وجود کے منکر ہیں اور آدمی کی پوجا کرنے والے ہیں۔

مطلب یہ کہ اپنی عیاری و مکاری اور فریب کاری سے دوسروں کو پھانسنے اور لوٹنے میں لگے رہتے ہیں جبکہ بااثر اور طاقتور لوگ دوسروں کو اپنا مطیع و غلام بنا لیتے ہیں۔

۹۔ (اے خدا) جب سے تو نے مجھے (چاند کو) مادی وجود عطا کیا ہے' اس دنیا کے طواف (طلوع و غروب ہونا) سے تو نے مجھے شرمندہ کر ڈالا ہے۔ انسانوں کی مذکورہ برائیوں کے حوالے سے ایسا کہا ہے۔ گویا ان حالات کے ہوتے ہوئے میرا وجود نہ ہوتا تو اچھا ہوتا۔

۱۰۔ یہ جہان روح کے نور سے آگاہ نہیں ہے۔ یہ جہان سورج اور چاند کے لائق نہیں ہے۔ انسان روح کی طرف متوجہ ہونے کی بجائے جسم کی پرورش یا مادہ پرستی میں لگے ہوئے ہیں۔ ایسی صورت میں یہاں تاریکی ہی مناسب تھی۔

۱۱۔ تو اس جہان کو نیلی فضا میں چھوڑ دے یا پھر ہم نوریوں کا اس سے تعلق ختم کر دے۔ گویا کوئی اور جہان تخلیق کر جو ہماری روشنی کے لائق ہو۔

۱۲۔ یا تو مجھے اس جہان کی خدمت سے رہا کر دے یا پھر اس کی مٹی سے کوئی اور آدم تخلیق کر یعنی ایسا انسان تخلیق کر جو مذکورہ برائیوں سے دور ہو' اس کا فکر و عمل شیطانی نہ ہو اور وہ حقیقی انسانیت کا حامل اور روحانی جذبوں سے سرشار ہو۔

۱۳۔ (اس دنیا کو روشن کرنے کی بجائے) میری چشمِ بیدار (روشن آنکھ) نیل لگی ہوئی یعنی اندھی اور نابینا ہو تو بہتر ہے۔ اے خدا یہ مٹی کا گھر (دنیا) روشنی/نور کے بغیر ہی یعنی تاریک ہی رہے تو بہتر ہے۔

۱۴۔ از غلامی دل بمیرد در بدن — از غلامی روح گردد بارِ تن

۱۵۔ از غلامی ضعفِ پیری در شباب — از غلامی شیر غاب افگندہ ناب

۱۶۔ از غلامی بزمِ ملت فرو فرد — این و آں با این و آں اندر نبرد

۱۷۔ آں یکے اندر سجود ایں در قیام — کاروبارش چوں صلوٰۃ بے امام

۱۸۔ در فتد ہر فرد با فردے دگر — ہر زماں ہر فرد را دردے دگر

۱۹۔ از غلامی مردِ حق زنار بند — از غلامی گوہرش نا ارجمند

۲۰۔ شاخِ او بے مہرگاں عریاں ز برگ — نیست اندر جانِ او جز بیم مرگ

۲۱۔ کور ذوق و نیش را دانستہ نوش — مردۂ بے مرگ و نعشِ خود بدوش

۲۲۔ آبروئے زندگی در باختہ — چوں خراں باکاہ وجو در ساختہ

۲۳- ممکنش بنگر محالِ او نگر رفت و بودِ ماه و سالِ او نگر

۲۴- روزہا در ماتم یک دیگر اند در خرام از ریگ ساعت کمتر اند

۱۴- (چاند کی بات ختم ہوئی' اب غلامی کے برے نتیجوں کا بیان ہے) غلامی کے باعث انسان کا دل جسم میں مرجاتا ہے اور غلامی سے روح' جسم کا بوجھ بن جاتی ہے۔ جسم کی غلامی آقا کے جبر کے باعث اور روح کی غلامی انسانی نفس کے جبر کی وجہ سے ہوتی ہے۔

۱۵- غلامی کی وجہ سے جوانی ہی میں بڑھاپے کی ناتوانی آجاتی ہے۔ غلامی کی وجہ سے جنگل کا آزاد شیر ایک ایسا شیر بن جاتا ہے جس کے دانت گر گئے ہوں۔ غلامی کے باعث طاقتور سے طاقتور انسان بھی بزدل بن جاتا ہے۔

۱۶- غلامی کی بنا پر ملت کا وجود بکھر کر پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ اور وہ' اس سے اور اس سے لڑنے لگتا ہے۔ باہمی افتراق' دشمنی اور مخالفت غلاموں کا وطیرہ بن جاتی ہے اور یوں ملت نسلی و لسانی اور مذہبی و مسلکی نظریات کی وجہ سے انتشار میں مبتلا ہو جاتی اور اپنی وحدت سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔

۱۷- (اس افتراق و انتشار کے باعث) اگر ایک آدمی سجدے میں ہے تو دوسرا قیام میں۔ چنانچہ ملت کا کاروبار یا طور طریقہ کچھ ایسا ہوتا ہے جیسے امام کے بغیر نماز ہو یعنی با جماعت نماز نہ ہو۔ ملت کے افتراق کو اس تشبیہ سے واضح کیا ہے۔

۱۸- ہر فرد دوسرے فرد سے الجھتا یا اس کے گلے پڑا ہوا ہوتا ہے اور ہر لمحے ہر فرد نت نئے درد میں مبتلا رہتا ہے۔ یہ تفریق و انتشار ہر کسی کے لیے دکھ اور تکلیف یا پریشانی کا باعث بنتا ہے۔

۱۹- غلامی کے باعث ایک مردِ حق کافرانہ سوچ کا حامل بن جاتا ہے اور غلامی کی بنا پر اس کا گوہر بے قدر و قیمت ہو کے رہ جاتا ہے یعنی اس کی خوبیاں ایک طرح سے ختم ہو کے رہ جاتی ہیں۔

۲۰- اس (مردحق کی زندگی) کی شاخ خزاں کے بغیر ہی پتوں سے خالی ہو جاتی ہے اور اس کی جان میں موت کے خوف کے سوا اور کچھ نہیں رہتا۔ وہی بات دوسرے استعارے میں۔

۲۱- غلامی کی زندگی بسر کرنے والا کور ذوق ہوتا اور زہر کو شیریں شربت سمجھتا ہے۔ وہ ایک بے موت مردہ ہوتا ہے جس نے اپنی نعش کندھوں پر اٹھائی ہوتی ہے یعنی اس میں لذت کی حس ہی نہیں رہتی اور وہ ایک چلتی پھرتی لاش کی مانند یا محض مٹی کا مادھو ہوتا

ہے۔ اس کے سب جذبے وغیرہ گویا غلامی کی نذر ہو جاتے ہیں۔

۲۲- مذکورہ شخص زندگی کی عزت و آبرو لٹا چکا ہوتا ہے اور گدھوں کی طرح محض گھاس اور جو پر ہی گذارہ کر لیتا ہے۔ قوت عمل اور جذبوں اور احساس سے محرومی کے باعث اسے عزت کا احساس بھی نہیں رہتا اور اپنی روزی گھٹیا طریقوں سے حاصل کرتا ہے۔

۲۳- اس (غلام) کی زندگی کے آسان اور مشکل مرحلوں کو دیکھ۔ اس کی زندگی کے ماضی اور ماہ و سال دیکھ۔ ماضی میں اس پر کیا کچھ بیتا اور اب جس طرح اس کی زندگی گذر رہی ہے' ان کے جائزے سے تجھ پر کھل جائے گا کہ اس کی زندگی کیسی ذلتوں کا شکار رہی اور ہو رہی ہے۔

۲۴- اس کے دن ایک دوسرے کا ماتم کر رہے ہیں اور چلنے میں وہ گھڑی کی ریت کی مانند سست رفتار ہیں یعنی ان (غلاموں) میں عمل کا جذبہ نہیں رہا۔ وہ ایک طرح سے مصیبتوں کا شکار رہتے ہیں۔ بیکاری میں وقت گذارنا ان کی گویا فطرت بن چکی ہے۔

۲۵- شورہ بوم از نیش کژدم خار خار — مورِ او اژدر گز و عقرب شکار
۲۶- صرصرِ او آتش دوزخ نژاد — زورقِ ابلیس را بادِ مراد
۲۷- آتشے اندر ہوا غلتیدہ ے — شعلہ ے در شعلہ ے پیچدہ ے
۲۸- آتشے از دودِ پیچاں تلخ پوش — آتشے تندر غو و دریا خروش
۲۹- در کنارش مارہا اندر ستیز — مارہا با کفچہ ہائے زہر ریز
۳۰- شعلہ اش گیرندہ چوں کلب عقور — ہولناک و زندہ سوز و مردہ نور
۳۱- در چنیں دشت بلا صد روزگار — خوشتر از محکومی یک دم شمار

۲۵- ایک بنجر زمین جو بچھوؤں کے ڈنک کے زہر سے کانٹوں ہی سے بھری رہتی ہو اس میں موجود چیونٹیاں اژدہے کو کاٹتی اور بچھوؤں کا شکار کرتی ہوں؛

۲۶- اس (بنجر زمین) کی باد صرصر چاہے دوزخ کی آگ کی نسل سے ہو' اس کی ابلیسی کشتی کو پار لگانے کے لیے چاہے موافق ہوائیں چلتی ہوں۔

۲۷- خواہ اس میں ایسی ہوا ہو جو آگ سے بھری ہو اور اس آگ میں خواہ شعلے کے اندر شعلہ سمایا ہو یعنی بہت آگ ہو؛

۲۸- ایسی آگ جس کو بل کھاتے ہوئے دھوئیں نے ڈھانپ رکھا ہو' ایسی آگ جس میں آسمانی بجلی یا بادل کی سی کڑک ہو اور سمندر کے سے شور والی ہو؛

۲۹- ایسی آگ جس کے پہلو میں سانپ آپس میں لڑلڑا رہے ہوں۔ ایسے سانپ جن کے پھنوں سے زہر ٹپکتا ہو؛

۳۰- اس (آگ) کا شعلہ خواہ باؤلے کتے کی طرح لپکنے والا ہو۔ وہ ڈرانے والا' زندہ حرارت اور مردہ نور والا ہو (اس میں تپش تو بہت ہو لیکن چمک نہ ہو) ان چھ اشعار میں جو کچھ کہا گیا ہے' ساتویں شعر میں اس کے حوالے سے بات ہوئی ہے۔

۳۱- اس قسم کے مصیبتوں اور دکھوں تکلیفوں سے پُر بیابان میں سو سال بسر کرنے کو غلامی کے ایک پل سے بھی زیادہ بہتر سمجھ۔ گویا علامہ نے انتہائی زوردار اور منفرد انداز میں غلامی کی زندگی کو بہت بڑی لعنت اور برائیوں کی جڑ نیز دکھوں' دردوں اور بے حسی کا باعث قرار دیا ہے۔

در بیانِ فنونِ لطیفہ غلاماں

غلاموں کے اعلیٰ درجے کے فنون (FINE ARTS) کے بیان میں

موسیقی

۱- مرگ ہا اندر فنونِ بندگی — من چہ گویم از فسونِ بندگی

۲- نغمۂ او خالی از نارِ حیات — ہمچو سیل افتد بدیوارِ حیات

۳- چوں دلِ او' تیرہ سیمائے غلام — پست چوں طبعش' نوا ہائے غلام

۴- از دلِ افسردۂ او سوز رفت — ذوقِ فردا ' لذتِ امروز رفت

۵- از نےِ او آشکارا رازِ او — مرگِ یک شہر است اندر سازِ او

۶- ناتوان و زار می سازد ترا — از جہاں بیزار می سازد ترا

۷- چشم او را اشک پیہم سرمہ ایست — ناتوانی بر نوائے او مایست

۸- الحذر ایں نغمہ' موت است و بس — نیستی در کسوتِ صوت است و بس

۹- تشنہ کامی؟ ایں حرم بے زمزم است — در بم و زیرش ہلاکِ آدم است

۱۰- سوزِ دل از دل برد غم می دہد — زہر اندر ساغر جم می دہد

۱۱- غم دو قسم است اے برادر گوش کن — شعلۂ مارا چراغ ہوش کن

۱۲- یک غم است آں غم کہ آدم را خورد — آں غم دیگر کہ ہر غم را خورد

۱۳- آں غم دیگر کہ مارا ہمدم است — جانِ ما از صحبت او بے غم است

۱۴- اندرو ہنگامہ ہائے غرب و شرق — بحرِ در وے جملہ موجودات غرق

۱۵- چوں نشیمن می کند اندر دلے — دل ازو گردد یم بے ساحلے

۱۶- بندگی از سر جاں نا آگہی است — زاں غم دیگر سرودِ او تہی است

۱۷- من نمی گویم کہ آہنگش خطا ست — بیوہ زن را ایں چنیں شیون رواست

۱- غلامی میں تخلیق ہونے والے فنون (Arts) میں گویا موتیں چھپی ہوئی ہیں۔ میں غلامی کے سحر کے بارے میں کیا کہوں۔ گویا غلام فنکاروں کے ہر فن میں زندگی کی حرارت اور جوش وجذبہ کی بجائے موت کی سی خنکی ہوتی ہے۔

۲- اس (غلام موسیقار) کا ہر نغمہ زندگی کی آگ یا حرارت سے خالی ہوتا ہے اور وہ سیلاب کی طرح زندگی کی دیوار سے ٹکراتا یعنی اسے گرادیتا ہے۔

۳- غلام کی پیشانی اس کے دل کی طرح تاریک ہوتی ہے۔ غلام موسیقار کے نغمے اس کی طبیعت/ فطرت کی طرح پست ہوتے ہیں۔ گویا اس کا ظاہر و باطن دونوں تاریکی میں ڈوبے ہوئے ہیں اور اس کے نغمے سننے والوں کو پستی کی طرف لے جاتے ہیں۔

۴- اس کے افسردہ دل سے سوز غائب ہوگیا اور مستقبل کا ذوق اور حال کی لذت سے اس کا دل خالی ہوگیا۔ غلامی کے باعث موسیقار کا دل سوز سے خالی ہوتا ہے جس کے نتیجے میں اس کے نغموں کی بھی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ ان میں حال اور مستقبل کی زندگی کو پر لطف بنانے کا کوئی سامان نہیں ہوتا۔

۵- اس کی بانسری سے اس کا راز آشکارا/ ظاہر ہے۔ اس کے ساز میں ایک شہر کی موت پوشیدہ ہے۔ اس کے بے سوز نغموں سے پورا معاشرہ تباہی کا شکار ہوجاتا ہے۔

۶- اس (غلام موسیقار) کا نغمہ تجھے ناتواں اور عاجز بناتا ہے اور اس دنیا سے تجھے بیزار کردیتا ہے۔ گویا اس کے ساز سے نکلنے والے نغمے سننے والوں کو تگ ودو اور جہد وعمل کی زندگی بسر کرنے کی بجائے بے مقصد زندگی کی طرف یا عیش وتفریح کی طرف لے جاتے ہیں۔

۷- اس کی آنکھوں سے مسلسل بہنے والے آنسو اس کی آنکھوں کا سرمہ ہیں۔ جہاں تک تجھ سے ہوسکے تو اس کے نغمے نہ سن' ان پر کان نہ دھر، گویا غلام موسیقار مستقل طور پر غم و

الم اور پریشانی کا شکار رہتا ہے۔

۸- بچو، ڈرو، یہ سراسر موت کا نغمہ ہے اور بس۔ یہ (نغمہ) آواز کے لباس میں فنا ہے اور کچھ نہیں یعنی اس سے انسانی روحانی جذبے ختم ہو جاتے ہیں۔

۹- کیا تو پیاسا ہے؟ (کیا تجھے موسیقی سے دل چسپی ہے یا تو موسیقی کا پیاسا ہے؟ تو پھر سن لے کہ) اس کعبہ میں زمزم کا چشمہ/ پانی نہیں ہے۔ اس کے اونچے اور نچلے سر انسان کی ہلاکت کا باعث بنتے ہیں۔ اس سے دلچسپی رکھنے والے اپنی حقیقی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں یعنی ان کی روحیں فنا ہو جاتی ہیں اور ان کے جذبے وغیرہ ختم ہو جاتے ہیں۔

۱۰- (غلامی کے دور کی موسیقی) دل سے دل کا سوز لے جاتی اور اس کی بجائے غم دیتی ہے۔ یہ موسیقی ساغر جمشید میں زہر ڈالتی ہے۔ یہ بظاہر دل کش موسیقی الٹا غم والم سے دوچار کر دیتی ہے۔ ایسے غم جو انسان کی شان کے خلاف ہوتے ہیں۔

۱۱- اے بھائی! ذرا غور سے سن، غم دو قسم کے ہوتے ہیں۔ میرے شعلے کو اپنے ہوش کا چراغ بنا لے۔ مطلب یہ کہ جو کچھ میں کہنے لگا ہوں اسے پورے غور سے سن۔

۱۲- ایک غم تو وہ غم ہے جو انسان کو کھا جاتا ہے۔ ایک دوسرا غم ایسا غم ہے جو ہر غم کو کھا جاتا ہے۔

۱۳- یہ دوسرا غم جو ہمارا ہمدم/ ساتھی ہے، ہماری جان اس کی صحبت کے باعث بے غم ہو جاتی ہے۔ گویا سب غموں کو کھا جانے والا غم، غم عشق ہے جس سے انسان کی بقا کا سامان ہوتا ہے اور وہ (انسان) دنیاوی غموں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

۱۴- اس غم دیگر میں مغرب و مشرق کے ہنگامے ہیں۔ وہ ایسا سمندر ہے جس میں تمام کائنات غرق ہے۔ غم عشق میں دنیا بھر کے ہنگامے رہتے ہیں۔

۱۵- جب وہ (غم عشق) کسی دل میں ٹھکانا کرتا ہے تو اس کی بدولت وہ دل ایک بیکراں (بے حد وسیع) سمندر بن جاتا ہے۔

۱۶- غلامی نام ہے جان کے راز سے ناواقفیت کا، اس دوسرے غم (غم عشق) سے اس موسیقی کا راگ خالی ہے یعنی غلامی کی موسیقی سے سامعین کا دل جذبہ ہائے عشق سے خالی ہو جاتا ہے اور الٹے سیدھے خیالات کا حامل بن جاتا ہے۔

۱۷- میں یہ تو نہیں کہتا کہ اس (موسیقی) کا سر تال غلط ہے، ہاں اتنا ہے کہ اس کے سر تال ایک طرح سے ماتم یا نوحہ گری کی ایسی آوازیں ہیں جو ایک بیوہ عورت (جس کا شوہر

مر چکا ہو) ہی کے لیے مناسب ہیں۔ گویا سر یا فن کے لحاظ سے تو یہ موسیقی ہی ہے لیکن تاثیر کے لحاظ سے یہ انسانی جذبوں اور ہمت و حوصلہ کو ختم کرنے کا باعث بنتی ہے۔

۱۸- نغمہ باید تندرو مانند سیل | تابرد از دل غماں را خیل خیل

۱۹- نغمہ می باید جنوں پروردہ ے | آتشے در خونِ دل حل کردہ ے

۲۰- از نمِ او شعلہ پروردن تواں | خامشی راجزوِ او کردن تواں

۲۱- می شناسی؟ در سرود است آں مقام | ''کاندرو بے حرف' می روید کلام''

۲۲- نغمہ روشن چراغِ فطرت است | معنی او نقشبند صورت است

۲۳- اصل معنی را ندانم از کجاست | صورتش پیدا و باما آشنا است

۲۴- نغمہ گر معنی ندارد مردہ ایست | سوزِ او از آتش افسردہ ایست

۲۵- رازِ معنی مرشدِ رومی کشود | فکرِ من بر آستانش در سجود

۲۶- ''معنی آں باشد کہ بستاند ترا | بے نیاز از نقش گرداند ترا

۲۷- معنی آں نبود کہ کو رو کرکند | مرد رابر نقش عاشق ترکند''

۲۸- مطربِ ما جلوۂ معنی ندید | دل بصورت بست و از معنی رمید

۱۸- نغمہ ایسا ہونا چاہیے جو سیلاب کی مانند تیز رو ہوتا کہ وہ (نغمہ) سننے والوں کے دلوں کے بے شمار غم دور کر دے۔ ''سیلاب کی مانند'' سے مراد ہے کہ وہ سامع میں جذبہ و ولولہ اور جوش و ہمت پیدا کر دے۔

۱۹- نغمہ ایسا ہونا چاہیے جس کی پرورش جنون نے کی ہو اور جس کے دل کے خون میں آگ حل کی گئی ہو۔ گویا اگر موسیقار/مغنی خود جذبۂ عشق سے سرشار ہوگا تو ظاہر ہے اس کے نغموں میں بھی وہ آتش عشق ہوگی جو سننے والوں کے دلوں کو گرما دے گی۔

۲۰- مذکورہ نغمے کی نمی سے شعلے کی پرورش کی جا سکتی ہے اور خاموشی کو اس کا جزو بنایا جا سکتا ہے۔ گویا اس سے حیرت انگیز اثرات پیدا ہو سکتے ہیں۔ نمی اور شعلہ' نیز خاموشی اور آواز/نغمہ آپس میں ایک دوسرے کی ضد ہیں اور یہ علامت ہیں حیرت انگیز اثرات کی۔

۲۱- کیا تجھے علم ہے کہ راگ میں ایسا مقام ہے جس میں کلام الفاظ کے بغیر ہوتا ہے۔ دوسرا مصرع مولانا رومی کی مثنوی کے دفتر اول کے اس عنوان ''اعتراض کردن مریداں برخلوتِ وزیر بار دیگر'' کے تحت اس شعر کا دوسرا مصرع ہے۔ پورا شعر یوں ہے:

اے خدا بنما تو جاں را آں مقام

کاندرو بے حرف می روید کلام

(اے خدا تو جان کو ایسا مقام دکھا کہ جہاں الفاظ ...... الخ) مطلب یہ کہ مغنی جب جذبہ عشق سے سرشار ہو کر نغمہ چھیڑے گا تو اس میں بھی ایسی ہی کیفیت پیدا ہوگی۔

۲۲- روشن یا حقیقی نغمہ فطرت کا چراغ ہے۔ ایسے نغمے کی حقیقت صورتیں بنانے والی ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ مغنی چونکہ جذبۂ عشق سے سرشار ہے اور یہ گویا اس کے دل میں آتش عشق ہے جو اس کے باطن کو روشن کیے ہوئے ہے اس لیے اس سوز و گداز کے باعث اس کے نغموں میں حقیقی یا صحیح راگ ہوتے ہیں۔

۲۳- اس مذکورہ معنی/حقیقت کی اصل کیا ہے؟ مجھے اس کا علم نہیں۔ اس کی صورت تو ظاہر ہے اور ہم سے آشنا ہے یعنی اس معنی کی صورت نغمہ کی آواز اور الفاظ کی شکل میں ظاہر ہے۔ اس کیفیت کو محسوس تو کیا جا سکتا ہے لیکن بیان نہیں کیا جا سکتا۔ گویا نغمہ پہلے کسی لفظ کے معنی کی طرح عشق کی صورت میں پوشیدہ ہوتا ہے، پھر گانے والے کے گلے سے نکل کر سر تال کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

۲۴- اگر نغمہ میں معنی یعنی جذبہ عشق شامل نہیں ہے تو وہ محض مردہ ہے (اس کی کوئی حقیقت یا قدر و قیمت نہیں ہے) اس کا سوز بجھی ہوئی آگ کا سوز ہے یعنی وہی بے قدر و بے حقیقت ہے۔

۲۵- مرشدِ رومیؒ نے معنی کا راز ظاہر کیا ہے جن کے آستانے پر میری فکر سجدے میں پڑی ہے۔ علامہ نے چونکہ مولانا کے کلام سے بہت فیض حاصل کیا ہے، اس لیے انہیں وہ اپنا مرشد کہتے ہیں۔ شعر ۲۶ اور ۲۷ مثنوی رومیؒ کے ہیں۔

۲۶- معنی وہ ہے جو تجھے خود میں جذب کر لے اور تجھے نقش سے بے نیاز کر دے۔ گویا معنی وہ ہے جو الفاظ کے بغیر تیرے دل میں ٹک جائے۔ اسی طرح صوفی/ سالک بھی ایک مقام پر آ کر سر تال (آواز موسیقی) سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور اس کی حقیقت سے آگاہ ہو کر اس میں محو ہو جاتا ہے۔

۲۷- معنی وہ نہیں ہے جو انسان کو اندھا اور بہرا کر دے اور آدمی کو نقش یعنی صورت/ ظاہر پر زیادہ عاشق کر دے۔ گویا حقیقت سے جو غافل کر دے وہ معنی نہیں ہے۔ زبورِ عجم کے دوسرے مصرعے میں ''مرد را......'' چھپا ہے جو غلط ہے۔ ایرانی ایڈیشن کے مطابق صحیح ''مرترا'' ہے۔ یہ دونوں اشعار مثنوی دفتر دوم میں ''فی المناجات'' کے

تحت آئے ہیں۔

۲۸- ہمارے مغنی/موسیقار نے معنی کا جلوہ نہیں دیکھا۔ اس نے بس صورت/ظاہر ہی سے دل لگائے رکھا معنی سے بھاگ گیا۔ اس کا باعث وہی غلامی کی زندگی ہے، چنانچہ غلامانہ ذہنیت نے اس میں یہ کیفیت و حالت پیدا کی ہے۔

مصوری

۱- ہم چناں دیدم فن صورت گری — نے براہیمی درو نے آزری

۲- ''راہبے در حلقۂ دامِ ہوس — دلبرے با طائرے اندر قفس

۳- خسروے پیشِ فقیرے خرقہ پوش — مردِ کوہستانی ہیزم بدوش

۴- نازنینے در رہِ بت خانہ ے — جوگیے در خلوتِ ویرانہ ے

۵- پیر کے از دردِ پیری داغ داغ — آں کہ اندر دستِ او گل شد چراغ

۶- مطربے از نغمۂ بیگانہ مست — بلبلے نالید و تارِ او گسست

۷- نوجوانے از نگاہے خوردہ تیر — کودکے برگردنِ بابائے پیر''

۸- می چکد از خامہ ہا مضمونِ موت — ہر کجا افسانہ و افسونِ موت

۱- میں نے مصوری کے فن کو بھی کچھ ایسا ہی پایا ہے۔ اس میں نہ تو براہیمی ہی ہے اور نہ آزری ہی۔ (فرہنگ دیکھیے) گویا مصور بھی غلامانہ ذہنیت کا شکار ہونے کے باعث جدتِ تخلیق وغیرہ سے دور ہے۔

۲- اس مصور کی تصویریں کچھ اس ڈھب کی ہوتی ہیں کہ ایک راہب حرص و ہوس کے جال میں گرفتار کسی ویرانے میں بیٹھا ہے یا پھر کوئی حسین/معشوق کسی پرندے کے ساتھ پنجرے میں بیٹھا ہے۔ گویا بیکار قسم کی تصویریں جو دیکھنے والے میں جوش و جذبہ پیدا کرنے کی بجائے اس میں مایوسی اور ست الوجودی پیدا کرتی ہیں۔

۳- (یا پھر اس قسم کی تصویریں بنائی جاتی ہیں کہ) کوئی بادشاہ کسی خرقہ پوش فقیر کے حضور کھڑا یا بیٹھا ہے یا کوئی پہاڑی علاقے کا باشندہ کندھوں پر ایندھن اٹھائے لیے جا رہا ہے۔

۴- یا کوئی نازنین بت خانے کے راستے میں ہے یا کوئی جوگی کسی ویرانے میں خلوت اختیار کیے ہوئے ہے۔

۵- یا کوئی بوڑھا بڑھاپے کے درد سے داغ داغ ہوتا ہے' اس کی تصویر کچھ اس طرح ہوتی ہے کہ اس کے ہاتھ میں رکھا ہوا چراغ بجھ چکا ہے۔ یہ گویا علامت ہے اس کی جوانی یا عمر کے خاتمے کی۔

۶- کسی تصویر میں یہ دکھایا گیا ہے کہ کوئی گانے والا کسی غیر کے نغمے میں محو و مست ہے اور کسی میں یہ کہ کوئی بلبل روئی اور اس کی سانس ٹوٹ گئی۔

۷- یا کسی ایسے نوجوان کی تصویر ہے جس نے کسی حسینہ کی نگاہوں کا تیر کھایا ہے یا پھر ایسی تصویر جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ کوئی بچہ بوڑھے کی گردن پر بیٹھا ہوا ہے۔

۸- (اس قسم کی تصویروں کے ذکر کے بعد نتیجہ یہ نکالا ہے) کہ غلام مصوروں کے قلموں سے موت کا مضمون ہی ٹپکتا ہے اور ان کی تصویروں میں موت ہی کا افسانہ وافسوں نظر آتا ہے۔

۹- علم حاضر پیش آفل در سجود — شک بیفزود و یقیں از دل ربود
۱۰- بے یقیں را لذت تحقیق نیست — بے یقیں را قوتِ تخلیق نیست
۱۱- بے یقیں را رعشہ ہا اندر دل است — نقش نو آوردن او را مشکل است
۱۲- از خودی دور است و رنجور است و بس — رہبر او ذوقِ جمہور است و بس
۱۳- حسن را دریوزہ از فطرت کند — رہزن و راہِ تہی دستے زند
۱۴- حسن را از خود بروں جستن خطاست — آنچہ می بایست پیش ما کجاست؟
۱۵- نقش گر خود را چو با فطرت سپرد — نقش۔ او افگند و نقش خود سترد
۱۶- یک زماں از خویشتن رنگے نزد — بر زجاج ما گہے سنگے نزد
۱۷- فطرت اندر طیلسانِ ہفت رنگ — ماندہ بر قرطاسِ او با پائے لنگ
۱۸- بے تپش پروانۂ کم سوزِ او — عکس فردا نیست در امروزِ او
۱۹- از نگاہش رخنہ در افلاک نیست — زانکہ اندر سینہ دل بیباک نیست
۲۰- خاکسار و بے حضور و شرمگیں — بے نصیب از صحبت روح الامیں
۲۱- فکرِ او نادار و بے ذوقِ ستیز — بانگِ اسرافیل او بے رستخیز
۲۲- خویش را آدم اگر خاکی شمرد — نورِ یزداں در ضمیرِ او بمرد
۲۳- چوں کلیمے شد بروں از خویشتن — دست او تاریک و چوبِ او رسن
۲۴- زندگی بے قوتِ اعجاز نیست — ہر کسے دانندۂ ایں راز نیست

۹- دورِ حاضر یعنی دورِ غلامی کا علم باطل/ فنا کے آگے سر سجدے میں رکھے ہوئے ہے۔ اس علم کے باعث شک میں تو اضافہ ہو گیا ہے جبکہ یقین اس نے دل سے اچک لیا ہے یعنی اس علم کی ساری توجہ مادیات کی طرف ہے جن کا حقیقی وجود نہیں ہے۔

۱۰- جو شخص بے یقینی کا شکار ہے، وہ تحقیق کی لذت سے محروم ہی رہتا ہے۔ ایسا بے یقین شخص تخلیق کی قوت سے بھی عاری ہوتا ہے۔ اگر وہ تحقیق و تخلیق سے دلچسپی رکھے تو اس میں یقین کی قوت پیدا ہو گی اور یوں وہ بلند مقام و مرتبہ حاصل کر سکے گا۔

۱۱- بے یقین کے دل میں لرزے ہی طاری رہتے ہیں۔ کوئی نیا نقش تخلیق کرنا اس کے لیے دشوار ہوتا ہے۔ بے یقینی کی حالت میں یہی کیفیت اس پر طاری رہتی ہے کہ اگر ایسا کیا تو یوں نہ ہو جائے، ویسا کیا تو ایسا نہ ہو جائے۔

۱۲- وہ (بے یقین انسان) خودی سے دور اور صرف غم و الم میں مبتلا رہتا ہے۔ اس کا رہنما صرف جمہور کا ذوق ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ چونکہ اس میں خود کچھ سوچنے اور نت نئی چیز تخلیق کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی اس لیے جو کچھ عوام کی خواہش ہوتی ہے اس کے مطابق وہ نقش بناتا رہتا ہے۔

۱۳- وہ حسن کی بھیک فطرت سے مانگتا ہے۔ وہ راہ مار/ لٹیرا ہے اور کسی کنگال یا بے دولت کی راہ مارتا (اسے لوٹتا) ہے۔ گویا وہ حسن کو اپنے باہر تلاش کرتا ہے۔ اگر وہ حقیقی تخلیق کار ہو تو حسن اس کے اپنے اندر ہو گا جس سے اپنی تخلیقات کو حسین بنا سکتا ہے۔ اس کی موجودہ حالت مذکورہ راہ ماری کی طرح بے مقصد اور بے فائدہ ہے۔

۱۴- حسن کو اپنے باہر ڈھونڈنا/ تلاش کرنا خطا ہے۔ جو کچھ کہ ہونا چاہیے (یا جس کی ہمیں ضرورت ہے) وہ ہمارے سامنے کہاں ہے؟ گویا حسن خود دیکھنے والے کے اپنے اندر ہوتا ہے۔ ہمارا دل جس حسن کی تلاش میں ہے وہ خارج میں نہیں خود ہمارے اندر ہے، اسے دیکھنے کے لیے ذوقِ نظر کی ضرورت ہے۔ یہ مصوری جس ظاہری حسن کی عکاسی کرتی ہے وہ حقیقی حسن نہیں ہے۔

۱۵- جب کسی مصور/ نقش گر نے خود کو فطرت کے حوالے کر دیا تو اس نے گویا اس (فطرت) کا نقش تو کھینچ دیا لیکن اپنا نقش مٹا دیا۔ جو مصور کسی قدرتی منظر (چاند ستاروں وغیرہ) کی تصویر کشی کرتا ہے تو یہ اس کے فن کا کمال نہیں ہے کیونکہ وہ تو قدرت نے پہلے ہی تیار کر رکھی ہے۔ ''اپنا نقش مٹا دیا'' سے مراد ہے کہ اس نے اپنی

تخلیقی قوت کو، اگر اس میں کچھ ہے، ختم کر لیا ہے۔

۱۶- مذکورہ نقاش نے ایک مرتبہ بھی کسی تصویر میں رنگ نہیں بھرا۔ اس نے ہمارے شیشے پر پتھر نہیں مارا یعنی وہی قدرتی مناظر کی تصویر کشی کرتا رہا، اپنے تخیل اور کسی قسم کی جدت کا اظہار نہیں کیا جس کے باعث ہمارے لیے اس کی تصویر میں کوئی دل کشی نہ رہی یا اس کی تصویریں ہمارے دل میں جذبہ وولولہ پیدا کرتیں، ایسا نہیں ہوا۔

۱۷- فطرت/قدرت (Nature) اپنی سات رنگی چادر میں اس کے کاغذ پر لنگڑے پاؤں کے ساتھ کھڑی ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ قدرت اپنی فضا میں سات رنگوں سے آراستہ ہے۔ مصور ان مناظر کی تصویر انہی رنگوں میں اپنے کاغذ پر بناتا ہے۔ ان قدرتی مناظر میں جو حسن و دل کشی ہے وہ تصویر میں کیونکر پیدا ہو سکتی ہے کہ وہ اصل نہیں نقل ہے۔ اس کی مثال لنگڑے پاؤں کی ترکیب سے دی ہے۔

۱۸- اس کا پروانہ شمع پر قربان ہو کر نہ جلنے والا ہے۔ اس کے حال میں مستقبل کا عکس نہیں ہے۔ اس کے فن میں اس کا خونِ جگر یعنی سوزِ عشق شامل نہیں ہے اور نہ کوئی جدت ہے جس سے وہ (فن) منفرد بن جائے۔

۱۹- اس کی نگاہوں سے آسمانوں میں کوئی شگاف نہیں ہے، اس لیے کہ اس کے سینے میں بیباک دل نہیں ہے۔ جذبہ و سوزِ عشق سے خالی ہونے کے باعث نہ اس کی نگاہ میں سوز ہے اور نہ دل ہی حرارتِ عشق سے مالا مال ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ مذکورہ نقالی نہ کرتا اور اس میں خاص جدت و جرأت ہوتی۔

۲۰- وہ (ویسا تو نہیں ہے البتہ) خاکسار، بے حضور اور شرم کا مارا ہوا ہے اور روح الامین کی صحبت سے محروم ہے یعنی اس میں کوئی ایسا الہامی تخیل و فکر ہی نہیں ہے جس کی بنا پر وہ بے خوفی کے ساتھ قدرتی مناظر سے ہٹ کر جدت کی حامل تخلیقات سامنے لاتا۔

۲۱- اس کی فکر کنگال/مفلس ہے اور جنگ آزمائی کے ذوق سے خالی۔ اس کے اسرافیل کے صور کی آواز قیامت کے بغیر ہی ہے۔ وہی باتیں نئے استعارے میں کہی ہیں۔ گویا غلامی نے اس کی تخلیقی قوتیں ختم کر دی ہیں۔

۲۲- اگر انسان خود کو مٹی کا پتلا سمجھے تو یہ جان لو کہ خدا کا نور اس کے ضمیر میں ختم ہو گیا۔ آدم میں خدا کی پھونکی ہوئی روح ہے اور یوں وہ خدائی صفات کا مظہر ہے۔ اس لحاظ سے جو کوئی خدا کو پانا چاہتا ہے وہ پہلے خود کو پالے یعنی اپنی معرفت سے آگاہ ہو۔

۲۳- جب کوئی کلیمؑ اپنے آپ سے باہر آ گیا یعنی اپنی معرفت سے بیگانہ ہو گیا تو وہ محض ایک عام انسان بن گیا۔ اس/ انؑ میں ید بیضا والا اور عصا والا معجزہ نہ رہا۔ ہاتھ تاریک ہو گیا اور عصا رسی بن گیا۔ انسان کے اندر سے نور یزداں نکل جائے تو وہ محض ایک چلتی پھرتی لاش رہ جاتا ہے۔

۲۴- زندگی معجزے کے بغیر کچھ بھی نہیں یعنی بے حقیقت ہے اور ہر کوئی اس راز سے آگاہ نہیں ہے۔ جو کوئی اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کو عمل میں نہیں لاتا اس کی زندگی بیکار اور محض چلتی پھرتی لاش کا نام ہے۔

۲۵- آں ہنر مندے کہ بر فطرت فزود ۔۔۔ رازِ خود را بر نگاہِ ما کشود
۲۶- گرچہ بحرِ او ندارد احتیاج ۔۔۔ می رسد از جوئے ما او را خراج
۲۷- چیں رباید از بساطِ روزگار ۔۔۔ ہر نگار از دست او گیرد عیار
۲۸- حورِ او از حورِ جنت خوشتر است ۔۔۔ منکر لات و مناتش کافر است
۲۹- آفریند کائناتِ دیگرے ۔۔۔ قلب را بخشد حیاتِ دیگرے
۳۰- بحر و موج خویش را بر خود زند ۔۔۔ پیش ما موجش گہری افگند
۳۱- زاں فراوانی کہ اندر جانِ اوست ۔۔۔ ہر تہی را پرنمودن شانِ اوست
۳۲- فطرتِ پاکش عیارِ خوب و زشت ۔۔۔ صنعتش آئینہ دارِ خوب و زشت
۳۳- عینِ ابراہیمؑ و عینِ آزر است ۔۔۔ دستِ او ہم بت شکن ہم بت گر است
۳۴- ہر بنائے کہنہ را برمی کند ۔۔۔ جملہ موجودات را سوہان زند

۲۵- وہ ہنرمند/ مصور جس نے فطرت میں اضافہ کیا' اس نے اپنا راز ہماری نگاہ پر یا ہم پر کھول دیا۔ گویا اس نے محض نقاشی نہیں کی بلکہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی بنا پر مختلف انداز میں فطرت کے حسن میں اضافہ کیا اور دلچسپی پیدا کی ہے جس سے ہم پر اس کے حسن کی خوبیاں پہچاننے کی صلاحیت واضح ہو گئی۔

۲۶- اگرچہ ایسے مصور کے سمندر کو کوئی احتیاج/ ضرورت نہیں ہے لیکن پھر بھی ہماری ندی کی طرف سے اسے خراج پہنچتا ہے یعنی اس کی تخلیقی جدت سے متاثر ہو کر لوگ اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جبکہ اسے دوسروں کی تعریف کی ضرورت نہیں رہتی۔ وہ تعریف سے بے نیاز ہوتا ہے۔

۲۷- وہ زمانے/ زندگی کے فرش/ چادر سے اس کے سلوٹ/ شکنیں دور کر دیتا ہے۔ ہر

محبوب/حسین اس کے ہاتھ سے اپنا معیار/ قدر و قیمت پاتا ہے۔ وہ اپنی تصویروں میں زندگی کا صحیح رخ پیش کرتا ہے اور جس کسی کے حسن کی تصویر معیاری صورت میں پیش کرے گا وہ گویا واقعی حسین ہوگا۔

۲۸- اس کی (تصویر میں بنائی ہوئی) حور جنت کی حور سے زیادہ حسین اور اچھی ہے۔ اس کے لات و منات کا منکر' کافر ہے۔ وہ اپنے قلم سے جن انسانوں کی تصویریں بناتا ہے' اہل مذہب کی نظر میں وہ گویا لات و منات کے بت اور خلافِ اسلام ہیں جبکہ علامہ کا یہ نظریہ ہے کہ ایسی عظیم تصویریں جو دیکھنے والے کے قلب و نظر میں عرفان اور جوش و جذبہ اور ولولہ پیدا کرتی ہوں' انہیں برا کہنا خود کفر ہے۔ گویا ایسے منکر لوگ فن مصوری کی تاثیر سے بے خبر اور تصویر کے حسن و خوبی کی تحسین کے ذوق سے عاری ہیں۔

۲۹- ایسا مصور ایک نئی کائنات تخلیق کرتا ہے اور انسانی دل کو ایک نئی زندگی عطا کرتا ہے۔ گویا وہ اپنی تصویروں میں اپنے جذبہ عشق سے سرشار ہونے کے باعث ایسی دنیا دکھاتا ہے جسے عام انسان نہیں دیکھ سکتا۔ اس کی تصویریں کچھ ایسی تاثیر کی حامل ہوتی ہیں کہ جنہیں دیکھ کر انسانی دل بیدار اور زندہ ہو جاتا ہے۔

۳۰- وہ (مصور) ایک سمندر ہے جو اپنی موجوں کو خود پر اچھالتا ہے۔ اس کی موجیں ہمارے سامنے موتی پھینکتی ہیں۔ گویا وہ اپنے فن میں کسی دوسرے کی تقلید نہیں کرتا بلکہ اپنی صلاحیتوں کو کام میں لاتا ہے اور اس طرح بے مثل اور منفرد تصویریں بناتا ہے۔ اس کی تصویریں کچھ ایسے حسن و خوبی کی حامل ہوتی ہیں کہ دیکھنے والے کو وہ موتی دکھائی دیتی ہیں۔

۳۱- اس کی جان میں (نئے سے نئے تخیلات کی) جو کثرت ہے' اس سے ہر خالی کو پر کرنا اس کی شان ہے۔ گویا وہ اپنی عظیم اور تاثیر کی حامل تصویروں سے ایسی نگاہوں کو سیر کر دیتا ہے جو اس سے پہلے ایسی تصویریں دیکھنے سے محروم رہی ہوں۔

۳۲- اس کی پاک سرشت اچھے اور برے کی کسوٹی ہے۔ اس کا فن اچھے اور برے کا آئینہ دار ہے۔ گویا اپنی تصویروں کے حوالے سے وہ اچھائی اور برائی کا جو امتیاز قائم کرتا ہے اس فن کے لحاظ سے انہیں ہی صحیح کہا جائے گا۔ اس کے فن کے آئینہ میں جو شکل اچھی ہے' وہ واقعی اچھی اور جو بری ہے وہ واقعی بری ہے۔

۳۳- وہ سراسر ابراہیمؑ اور سراسر آزر ہے۔ اس مصور کا ہاتھ بت شکن بھی ہے اور بت

بنانے والا بھی۔ حضرت ابراہیمؑ بت شکن تھے۔ اس حوالے سے مذکورہ مصور ایسی مصوری کے جو گھسے پٹے تخیل کی حامل ہوتی ہے، بتوں کو توڑ ڈالتا اور آزر کی طرح نئے نئے بت تراشتا یعنی نئے نئے تخیلات کی حامل مصوری تخلیق کرتا ہے۔

۳۴- ایسا مصور ہر پرانی عمارت/ بنیاد کو اکھاڑ ڈالتا ہے اور تمام کائنات پر یا کائنات میں موجود تمام اشیا پر ریتی پھیر دیتا یا چلا دیتا ہے۔ وہی بات نئے استعارے میں یعنی وہ پرانی اور گھٹیا قسم کی روایات کی حامل تصویروں کو نظر انداز کر دیتا اور جدتِ تخیل کی حامل تصویریں بناتا ہے اور موجودات کی اشیا کی تصویریں نئے اور دل کش انداز میں بناتا ہے اور یوں دورِ غلامی کے مصوروں کے تصورات مٹا دیتا ہے۔

۳۵- در غلامی تن زِجاں گردد تہی   از تنِ بے جاں چہ امید بہی
۳۶- ذوقِ ایجاد و نمود از دل رود   آدمی از خویشتن غافل رود
۳۷- جبرئیلے را اگر سازی غلام   برفتد از گنبد آئینہ فام
۳۸- کیش او تقلید و کارش آزری است   ندرت اندر مذہب او کافری است
۳۹- تازگی ہا وہم و شک افزایدش   کہنہ و فرسودہ خوش می آیدش
۴۰- چشم او بر رفتہ از آیندہ کور   چوں مجاور رزقِ او از خاکِ گور
۴۱- گر ہنر این است مرگِ آرزو است   اندرونش زشت و بیرونش نکوست
۴۲- طائر دانا نمی گردد اسیر   گرچہ باشد دامے از تارِ حریر

۳۵- غلامی میں جسم روح سے خالی ہو جاتا ہے، سو بے جان جسم سے بہتری کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔ جو جسم جذبۂ عشق ہی سے خالی ہو وہ تو محض چلتی پھرتی لاش ہی رہ جاتا ہے۔ اس صورت میں وہ کوئی عظیم کارنامہ کیونکر انجام دے سکتا ہے۔

۳۶- (غلامی کے باعث) دل سے ایجاد (نت نئی تخلیق کا) اور نمود کا ذوق دل سے نکل جاتا، ختم ہو جاتا ہے۔ آدمی اپنے آپ سے غافل ہو جاتا ہے یعنی وہ اپنی معرفت سے بے خبر ہونے کے باعث اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کو بروئے کار لانے سے محروم ہو جاتا ہے۔

۳۷- اگر تو جبرئیل جیسی ہستی کو غلام بنا لے تو وہ بھی چمکتے ہوئے آسمان سے نیچے آ گرے گی۔ گویا جبرئیل بھی اپنی مخفی قوتوں/ صلاحیتوں کو بھول کر ذلت و پستی کا شکار ہو جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں غلامی انسانیت وغیرہ کی خطرناک دشمن ہے۔

۳۸- غلام کا مذہب دوسروں کی پیروی کرنا اور بت گری یا بت پرستی ہے۔ اس کے مذہب میں ندرت گویا کافری ہے۔ غلام اپنے آقاؤں کے نقش قدم پر چلتا یا چلنے پر مجبور ہوتا ہے اور ان کے بتوں کی پوجا کرتا ہے۔

۳۹- نئی نئی باتیں یا جدتیں اس کے وہم اور شک میں اضافہ کرتی ہیں۔ اسے تو بس پرانی اور گھسی پٹی باتیں ہی اچھی لگتی ہیں۔ غلامی میں اس کی سوچ اور فکر ختم ہو جاتی ہے جس کے باعث وہ اس وہم و شک کا شکار ہو جاتا ہے۔

۴۰- اس کی آنکھیں ماضی پر (جو کچھ گذر چکا ہے) لگی رہتی ہیں جبکہ آئندہ/مستقبل کے بارے میں وہ اندھی ہوتی ہیں۔ مجاور کی طرح اس کا رزق قبر کی خاک سے ہوتا ہے۔ گویا وہ ماضی میں محو اور اپنے مستقبل کے بارے میں بے فکر رہتا ہے۔ اس میں ایسا جذبہ ہی پیدا نہیں ہوتا جس سے وہ اپنے مستقبل کو سنوارنے کے لیے جدوجہد کرے۔ جس طرح مجاور کسی محنت کے بغیر اپنی گھٹیا اور ذلیل روزی حاصل کرتا ہے' اسی طرح ایک غلام کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اسے ہاتھ ہلائے اور محنت کیے بغیر روزی حاصل ہو جائے۔

۴۱- اگر غلام کا ہنر ایسا ہی ہے تو یہ گویا آرزو کی موت ہے۔ اس کا باطن برا اور ظاہر اچھا ہے۔ جب انسان کے سامنے کوئی مقصد یا آرزو ہی نہ ہو تو وہ کیونکر جہد و عمل سے اپنا مستقبل سنوارے گا۔ ایسا انسان یعنی غلام بظاہر آرام و سکون میں ہوگا لیکن باطنی طور پر اس کی زندگی بے کار قسم کی ہوگی۔

۴۲- ایک دانا پرندہ کبھی جال میں نہیں پھنستا۔ خواہ جال ریشمی تاروں ہی کا بنا ہوا کیوں نہ ہو۔ جو بھی انسان صاحب شعور ہے وہ غلامی کی زندگی کو کسی بھی صورت میں قبول نہیں کر سکتا۔ اگرچہ اس کی ظاہری زندگی کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہو۔

مذہب غلاماں

(غلاموں کا مذہب)

۱- در غلامی عشق و مذہب را فراق — انگبینِ زندگانی بد مذاق

۲- عاشقی؟ توحید را بر دل زدن — وانگہے خود را بہر مشکل زدن

۳- در غلامی عشق جز گفتار نیست — کارِ ماگفتارِ ما را یار نیست

۴- کاروانِ شوق بے ذوقِ رحیل　　بے یقین و بے سبیل و بے دلیل

۱- غلامی میں عشق اور مذہب ایک دوسرے سے الگ یا دور رہتے ہیں اور زندگی کا شہد بدمزہ یا بے مزہ ہوتا ہے۔ گویا غلام انسان کا مذہب سے تعلق رسمی سا ہوتا ہے۔ اس میں وہ جذبہ عشق نہیں ہوتا جو مذہب کے لیے ضروری ہے' یوں اس کی زندگی بیکار قسم کی یا بے لطف ہو جاتی ہے۔

۲- عاشقی کیا ہے؟ عاشقی توحید ایزدی کو دل میں بسانا/ سمانا ہے اور پھر خود کو ہر مشکل سے ٹکرانا ہے یا ہر مشکل کا سامان کرنا ہے تاکہ توحید پر صحیح معنوں میں اور پختہ ایمان ہو جائے۔

۳- غلامی میں عشق باتوں ہی کا مجموعہ ہوتا یا محض گفتار ہوتا ہے اور ہمارا عمل ہماری گفتار کا دوست نہیں ہے یعنی غلام انسان محض باتوں ہی سے عشق کے دعوے کرتا ہے جبکہ اس کا عمل اس کی باتوں کے موافق نہیں ہوتا۔

۴- غلامی میں شوق/عشق کا قافلہ کوچ کے ذوق سے خالی/ کے بغیر ہوتا ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ یقین کی قوت سے محروم اور بے راہ اور رہنما کے بغیر ہوتا ہے۔

۵- دین و دانش را غلام ارزاں دہد　　تابدن را زندہ دارد' جاں دہد

۶- گرچہ برلب ہائے او نامِ خداست　　قبلہ او طاقتِ فرماں رواست

۷- طاقتے نامش دروغ با فروغ　　ازبطونِ او نزاید جز دروغ

۸- ایں صنم تا سجدہ اش کردی خداست　　چوں یکے اندر قیام آئی فناست

۹- آں خدا نانے دہد' جانے دہد　　ایں خدا جانے برد نانے دہد

۱۰- آں خدا یکتاست ایں صد پارہ ایست　　آں ہمہ را چارہ ایں بے چارہ ایست

۱۱- آں خدا درمانِ آزارِ فراق　　ایں خدا اندر کلام او نفاق

۱۲- بندہ را با خویشتن خوگر کند　　چشم و گوش و ہوش را کافر کند

۱۳- چوں بجانِ عبدِ خود راکب شود　　جاں بہ تن لیکن زتن غایب شود

۱۴- زندہ و بے جاں چہ راز است ایں نگر　　باتو گویم معنی رنگیں نگر

۱۵- مردن و ہم زیستن اے نکتہ رس　　ایں ہمہ از اعتبارات است و بس

۱۶- ماہیاں را کوہ و صحرا بے وجود　　بہر مرغاں قعرِ دریا بے وجود

۱۷- مردِ کر سوزِ نوا را مردہ ے　　لذتِ صوت و صدا را مردہ ے

۱۸- پیش چنگے مست و مسرور است کور | پیش رنگے زندہ در گو راست کور
۱۹- روح باحق زندہ و پایندہ ایست | ورنہ ایں را مردہ آں را زندہ ایست
۲۰- آں کہ "حی لایموت" آمد حق است | زیستن باحق حیاتِ مطلق است
۲۱- ہر کہ بے حق زیست جز مردار نیست | گرچہ کس در ماتم او زار نیست
۲۲- از نگاہش دیدنی ہا در حجاب | قلب او بے ذوق و شوقِ انقلاب
۲۳- سوزِ مشتاقی بکردارش کجا | نورِ آفاقی بگفتارش کجا
۲۴- مذہب او تنگ چوں آفاقِ او | از عشا تاریک تر اشراقِ او
۲۵- زندگی بارِ گراں بر دوشِ او | مرگِ او پروردۂ آغوشِ او
۲۶- عشق را از صحبتش آزار ہا | از دمش افسردہ گردد نارہا
۲۷- نزدِ آں کرمے کہ از گل برنخاست | مہر و ماہ و گنبد گرداں کجاست

۵- غلام اپنے دین اور اپنے شعور و عقل کو سستے داموں بیچ دیتا ہے اور اس خاطر کہ وہ اپنے جسم کو زندہ و برقرار رکھ سکے وہ جان دے دیتا ہے یعنی اسے صرف روٹی ہی کی فکر رہتی ہے، روح کو زندہ رکھنے سے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔

۶- اگرچہ اس (غلام) کے ہونٹوں پر خدا کا نام ہوتا ہے لیکن اس کا قبلہ حاکم وقت کی طاقت ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ اپنے وقت کے حاکموں کے خوف کے باعث ان کے آگے سرنگوں ہوتا ہے۔

۷- حاکم وقت کی طاقت ایک ایسی طاقت ہے جس کا نام ترقی کرتا ہوا جھوٹ ہے، اس طاقت کے اندر سے جھوٹ کے سوا اور کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ یہ چونکہ باطل قوتیں ہیں، اس لیے ان کا ہر کام اور ان کی ہر بات جھوٹ پر مبنی ہوتی ہے۔

۸- جب تک تو (حاکموں کے اقتدار کے) بت کو سجدہ کرتا رہے گا، وہ خدا رہے گا لیکن اگر تو ذرا اس کے خلاف اٹھ کھڑا ہوگا تو فنا اس کا مقدر ہوگی۔ گویا اس اقتدار کے بت کا وجود تیرے اسے تسلیم کرنے کا باعث ہے۔

۹- وہ خدا (اللہ تعالیٰ) تو روٹی یعنی رزق بھی عطا کرتا ہے اور ہمیں جان سے بھی نوازتا ہے جبکہ یہ باطل خدا (اقتدار یا حاکموں کی قوت) زندگی لے جاتا ہے تب کہیں روٹی دیتا ہے۔ جس انداز سے وہ رزق کا انتظام کرتا ہے، اس سے غلام کی روح مردہ ہو کے رہ جاتی ہے۔

۱۰- وہ خدا (معبودِ مطلق) تو واحد ہے جبکہ یہ باطل خدا سو ٹکڑے ہے۔ وہ خدائے واحد سب بے بس اور عاجز لوگوں کا چارہ یا سہارا ہے جبکہ یہ خدا خود بیچارہ ہے۔

۱۱- وہ خدائے مطلق فراق کے دکھ کا علاج ہے جبکہ یہ باطل خدا ایسا ہے جس کے کلام/ باتوں میں نفاق ہی ہوتا ہے۔ خدائے مطلق تو ٹوٹے دلوں کو جوڑتا اور باہم اتفاق پیدا کرتا ہے جبکہ یہ خدا لوگوں میں انتشار و افتراق پیدا کرتا ہے تاکہ DEVIDE AND RULE کی بنا پر اس کا اقتدار برقرار رہے۔

۱۲- یہ باطل خدا بندے/ غلام کو خود سے مانوس کر لیتا ہے اور اس کی آنکھوں' کانوں اور عقل و شعور کو کافر بنا دیتا ہے۔ مطلب یہ کہ وہ غلام کو غلامی کا ایسا عادی بنا دیتا ہے کہ وہ آزادی کے بارے میں بالکل نہیں سوچتا اور دیکھنے' سننے اور سوچنے یا عقل سے کام لینے کے سلسلے میں اپنے حاکم و آقا ہی کے نقش قدم پر چلنے میں خوش رہتا ہے۔

۱۳- جب یہ باطل خدا/ حاکم اپنے بندے کی جان پر سوار ہو جاتا ہے تو غلام کے جسم میں جان ہوتے ہوئے بھی جسم سے غائب ہو جاتی ہے یعنی غلام بظاہر زندہ ہوتا ہے لیکن روحانی جذبوں سے محروم ہونے کے باعث وہ محض مٹی کا ایک مادھو یا چلتی پھرتی لاش رہ جاتا ہے۔

۱۴- ذرا یہ دیکھ/ غور کہ بندہ زندہ بھی ہو اور بے جان بھی' یہ کیا راز ہے؟ میں اس سلسلے میں تجھ سے دل کش و دل چسپ مضمون/ باطنی حقیقت بیان کرتا ہوں' تو اس پر غور کر۔

۱۵- اے نکتہ رس! مرنا بھی اور جینا بھی دونوں محض اعتبارات میں سے ہیں اور بس۔ گویا آزاد افراد کے نزدیک غلام محض ایک چلتی پھرتی لاش ہے جبکہ غلام افراد اپنے اس غلام بھائی کو زندہ ہی سمجھتے ہیں۔

۱۶- مچھلیوں کے لیے کوہ و صحرا کا وجود بے حقیقت بات ہے یعنی کوہ و صحرا کا وجود نہیں جبکہ پرندوں کے لیے سمندر/ دریا کی گہرائی کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اعتبارات کے حوالے سے استعاروں میں وضاحت کی جا رہی ہے۔

۱۷- ایک بہرا آدمی نغمہ کے سوز کے لحاظ سے مردہ ہے۔ چونکہ وہ سن نہیں سکتا' اس لیے اس کے آگے وہ گویا مردے کی مانند ہے' وہ (بہرا آدمی) صوت و صدا کی لذت کے اعتبار سے مردہ یعنی اس لذت سے بے بہرہ ہے۔

۱۸- ایک اندھا آدمی ساز کے سامنے یعنی اس کے نغمے سن کر تو مست اور مسرور/ خوش ہو

جاتا ہے لیکن رنگ کو دیکھنے کے اعتبار سے وہ ایک طرح سے زندہ درگور ہوتا ہے یعنی وہ دیکھ نہیں سکتا کہ رنگ کیا یا کون سا ہے اور یوں وہ گویا زندہ ہوتے ہوئے مردہ ہے۔

۱۹- روح حق کے ساتھ ہی زندہ و پائندہ (ہمیشہ رہنے والی) بنتی ہے ورنہ اس کے لیے (یعنی خدائے واحد کے نزدیک) تو یہ مردہ اور اس (باطل خدا) کے نزدیک زندہ ہے۔ انسانی روح معبودِ مطلق ہی سے وابستہ رہے تو وہ حقیقی زندگی کی حامل ہوتی ہے ورنہ بیکار ہے۔

۲۰- وہ (ذاتِ حق) جو ''حی لا یموت'' ہے' وہ حق ہے اور حق کے ساتھ جینا یعنی اس ذات سے وابستہ ہو کر جینا ہی مطلق حیات ہے' ایسی زندگی جسے فنا/ موت نہیں ہے۔

۲۱- جو کوئی حق سے وابستگی کے بغیر جیا وہ مردار کے سوا اور کچھ نہیں ہے' اگرچہ ایسے مرنے والے کے ماتم میں کوئی نہیں رو رہا۔ یہی مطلب کہ ایسا انسان محض ایک چلتی پھرتی لاش ہی ہوتا ہے۔

۲۲- اس کی نگاہ میں دیکھنے کے لائق چیزیں بھی پردہ میں رہتی ہیں۔ اس کا دل انقلاب برپا کرنے کے ذوق وشوق سے محروم ہوتا ہے۔ وہ بصیرت سے عاری ہونے کے باعث زندگی اور کائنات کے راز سے نابلد/ ناواقف رہتا اور غلامی کی زندگی ہی پر قناعت کرتے ہوئے جہد و عمل سے دور رہتا ہے۔

۲۳- اس کے کردار و عمل میں مشتاقی کا سوز کہاں ہوتا ہے یعنی نہیں ہوتا اور اس کی گفتار میں آفاقی نور کہاں ہوتا ہے (نہیں ہوتا) گویا غلامی کی زندگی بسر کرنے والے کا کردار جہد و عمل کی حرارت و گرمی سے خالی ہوتا اور اس کی گفتار اس کی بے بصیرتی کے باعث مختصر و محدود رہتی ہے (کائنات کے اسرار و رموز سے بے خبری)

۲۴- اس کا مذہب اس کی گفتار و کردار کی دنیا کی مانند تنگ/ محدود ہوتا ہے۔ اس کی رات اس کی صبح سے بھی زیادہ تاریک ہوتی ہے گویا غلام کا مذہب' تعصب' انتشار افتراق اور نفرت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

۲۵- اس کی زندگی اس کے کندھوں پر ایک بوجھ ہے اور اس کی موت اس کی اپنی گود کی پالی ہوئی ہے۔ وہ زندگی کو ایک نعمت سمجھنے اور اسے عظیم تر بنانے کی بجائے اسے ایک عذاب سمجھتا اور اس سے نجات چاہتا ہے۔

۲۶- عشق کو اس کی صحبت سے مختلف دکھ تکلیفیں گھیر لیتی ہیں اور اس کے دم/ سانس آگ کی

حرارت بھی ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ عشق کسی غلام کے بس کی بات نہیں' اگر وہ اختیار کرنا بھی چاہے تو الٹا اس کی تذلیل کا باعث بنتا ہے۔

۲۷۔ اس کیڑے کے نزدیک جو کبھی کیچڑ سے باہر نہیں نکلا' سورج اور چاند اور گردش کرتا ہوا آسمان کہاں ہے (نہیں ہے) غلام گویا ایسے کیڑے کی مانند ہے' اس لیے کہ وہ باطل خداؤں کا غلام اور آزادی کی نعمت سے بے خبر ہے اور حقیقی خدا سے وابستگی کی بنا پر زندگی کی جو عظمت ہے' اس کی اسے خبر نہیں۔

۲۸۔ از غلامے ذوقِ دیدارے مجوے — از غلامے جانِ بیدارے مجوے
۲۹۔ دیدۂ او محنت دیدن نبرد — در جہان خورد و گران خوابید و مرد
۳۰۔ حکمراں بکشایدش بندے اگر — می نہد برجانِ او بندے دگر
۳۱۔ سازد آئینے گرہ اندر گرہ — گویدش می پوش ازیں آئیں زرہ
۳۲۔ ریز پیزِ قہر و کیں بنمایدش — بیم مرگِ ناگہاں افزایدش
۳۳۔ تا غلام از خویش گردد نا امید — آرزو از سینہ گردد ناپدید
۳۴۔ گاہ او را خلعت زیبا دہد — ہم زمامِ کار در دستش نہد
۳۵۔ مہرہ را شاطر ز کف بیروں جہاند — بیدق خود را بفرزینی رساند
۳۶۔ نعمت امروز را شیداش کرد — تا بمعنی منکر فرداش کرد
۳۷۔ تن ستبر از مستی مہر ملوک — جانِ پاک از لاغری مانند دوک
۳۸۔ گردد ارزار و زبوں یک جانِ پاک — بہ کہ گردد قریۂ تن ہا ہلاک
۳۹۔ بند برپا نیست برجان و دل است — مشکل اندر مشکل اندر مشکل است

۲۸۔ تو کسی غلام میں دیدار کا ذوق مت تلاش کر اور کسی غلام میں جانِ بیدار نہ تلاش کر یعنی اس سے ان کی توقع نہ کر' اس لیے کہ غلامی کے باعث اس کی روح مردہ ہو جاتی ہے اور یوں وہ دیدارِ محبوبِ حقیقی کی اہلیت سے محروم ہو جاتا ہے۔

۲۹۔ اس (غلام) کی آنکھوں نے دیدارِ حق کی محنت نہیں اٹھائی۔ (کوشش ہی نہیں کی) اس نے دنیا میں بس کھانے پینے اور گہری نیند سے تعلق رکھا تا آنکہ وہ مر گیا۔ گویا اس کی زندگی غفلت میں اور جذبہ عشق سے خالی گذری۔

۳۰۔ اگر حاکم وقت (آقا) اس کی ایک زنجیر یا ہتھکڑی کھولتا ہے تو اس کی جان پر ایک اور زنجیر ڈال دیتا ہے یعنی وہ مختلف حیلوں بہانوں سے اسے اپنا مطیع بنائے رکھتا ہے۔

۳۱- حاکم وقت/ اس کا حاکم ایک ایسا قانون تیار کرتا ہے جو پیچ در پیچ (مکر وفریب سے پر) ہوتا ہے اور وہ غلام سے کہتا ہے کہ اس آئین کو تو اپنا لباس/ زرہ بنالے۔ غلام اس آئین میں اپنی خیر اور بھلائی سمجھتے ہوئے اسے بخوشی قبول کر لیتا ہے کہ زندگی کے ہر طرح کے دکھوں تکلیفوں وغیرہ سے (زرہ کے حوالے سے) وہ محفوظ رہے گا جبکہ در حقیقت وہ آئین ہی اس کا دشمن ہوتا یا خطرے کا باعث بنتا ہے۔

۳۲- حکمران اسے قہر اور دشمنی کا سامان دکھاتا ہے اور یوں اس کے اچانک آنے والی موت کے خوف میں اضافہ کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ حکمران اسے بالواسطہ یہ تنبیہ کرتا ہے کہ اگر تو نے اس آئین کو قبول نہ کیا' نہ اپنایا تو تجھے دشمنوں اور مخالفوں کے ظلم وستم کا سامنا کرنا پڑے گا۔ غلام اس خوف سے اس آئین حیات کو بصد خوشی اپنا لیتا ہے۔

۳۳-۳۴: اس خاطر کہ غلام اپنے آپ سے ناامید ہو جائے' حکمران مکر وفریب کا یہ انداز اختیار کرتا ہے' چنانچہ غلام کے سینے سے آزادی کی آرزو ہی غائب ہو جاتی ہے۔ گویا وہ اس ڈر سے کہ اگر حکمران کی پناہ میں نہیں رہتا تو اس کی تباہی ہوگی' اس لیے حکمران کی پناہ کو آزادی پر ترجیح دیتا ہے۔ حکمران (اسی مکر وفریب سے کام لیتے ہوئے) کبھی تو غلام کو خوبصورت خلعت عطا کرتا ہے اور حکومت کے نظم ونسق کی باگ ڈور بھی اس کے ہاتھوں میں دے دیتا ہے اور یوں اسے خوش کر کے غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رکھتا ہے۔

۳۵- حکمران اس وقت گویا شطرنج کا ایک کھلاڑی ہوتا ہے۔ اس نے اپنی ہتھیلی سے گوٹ کو اس انداز میں چلایا/ پھینکا کہ اپنے مکر وفریب اور چالوں سے کئی ایک کی عظمت خاک میں ملادی۔

۳۶- حاکم وقت نے غلام کو آج کی نعمتوں کا شیدائی بنادیا اور کچھ ایسا شیدائی بنادیا کہ اسے معنی یا حقیقت کے لحاظ سے مستقبل کا منکر بنادیا یعنی حاکم کچھ اس انداز میں اسے (غلام کو) نعمتیں عطا کرتا ہے کہ وہ ان سے لطف اندوز ہو کر اپنے مستقبل کے بارے میں سوچتا ہی نہیں اور یوں غلامی کی زندگی کو اپنے لیے ایک نعمت سمجھتا ہے۔

۳۷- بادشاہوں/ حکمرانوں کی محبت سے غلام کا جسم موٹا ہو جاتا ہے جبکہ اس کی پاک جان کمزوری کے باعث چرخے کے تکلے کی طرح (بہت باریک/ کمزور) ہو جاتی ہے۔ غلام حکمرانوں کی دکھاوے کی محبت سے پھولے نہیں سماتا' اس میں اکڑفوں پیدا ہو

جاتی ہے جبکہ اس کی روح مردہ ہو جاتی ہے۔

۳۸۔ اگر ایک پاک جان/روح (غلامی کے باعث) زار و زبوں ہو جائے تو اس سے یہ بہتر ہے کہ جسموں کی پوری آبادی/بستی تباہ ہو جائے۔ گویا ایسی تباہی سے ایک جان کا ہلاک نہ ہونا بہتر ہے۔

۳۹۔ حکمرانِ وقت کی زنجیریں غلام کے پاؤں میں نہیں بلکہ اس کی جان اور دل پر ہوتی ہیں جس کے نتیجے میں غلاموں کی زندگی سراسر مشکلوں میں گھری رہتی ہے۔ گویا حاکم اپنے مکر و فریب سے ان کے دلوں کو خوش رکھتا ہے لیکن درحقیقت وہ (غلام) حقیقی زندگی سے محروم ہو جاتے اور اپنے لیے مصیبتیں کھڑی کر لیتے ہیں۔

در فنِ تعمیر مردانِ آزاد

(آزاد مردوں/انسانوں کے فنِ تعمیر کے بارے میں)

۱۔	یک زماں با رفتگاں صحبت گزیں	صنعتِ آزاد مرداں ہم بہ بیں
۲۔	خیز و کارِ ایبک و سوری نگر	وانما چشمے اگر داری جگر
۳۔	خویش را از خود بروں آوردہ اند	ایں چنیں خود را تماشا کردہ اند
۴۔	سنگ ہا با سنگہا پیوستہ اند	روزگارے را بہ آنے بستہ اند
۵۔	دیدنِ او پختہ تر سازد ترا	در جہانِ دیگر اندازد ترا
۶۔	نقش سوئے نقش گرمی آورد	از ضمیرِ او خبر می آورد
۷۔	ہمتِ مردانہ و طبعِ بلند	در دلِ سنگ ایں دو لعلِ ارجمند
۸۔	سجدہ گاہِ کیست ایں از من مپرس	بے خبر! رودادِ جاں از تن مپرس
۹۔	وائے من از خویشتن اندر حجاب	از فراتِ زندگی نا خوردہ آب
۱۰۔	وائے من از بیخ و بن برکندہ ے	از مقامِ خویش دور افگندہ ے
۱۱۔	محکمی ہا از یقینِ محکم است	وائے من شاخِ یقینم بے نم است
۱۲۔	در من آں نیروے "اِلا اللہ" نیست	سجدہ ام شایانِ ایں درگاہ نیست

۱۔ تو (اے مخاطب) کچھ دیر اپنے اسلاف کی صحبت اختیار کر (ان کی زندگی اور ان کے کارناموں کو دیکھ) آزاد مردوں کی صنعت کو بھی دیکھ، ان کے کارناموں پر غور کر۔

۲- اٹھ اور ایبک اور سوری کا کارنامہ دیکھ۔ اگر تجھ میں حوصلہ ہے تو آنکھیں کھول یعنی ان کارناموں کو دیکھ (فرہنگ دیکھیے)

۳- ان عظیم لوگوں (بادشاہوں) نے عظیم عمارتیں تعمیر کر کے اپنے آپ کو نمایاں/ اجاگر کیا ہے اور یوں انہوں نے اپنا تماشا/ نظارہ کیا ہے۔ اس قسم کی عمارتوں سے ان کی صلاحیتیں ان پر ظاہر ہوئی ہیں۔

۴- انہوں نے (ایبک و سوری نے) پتھروں کو پتھروں سے جوڑ دیا/ ملا دیا ہے۔ انہوں نے زمانے کو ایک آن میں بند کر دیا یا باندھ دیا ہے یعنی ان کی تعمیر کردہ عمارتیں ایسی عظیم و پائیدار و محکم ہیں کہ ان پر زمانے کے گذرنے کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس کا باعث یہ ہے کہ یہ حضرات خود عظیم اور پائیدار شخصیتوں کے مالک تھے۔

۵- ان عمارتوں کو دیکھنا تجھے زیادہ محکم و پائیدار بنائے گا اور تجھے کسی دوسرے جہان ہی میں لا ڈالے گا۔ انہیں دیکھنے سے تجھ میں ان تعمیر کرنے والوں کی مضبوطی و محکمی کا خیال آئے گا اور یوں تو بھی خود کو محکم و مضبوط کرنے کا سوچے گا۔

۶- نقش (دیکھنے والے کو) نقش گر کی طرف لے آتا/ جاتا ہے اور اس (نقش گر) کے ضمیر سے باخبر کرتا ہے یعنی نقش کی عظمت و محکمی ہی سے پتا چل جاتا ہے کہ اس کے بنانے والے کا ضمیر کس قدر روشن اور جذبوں سے سرشار ہے۔

۷- مردانہ ہمت اور بلند فطرت/ سرشت یہ دو ایسے قیمتی ہیرے ہیں جو پتھر کے دل میں ہیں۔ مذکورہ عمارتوں میں جو پتھر لگائے گئے ہیں ان سے تعمیر کرانے والوں کی شخصیتوں کے جوہر، دیکھنے والوں پر ظاہر ہو جاتے ہیں۔

۸- یہ (روح) کس کی سجدہ گاہ ہے، یہ تو مجھ سے مت پوچھ، اے بے خبر جان/ روح کی کہانی جسم سے نہ پوچھ۔ انسانی روح کو فرشتوں نے سجدہ کیا تھا اور اسی روح کی بنا پر جو انسانی بدن میں ہے، انسان فرشتوں کا مسجود (جسے سجدہ کیا جائے، مسجودِ ملائک) ہے۔ اس سے روح کی عظمت واضح ہے۔

۹- افسوس ہے مجھ پر کہ میں خود ہی اپنے آپ سے پردے میں ہوں، اور ایسا انسان جس نے زندگی کے دریا سے پانی نہیں پیا۔ گویا میں اپنی پوشیدہ صلاحیتوں اور قوتوں سے بے خبر ہوں اور اپنی خودی و معرفت سے بے خبر ہونے کے باعث میں حقیقی زندگی سے بھی نا آشنا ہوں۔

۱۰۔ افسوس ہے مجھ پر کہ میں نے خود کو جڑ اور بنیاد سے اکھاڑ پھینکا ہے اور خود کو اپنے مقام سے دور گرا رکھا ہے یعنی میں اپنی (انسانی) اصلیت وحقیقت سے بالکل بے خبر ہوں۔

۱۱۔ مضبوطیاں تو پختہ یقین ہی سے وجود پذیر ہوتی ہیں۔ مجھے اپنے آپ پر افسوس ہے کہ میری شاخِ یقین نمی سے محروم ہے۔ دوسرے لفظوں میں میں بے یقینی کا شکار ہوں۔

۱۲۔ مجھ میں ''الا اللہ'' کی وہ قوت وطاقت ہی نہیں ہے۔ میرا سجدہ اس درگاہ کے لائق نہیں ہے۔ جس انسان کا اس بات پر پختہ ایمان ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ دنیا کی باطل قوتوں سے خوفزدہ ہونے کی بجائے ان سے ٹکرا کر انہیں پاش پاش کر دیتا اور اپنی بقا کا سامان کر لیتا ہے لیکن اگر ایمان پختہ نہ ہو تو اللہ کے حضور کیے جانے والے سجدے محض نمائشی ہوتے اور اس ذات کی شان کے لائق نہیں ہوتے ہیں۔ علامہ نے یہ بات اپنے حوالے سے کی ہے۔

شمیم نے یہ بات یوں کی ہے:

پہلے دل کو برائی سے کر پاک تو پھر خلوصِ عقیدت سے کر جستجو
ایسے سجدوں سے اللہ ملتا نہیں ہر جگہ سر جھکانے سے کیا فائدہ

۱۳۔ یک نظر آں گوہرِ نابے نگر ‌‌‌ تاج را در زیرِ مہتابے نگر
۱۴۔ مرمرش ز آبِ رواں گردندہ تر ‌ یک دم آنجا از ابد پایندہ تر
۱۵۔ عشقِ مرداں سرِ خود را گفتہ است ‌ سنگ را با نوکِ مژگاں سفتہ است
۱۶۔ عشقِ مرداں پاک و رنگیں چوں بہشت ‌ می کشاید نغمہ ہا از سنگ وخشت
۱۷۔ عشقِ مرداں نقدِ خوباں را عیار ‌ حسن را ہم پردہ در، ہم پردہ دار
۱۸۔ ہمت او آں سوئے گردوں گذشت ‌ از جہانِ چند و چوں بیروں گذشت
۱۹۔ زانکہ در گفتن نیاید آنچہ دید ‌ از ضمیرِ خود نقابے برکشید

۱۳۔ تو ذرا ایک نظر اس خالص/قیمتی موتی پر ڈال۔ تاج یعنی تاج محل کو چاندنی کے نیچے دیکھ (فرہنگ دیکھیے)

۱۴۔ اس (تاج محل) کا سنگ مرمر شفاف پانی سے بھی زیادہ شفاف ہے یعنی جن سفید پتھروں سے اس کی تعمیر ہوئی ہے ان میں بڑی چمک دمک ہے۔ وہاں (تاج محل) کا ایک پل/لحہ ابد سے بھی زیادہ پایندہ ہے یعنی وہ عمارت کچھ اس پختگی اور عمدگی سے تعمیر کی گئی ہے کہ وقت گذرنے کا اس پر کوئی اثر نہیں، آج بھی وہ اسی طرح ہے۔

علامہ نے پہلے شعر میں جو ''اس پر نظر ڈال'' کہا ہے تو غالباً اسی سے یہ کہنا چاہا ہے کہ شاید اس طرح تجھ میں بھی اپنے ایک لمحے کو ابد میں تبدیل کرنے کا خیال پیدا ہو اور یوں جذبہ عشق سے سرشار اور اپنی خودی سے آگاہ ہو کر تو اپنی بقا کا سامان کر لے۔

۱۵- مردوں کے عشق نے اپنا راز (مذکورہ قسم کی عظیم عمارتوں کی تعمیر کی صورت میں) ظاہر کیا ہے اور پتھروں کو اپنی پلکوں کی نوک سے پرو دیا ہے۔ گویا عشق کی قوت سے باخبر ہونے کے نتیجے میں انہوں نے فن تعمیر کے اس قسم کے (تاج محل، مسجد قوۃ الاسلام) پائندہ اور بقا والے شاہکار پیدا کر لیے۔

۱۶- مردوں کا عشق بہشت کی طرح پاک اور رنگین ہوتا ہے، وہ (عشق) پتھروں اور اینٹوں سے نغمے پیدا کر لیتا ہے۔ اس قسم کی عظیم عمارتیں دراصل بنانے والوں کی جذبہ عشق سے سرشاری کا پتا دیتی ہیں۔ اس سلسلے میں مذکورہ عمارتوں کے علاوہ الحمراء اور مسجد قرطبہ کے نام بھی لیے جا سکتے ہیں جن کے مقابلے کی کوئی اور مسجد و عمارت نہیں ہے۔

۱۷- مردوں کا عشق حسینوں کی نقدی کی کسوٹی ہے۔ یہ عشق حسن کا پردہ در بھی ہے اور پردہ دار بھی۔ گویا اصل حسین وہ ہے جسے مردانِ حق حسین کہیں یا اس سے اظہارِ عشق کریں۔ یہ عشق جہاں حسن کا محافظ ہے وہاں اس (حسن) کی صلاحیتیں بھی نمایاں کرتا ہے۔

۱۸- اس عشق کی ہمت آسمانوں کے پار گذر گئی۔ وہ اسباب کی دنیا سے باہر نکل گئی یعنی مردوں یا مردانِ حق کے عشق کے جذبے کچھ اتنے قوی ہوتے ہیں کہ وہ ان جذبوں کی بدولت زمان و مکاں کو عبور کر کے ایسے عظیم اور حیرت انگیز کارنامے انجام دیتے ہیں جو رہتی دنیا تک قائم رہتے ہیں۔

۱۹- جو کچھ عشق نے دیکھا ہے وہ چونکہ بیان میں نہیں آ / سما سکتا، اس لیے اس (عشق) نے اپنے ضمیر سے نقاب اٹھا دی۔ مطلب یہ کہ اس نے ایسا کارنامہ انجام دیا جس سے دوسروں کو اس کی قوت و صلاحیت کا پتا چل گیا۔ چنانچہ فن کے مذکورہ اور دوسرے لافانی شاہکار اسی قسم کے عشق کی نشاندہی کرتے ہیں۔

۲۰- از محبت جذبہ ہا گردد بلند ارج می گیرد ازو نا ارجمند
۲۱- بے محبت زندگی ماتم ہمہ کاروبارش زشت و نامحکم ہمہ
۲۲- عشق صیقل می زند فرہنگ را جوہرِ آئینہ بخشد سنگ را

۲۳- اہل دل را سینۂ سینا دہد باہنر منداں ید بیضا دہد
۲۴- پیش او ہر ممکن و موجود مات جملہ عالم تلخ و او شاخ نبات
۲۵- گرمی افکارِ ما از نارِ اوست آفریدن جاں دمیدن کارِ اوست
۲۶- عشق مور و مرغ و آدم را بس است عشق تنہا ہر دو عالم را بس است
۲۷- دلبری بے قاہری جادوگری است دلبری با قاہری پیغمبری است
۲۸- ہر دو را در کارہا آمیخت عشق عالمے در عالمے انگیخت عشق

۲۰- محبت سے جذبے بلند ہو جاتے ہیں اور اسی محبت کے طفیل ایک بے قدر و قیمت شے بھی قدر و منزلت والی بن جاتی ہے۔ اگر اسے انسان سے متعلق سمجھیں تو ظاہر ہے ایک معمولی انسان بھی اس (محبت) سے عظمت حاصل کر لیتا ہے۔

۲۱- اگر محبت سے کوئی خالی ہے تو اس کی زندگی سراسر ماتم ہے۔ اس کا کاروبار سراسر برا اور غیر مضبوط ہے یعنی زندگی میں حسن و دل کشی کی بجائے بدنمائی اور ناپائیداری رہتی ہے۔

۲۲- عشق انسان کی عقل و دانش کو سان پر لگاتا ہے اور یوں گویا پتھر کو آئینے کا جوہر/ خوبی بخشتا ہے یعنی عقل و ارادہ میں چمک دمک پیدا کر کے ان سے کام لینے میں مدد دیتا ہے۔ اس سے عقل کو جلا ملتی ہے۔ یہ بات پتھر کے استعارے میں بیان کی ہے۔ پتھر کو آئینے کا جوہر دینے سے مراد ہے کہ اس میں عکس پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

۲۳- عشق اہل دل کو وادی سینا کا سینہ عطا کرتا ہے اور اہل ہنر کو ید بیضا عطا کرتا ہے۔ گویا ایسا سینہ جس میں خدا کی تجلیات کا ظہور ہوتا ہے اور عشق ہی کی بدولت ہنر مند ایسے کارنامے انجام دیتے ہیں جن میں معجزوں کی سی کیفیت ہوتی ہے (حضرت موسیٰؑ سے متعلق قرآنی تلمیح کے حوالے سے یہ کہا ہے)

۲۴- عشق کے سامنے ہر ممکن اور موجود (کائنات کی ہر شے) مات/ سرنگوں ہے۔ اگر سارا جہان کڑوا ہے تو عشق گویا مصری کی ڈلی ہے۔ مطلب یہ کہ دنیا میں اگر کوئی دل کشی اور دل ربائی ہے تو یہ سب عشق کے باعث ہے ورنہ بصورتِ دیگر ساری کائنات ایک بے قدر و منزلت اور بے مزہ یا کڑوی شے ہوتی۔

۲۵- ہمارے افکار میں حرارت و گرمی عشق ہی کی آگ کے باعث ہے۔ پیدا کرنا اور روح پھونکنا عشق کا کام ہے۔ گویا عشق جان پیدا کر کے اس (جان) میں تخلیقی قوت پیدا کرتا ہے۔

۲۶۔ عشق، چیونٹی، پرندہ اور انسان یعنی سب مخلوق کے لیے کافی ہے۔ عشق اکیلا ہی دونوں جہانوں کے لیے کافی ہے۔ گویا ہر مخلوق کے وجود کے لیے ضروری ہے اور دونوں جہانوں کے مقاصد عشق ہی کے طفیل عمل پذیر اور پورے ہوتے ہیں یا یہ کہ اگر دونوں جہانوں سے مستفید و مستفیض ہونے کی خواہش ہو تو اس کے لیے عشق بنیادی ضرورت ہے۔

۲۷۔ قاہری کے بغیر جو دلبری ہے وہ محض جادوگری ہے۔ دلبری قاہری کے ساتھ ہو تو وہ پیغمبری ہے۔ مطلب یہ کہ حسن میں اگر اپنے تحفظ کی قوت نہ ہو تو وہ دل کشی، دل فریبی اور نظر فریبی کے لحاظ سے بے شک لاجواب ہو لیکن حقیقی معنوں میں اسے حسن نہیں کہا جائے گا۔ حقیقی حسن وہ ہے جس میں جلال (قاہری) اور جمال (مراد دلبری) دونوں ہوں اور جب دونوں صفات اس میں ہوں گی تو وہ پیغمبری شان کا حامل ہوگا (دوسرے لفظوں میں پیغام بر کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی پیغام کو آگے پہنچا کر اس کو عمل میں لانے کی قوت رکھتا ہو)

۲۸۔ عشق نے ان دونوں یعنی قاہری اور دلبری کو کاموں میں باہم ملا رکھا ہے۔ عشق نے ایک عالم کے اندر ایک اور عالم برپا کر رکھا ہے۔ گویا دونوں میں سے کوئی ایک بھی تنہا مثبت نتیجے پیدا کرنے کے قابل نہیں ہے۔ اسی لیے عشق نے انہیں کاموں میں باہم مصروف رکھا ہے۔ ''ایک عالم کے اندر ایک اور عالم'' سے مراد جمال میں جلال کی اور جلال میں جمال کی کیفیتیں پیدا کر رکھی ہیں کہ اسی سے دنیا کا صحیح وجود برقرار رہ سکتا ہے اور ان دونوں کی بدولت ہی نت نئے جہانوں کی تعمیر ہو سکتی ہے، خواہ ان (جہانوں) کا تعلق علوم و فنون کی دنیا ہی سے کیوں نہ ہو۔

تمت بالخیر

فرہنگ زبورِ عجم

بخوانندۂ کتاب زبور

بخوانندہ: پڑھنے والا زبور: یعنی زبورِ عجم' زبان عجم/ فارسی کی الہامی کتاب (ویسے زبور وہ الہامی کتاب ہے جو حضرت داوٗدؑ کے گیتوں کا مجموعہ ہے) زبور بمعنی کتاب

۱-۳: می شود: ہو جاتا ہے' بن جاتا ہے پرِ کاہے: گھاس کا ایک تنکا گاہے: کبھی بسے: بہت جادۂ صد سالہ: ایسا راستہ جسے طے کرنے میں سو سال (یعنی بہت عرصہ) لگیں بآہے: ایک آہ سے در طلب: طلب میں' یعنی حق تک رسائی کی طلب کوش: کوشش کر' جدوجہد کر مدہ: مت دے دولتے ہست: یہ ایسی دولت ہے یابی: تو پائے' تو پالے گا

زبور عجم

حصہ اول

۱: برون: بیرون' باہر درگذشتم: میں گذرا/ گذر گیا سخنے نگفتہ ے را: ایک ایسی بات کو جو کہی نہیں گئی چہ: کس قدر' کس طرح

دعا

۱-۷: دلِ باخبر: حقیقت سے پوری طرح آگاہ دل بدہ: دے' عطا کر نگرم: میں دیکھوں' دیکھ لوں نزیست: نہیں جیا' زندگی بسر نہیں کی بانفس دیگراں: دوسروں کے سانس کے ساتھ یعنی دوسروں کے سہارے آہِ خانہ

زاد: مراد دل کی گہرائی سے نکلی ہوئی آہ، عشق صادق سلیم: میں سیلاب/
طوفان ہوں بجوئے تنگ مایہ: مراد تھوڑے یا کم پانی والی محدود ندی پیچ:
نہ الجھا جولانگہے: دوڑنے یا پھیل جانے کی جگہ حریف: مدِ مقابل
یم بیکراں: بے کنار یعنی بے حد وسیع سمندر بصید پلنگاں: چیتوں کے شکار
کے لیے گذاشتی: تو نے چھوڑا (ہے) چنگل: پنجہ رفتم: میں گیا،
میں نے چاہا نافگندہ: جو چلایا نہ گیا ہو فتد کارگر: کارگر ثابت ہو
نغمہ داؤد: حضرت داؤد کا نغمہ، زبور کے حوالے سے کہا ہے برفروز: روشن کر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے)

غزل (۱)

۱-: جادہ: راستہ، پگڈنڈی برد: لے گیا، لے گئی چہ می نازد: کیا فخر کرتا ہے

غزل-۲

۱-۳: زکجاست: کہاں سے ہے سبو: صراحی، مراد سینہ گرفتم: میں نے پکڑا،
یعنی میں نے مانا، میں نے تسلیم کیا کف خاکیم: ہم مٹی کی مٹھی ہیں دردِ
جستجو: تلاش کا درد، تلاش کا سوز و جذبہ کہکشاں: وہ سفیدی جو آسمان پر
جنوب اور شمال میں نظر آتی ہے، دراصل یہ بہت سے چھوٹے چھوٹے تارے ہیں
جو دوری کی وجہ سے کم ہی نظر آتے ہیں، تاہم سب کی روشنی مل کر ایک راستہ سا بن
جاتی ہے۔

غزل-۳

۱-۵: غزل سرائے: غزل کہہ، یا غزل سرائی کا انداز باز آور: پھر سے لا
نواہائے رفتہ: گذرے ہوئے نغمے یا وہ سرتال کا اسلوب جو کبھی تھا کنشت:
آتش پرستوں کی عبادت گاہ چشم نیم باز: ادھ کھلی آنکھ/آنکھیں، مستی کی

حالت میں پوری طرح نہ کھلی ہوئی آنکھیں آمیخت: ملائی، آمیزش/ ملاوٹ کی بجوانانِ نو نیاز: نئی نئی نیازمندی کے حامل نوجوانوں کو می رقصد: رقص کرتا ہے، ناچتا ہے نیستانِ عجم: سرزمین مشرق کے سرکنڈوں کا جنگل فرومی چکد: ٹپکتا ہے، ٹپک پڑتا ہے

غزل-۴

ا-۵: فزودہ ای: افزودہ ای، تونے بڑھایا ہے چہا کنی: تو کیا کچھ کرتا ہے غنچۂ دل گرفتہ: غمزدہ غنچہ گرہ کشائے: تو گرہ کھول دے، رنج اور دکھ سے نجات دے مشتری: برجیس سیارہ جو نظام شمسی سے تعلق رکھنے والے ستاروں میں سب سے بڑا ہے، روشنی میں زہرہ کے بعد دوسرے درجے پر ہے۔ جسامت میں زمین سے تقریباً بارہ سوتیس گنا ہے، بارہ سال میں سورج کے گرد ایک دورہ مکمل کرتا ہے، چھٹے آسمان پر ہے، قاضی فلک بھی کہلاتا ہے بکمیں: گھات میں چہ خفتہ ای: تو کیا سویا ہوا ہے صید کن: شکار کر غزالہ: ہرنی خواجۂ من: میرے آقا/مولا

غزل-۵

ا-۶: برانگیزی: تو ابھارتا/ بلند کرتا ہے خوے کم آمیزی: کم ملنے یا نہ ملنے کی عادت دزدیدہ: چوری چھپے در آویزی: لٹک جاتا یعنی مل جل جاتا ہے سودائے جہانگیری: جہان کو فتح کرنے یا قابو کرنے کا عمل نشتر چنگیزی: چنگیز کا نشتر، چنگیز جس نے ۶۰۶ ہجری میں ایران پر حملہ کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی گریزم باز: پھر بھاگ جاؤں طرۂ پیچاں: بل کھائی ہوئی زلفیں جو عاشق کے لیے دل کشی کا باعث بنتی ہیں ریزی: تو گرتا ہے

غزل-۶

ا-۵: تیرہ خاکم: میں سیاہ مٹی ہوں، مٹی کے جسم والا ہوں دلکے: ایک چھوٹا سا دل دیدہ بازم: میں کھلی آنکھوں والا ہوں بہ ہوائے: کی خواہش میں زنوا

فتادہ سازم: میں ایسا ساز ہوں جس میں آواز نہیں یا نہیں رہی خاکیاں: خاکی کی جمع، مٹی کے بنے ہوئے یعنی انسان نوریاں: نوری کی جمع، فرشتے نرسی: تو نہیں پہنچتا، تو نہیں پہنچ سکتا عیاں نکردم: میں نے ظاہر نہیں کیا آنچناں: اس طرح، کچھ اس طرح سرودم: میں نے گائی یعنی لکھی

غزل۔۷

۱-۵: نوائے دلپذیرے: ایک دل لبھانے والی/ دلکش نوا (شاعری) سے خم: صراحی کشادم: میں نے کھولی بجہانِ تشنہ میرے: ایسی دنیا کو جو پیاس سے مری ہو یا مر رہی ہو نہ دمیدہ: نہیں پھوٹی، پیدا نہیں ہوئی سرمہ سائے: سرمہ لگی راغ: سبزہ زار نالم: میں فریاد کر رہا ہوں تدروِ نوصفیرے: وہ چکور جس نے تازہ تازہ/ ابھی ابھی بولنا سیکھا ہو نہ گنجند: نہ سمائیں بہ ولایتے: ایک ملک میں

غزل۔۸

۱-۷: فشاں: افشاں، چھڑک برکشا: کھول دے، ہٹالے زمزمہ کہن: پرانا نغمہ سرائے: گا بری: تو اٹھا رہا ہے ریگ عراق: عراق کی ریت، واقعہ کربلا کی طرف اشارہ ہے خونِ حسینؓ: امام حسینؓ کا خون، کربلا میں ان کی شہادت کوفہ و شام: دو اسلامی ملک دوش براہبر زند: راہبر کے ساتھ ساتھ چلتا ہے یگانہ: تنہا زمام: لگام طائر پیش رس: پہلے پہنچنے والا

غزل۔۹

۱-۸: ازاں: از آں، اس لیے بخاشاکم: میرے خشک تنکوں میں، مراد میری شخصیت میں خراشد: چھیلتا ہے خون پرویز: پرویز کا خون، خسرو پرویز کی طرف اشارہ ہے جس نے شیریں کے عاشق (فرہاد) کو پہاڑ کھود کر نہر نکالنے کے لیے کہا تھا یا شیریں اسے دینے کے لیے یہ شرط رکھی تھی جو فرہاد نے پوری کر دی اور

پرویز کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر اس کام میں لگا رہا **خلید**: چبھا **مردِ ادا دانے**: ایک ادا شناس انسان، عشق کے رموز و اسرار سے آگاہ **کاری تر**: زیادہ موثر، زیادہ کارگر **ببالینم**: میرے سرہانے **تہی پیمانہ**: خالی جام والا **بستاں**: بوستان، باغ **جلوہ دادم**: مراد روشن کی **غلط ریز**: غلط پڑنے والی، بے اثر پانی والی **خانماں**: گھربار، مراد زندگی اور اس کے متعلقات **برہم زند**: تلپٹ کر دیتے یا برباد کر دیتے ہیں **می باید**: چاہیے **روم**: مراد مولانا جلال الدین رومی **تبریز**: مراد شمس تبریزی جو مولانا کے مرشد تھے **برہمن زادہ**: برہمن کی نسل سے، علامہ کے اسلاف/ بزرگ برہمن تھے جن کا تعلق کشمیر سے تھا

غزل-۱۰

۱-۸: **تراشم**: میں تراشوں/تراش لوں، بنا لوں **برنتابی**: تو برداشت نہیں کرتا **ننالم**: میں فریاد نہ کروں، نہ روؤں **خرامی**: تو ٹہلے، چلے **بسرائے کاروانے**: ایک یا کسی کارواں سرائے (کارواں سرائے: قافلہ ٹھہرنے کی جگہ) **غزلے زدم**: میں نے ایک غزل چھیڑی/کہی **گسستن**: ٹوٹنا، کم ہونا یا نکل جانا **درنسازد**: موافقت نہیں کرتا **چساں**: چہ ساں، کس طرح **نہادی**: تو نے رکھا **یمے بلند موجے**: ایک بلند لہروں یا اونچی لہروں والا سمندر **خدایگاں**: جمع خدائے/ خدا، مراد بڑے بڑے بادشاہ یا حکمران **صفت**: مانند

غزل-۱۱

۱-۷: **بادیہ**: بیابان **قدر اندازے**: ایک تیر پھینکنے والا **برسر پروازے**: پرواز کے لیے تیار **کارفروبستہ**: بند یعنی رکا ہوا کام **زمزمہ پردازے**: ایک یا کوئی نغمہ یعنی نغمہ عشق گانے/ الاپنے والا **تاب**: قوت **بصد گونہ**: سینکڑوں انداز سے **مردہ خاکیم**: ہم مردہ خاک ہیں، بے جان مٹی کے بنے ہوئے ہیں **خانہ فروز**: گھر کو روشن کرنے والا، مراد جسم خاکی کا تاریک گھر،

جسم خانہ برانداز ے: گھر برباد کرنے والا فلاطوں: افلاطون، مشہور یونانی فلسفی جو سقراط کا شاگرد اور ارسطو کا استاد تھا، مسلمانوں کا مسلک تصوف اور ادب اس کے فلسفے سے بہت متاثر ہوا ہے، پیدائش ۴۲۸ قبل مسیح، وفات ۳۴۷ قبل مسیح در کنارم: میرے پہلو میں

غزل-۱۲

۱-۷: چیست: کیا ہے پندار: تصور، خیال گردش پرکارِ من: میری پرکار کی گردش (پرکار: وہ دو شاخہ آہنی قلم جس سے دائرہ کھینچتے ہیں) غماز: دل کی پوشیدہ حالت بتانے والا، چغلی کھانے والا کشایندہ: کھولنے/ ظاہر کرنے والا کاشتہ: بویا ہوا می دروند: کاٹتے ہیں گرو: مرہونِ منت حضور: آنکھوں کے سامنے

غزل-۱۳

۱-۷: ایں چنیں: ایسی، اس طرح کی بانگِ ہزار: بلبل کی آواز/ چہچاہٹ بیار: لا اشک چکیدہ ام: میرے ٹپکے ہوئے آنسو ریز: گرا، ڈال زیستم: میں جیا، میں نے زندگی بسر کی محک: کسوٹی بسائے: لگا تار: تاریک گیر عیار: معیار قائم کر روزِ شمار: اعمال کے حساب کتاب کا دن، روز قیامت نباختہ: نہیں ہارا یعنی نہیں لگایا نساختہ: موافقت نہیں کی فاختہ کہن صفیر: پرانی آواز/ چہچہاہٹ والی فاختہ، یعنی وہ مردِ مومن جو اسلام کی سابقہ روایات کا علمبردار ہے نغمہ پار: ماضی کا نغمہ، یعنی اپنے اسلاف/ بزرگوں کے حقائق و معارف

غزل-۱۴

۱-۵: پیچاک: چکر، الجھنیں عقدہ ہا: گتھیاں تپید: تڑپا کشت نابسامانے: بے سروسامان کھیتی فروکرد: ڈالے، بوئے درود: کاٹا، فصل کاٹی سود: گھسایا، پرکھا انداخت: ڈالا آزمود: آزمایا

ربود: اچک لیا

غزل-۱۵

۱-۵: فشاں: ڈال، بکھیر فرونشاں: بجھا دے خود فرامشاں: خود فراموشاں، خود فراموش کی جمع یعنی اپنی خودی کو بھول جانے والے مدرسہ بلنگ بانگ: بلند آواز والا مکتب، یعنی بلند دعوے کرنے والا جدید دور کا مکتب جو علوم وفنون اور عقل وخرد سے آگاہ کرنے کے بڑے دعوے کرتا ہے بزم فسردہ آتشاں: بجھی ہوئی آگ والوں کی محفل (عشق کی بجھی ہوئی آگ) ہدفے: ایک نشان کشاں کشاں: کھینچتے ہوئے، تیزی سے زپا درآورد: گرا دیتا ہے خیمہ شش جہات: چھ طرفوں والا خیمہ، زمان ومکان والی دنیا (چھ طرفیں: مشرق، مغرب، شمال، جنوب، اوپر، نیچے) طناب: رسی

غزل-۱۶

۱-۷: بخدائے خانہ: بیت اللہ سے، آستانہ کعبہ شرر پریدہ رنگم: میں اڑے ہوئے رنگ والی (بے رنگ) چنگاری ہوں مگذر: مت گذر، نہ جا یک دو آنے: دو ایک لمحے/پل سرِ کرانہ: کنارے/ساحل کی آرزو/تمنا وانسوزد: جو جلا نہ دے، بھسم نہ کر دے نو نیازم: میں نیا نیا نیازمند بنا ہوں، میں نوآموز ہوں رمِ آہوانہ دارم: ہرنوں کی طرح چوکڑیاں بھرتا ہوں بمعاشراں: معاشرے کے لوگوں کو مے شبانہ: رات کی شراب، رات کی بچی ہوئی شراب دل فروز: دل کو روشن کرنے والے

غزل-۱۷

۱-۷: سوارہ: مراد گھوڑے پر سوار محبوب مرا بگیر: مجھے پکڑ، مجھے تھام/سنبھال چہ سخن گسترم: میں کیا بات کروں خارہ: سخت پتھر چو رسیدی: جب تو پہنچا/پہنچے مکشا: مت کھول ہجوم سرشک: آنسوؤں کی کثرت

غزل-۱۸

ا-۷: عقل فلک پیما: آسمان کو ناپنے والی یعنی آسمان تک رسائی والی عقل ترکانہ شبیخوں: ترکوں یعنی بہادروں جیسا شب خون (رات کو کیا جانے والا اچانک حملہ) مغ بچہ اے: شراب خانے میں شراب پلانے والے کم سن لڑکے نے فروخوردی: تو پی جائے 'نہ بہائے دارا: ایران کا قدیم بادشاہ فریدوں: ایران کا قدیم بادشاہ فر: شان وشوکت جیحوں: وسط ایشیا کے علاقہ ترکستان کا ایک دریا خلوت ہاموں: صحرا کی تنہائی نتواں گفتن: نہیں کہا جا سکتا مغاں/مغ: شراب کشید کرنے والا

غزل-۱۹

ا-۶: مدہ: مت دے برکف بنہ: ہتھیلی پر رکھ فرسودہ پیکر: کمزور جسم چناں کن: ویسا کر چنیں کن: ایسا کر سینۂ زناریاں: زناریوں کا سینہ' برہمنوں/ ہندوؤں کا سینہ خلوت گزیں: خلوت اختیار کر کمترک: کسی قدر کم روح الامین: حضرت جبرئیلؑ بکش: مار ڈال' ختم کر دے نہاد: بنیاد

غزل-۲۰

ا-۴: جراتِ رندانہ: یعنی بیبا کی اور سرفروشی از پا نشستن: تھک کر بیٹھ جانا جولانگاہ: دوڑے کی جگہ' مراد سعی وعمل کا میدان جنوں فرمائے من: مجھے جنون عطا فرمانے والا پاس: لحاظ' خیال از خود رفتن: اپنے ہوش وحواس نہ کھونا

غزل-۲۱

ا-۵: مار: سانپ می گزد: کاٹتا / ڈستا ہے (گ اور ز پر زبر ہے) برعاشقاں: عاشقوں کا پہلو باوفتد: اس پر گرے بہوائے جلوہ ے:

کسی/ ایک جلوہ کی خواہش و آرزو پارہ کنم: میں ٹکڑے کر رہا یا پھاڑ رہا ہوں رستہ ام: میں اگا ہوں خاطر: دل واشود: کھل جائے گا

غزل-۲۲

۱-۷: کو: کہاں ہے فرو ریزم: میں ڈالوں کو: کہ او کا مخفف' کہ وہ از جامِ زرینے: کسی سنہری جام سے' سونے کے پیالے سے سفال: مٹی کا پیالہ بہ تریاقی: زہر کا اثر دور کرنے کے لیے خیزد: اٹھتا ہے ریزم: میں گراؤں کرا: کسے' کس کو سوزم: میں جلاؤں فگندی: تو نے ڈالا مکدر کرد: گدلا کر دیا تیرہ تر: زیادہ تاریک مشائی: قدیم یونانی فلسفی ارسطو کے فکری پیروکار' ارسطو چونکہ چل پھر کر سبق دیا کرتا تھا' اس لیے اس کے گروہ/ پیروکاروں کو مشائین (چلنے پھرنیوالے) کہا جاتا ہے اشراقی: افلاطون کے فکری پیروکار' اس مسلک کا ماحصل یہ ہے کہ خدا ہی واحد و لاشریک ہے' وہی وجود حقیقی ہے' اس کے علاوہ اور کسی کا وجود نہیں ہے' ہم عقل سے نہیں بلکہ مراقبہ اور وجدان سے اس کی معرفت حاصل کر سکتے ہیں' افلاطون کے فلسفے میں تصوف کا رنگ ملا دیا گیا ہے۔ مسلمانوں میں شیخ شہاب الدین سہروردی تھے جنہیں علمائے وقت کے فتوے پر سلطان صلاح الدین نے قتل کروا دیا تھا انا المسموم: میں زہر آلودہ ہو گیا ہوں ماعندی: نہیں ہے میرے پاس بتریاق و لاراقی: زہر کا اثر دور کرنے کے لیے اور نہ کوئی جھاڑ پھونک ہی ہے می جوید: تلاش کرتا/ کرتی ہے فروغ کار: کاروبار کا عروج بسالوسی: فریب' مکاری سے زراقی: منافقت چشم صیرفی: سونے کو پرکھنے والا شور: بیمار کم نور: بے نور' نابینا افزاید بہ براقی: زیادہ چمک دمک دکھاتا ہے

غزل - ۲۳

۱-۷: آشوبِ قیامت کا ہنگامہ: شور انداز: ڈال انداخت: گرا دیا نمناک: نمی والا کشمکش: کھینچا تانی جرعۂ آب: پانی کا گھونٹ بادۂ مرد افگن: دلیروں کو گرا دینے/ پچھاڑ دینے والی شراب لاے: تلچھٹ

گراں خیز: سست اور آرام طلب پاک انداز: پوری طرح اتار دے
تاک: انگور کی بیل خضر: مراد رہنما' رہبر

غزل-۲۴

۵-۱: کارد: اگائے' بوئے ساتگینے: ایک بڑا پیالہ بباد فرودینے: فرودین/ فروردین کی ہوا کو' موسم بہار کی ہوا کو۔ فرنگ: یورپ اندیشہ: فکر سفرورزیدہ: سفر اختیار کرنے والا زجارفتم: اپنی اصل اور مقام کو بھول گیا نابود: نہ ہونا بود: ہونا نقش خسروی بندد: شاہانہ نقش کھینچے رقم کش: تحریر کرنے والا/ لکھنے والا ایں چنینم کردہ ای: تو نے مجھے ایسا بنایا

غزل-۲۵

۵-۱: تہی ادراک: فکر وخیال سے خالی فرزانگی: عقل' ہوش وخرد معنی پاک: مراد قرآن وحدیث کا پیام گریباں چاک: جس کا گریباں پھٹا ہو' مراد عشق کی راہ اختیار کرنے والا پیچد: لپیٹ میں لیتا ہے پیچم: میں لپیٹ میں لیتا ہوں پیچاک: لپیٹ' چکر بگرداں: گردش میں لا

غزل-۲۶

۷-۱: کافری کردہ: انکار کیا' ایمان سے انکار کیا چاکری کردہ: غلامی کرتا ہے برافرازد: مراد تولتا ہے داوری: یعنی مقابلہ درآمیزد: سما جاتا ہے درآویزد: الجھ پڑتا ہے' خلاف ہو جاتا ہے حیدری: حضرت علیؓ کی سی جرات و دلیری' اللہ کا شیر بن کر کافروں کو للکارنا خیبری: مطلب خیبر کے یہودیوں کی طرح حق کے خلاف ڈٹا ہوا نیرنگ: عجائبات' عجیب ہونا نشتری کردہ: نشتر چلاتا ہے کے: کیونکر' کیسے مقام آزری: آزر بت تراش کا مقام/ گھر' آزر' حضرت ابراہیمؑ کے زمانے کا مشہور بت تراش اور بت پرست (زبور میں آذری یعنی ذال کے ساتھ لکھا ہے جو غلط ہے۔ اس لیے کہ اس کے معنی آگ کے ہیں' صحیح ز کے ساتھ ہے) تن آسانے: ایک تن آسان' ست الوجود' کاہل

غزل-۲۷

۱-۳: طبعِ روانم: میری رواں طبیعت نمازِ بے حضور: ایسی نماز جس میں حضوری نہ ہو، نمازی کی توجہ اس ذات کی طرف نہ ہو کافر: یہاں مراد بے حضور نماز ادا کرنے والا

غزل-۲۸

۱-۲: جانِ غم اندوزم: مراد میری غموں سے بھری ہوئی جان باغِ رضوانے: کسی رضوان کا باغ، یعنی بہشت (رضوان جنت کا داروغہ ہے) کاوی: تو کھودے، تو نظر کرے

غزل-۲۹

۱-۶: ازتست: تجھ سے یعنی تیرا ہے، تیری تخلیق ہے بشب گونہ عماری: رات کی طرح، تاریک ڈولی میں نقش پرداز: نقش بنانے/کھینچنے والا، نقاش، تخلیق کار حاضر آرائی: موجودہ کو آراستہ کرنا، وجود میں لانا آیندہ نگاری: مستقبل میں جو کچھ ہونے والا ہے اس کو لکھنا، مستقبل کے نقوش بنانا

غزل-۳۰

۱-۷: خوشتر: زیادہ اچھی گامے: ایک قدم، ایک قدم چلنا/ رکھنا بیاسائے: آرام کر/ فرما کلفت: تکلیف، اذیت چشمکِ محرمانہ: رازآشنا، گوشہ چشم درساز: موافقت کر/کرلے

غزل-۳۱

۱-۴: تاختنش: اس کی حملہ آوری کشتن: مارنا سوختن: جلانا ساختنش: اس کا بنانے یا سنوارنے کا عمل پرداختنش: اس کا مصروف ہونا، اس کا بناؤ سنگھار کا عمل برد: لے جاتا/لوٹ لیتا ہے باختنش: اس کا

ہارنے یا پیش کرنے کا عمل سپر انداختنش: اس کا ہتھیار ڈال دینا' شکست تسلیم کر لینا

غزل-۳۲

۱-۷: رخت: سامان خانماں: گھر' ساز و سامان کشت: کھیتی حاصل: فصل ترس: خوف تپیدن: تڑپنا نرسیدن: نہ پہنچنا بدنبالِ محمل: کجاوے کے پیچھے پیچھے خلشے: چبھن کجا برم: کہاں لے جاؤں

غزل-۳۳

۱-۶: زمستاں: موسم سرما سر آمد: ختم ہو گیا بخشد: دیتی ہے گریزد: بھاگتا ہے غزال: ہرن' مراد خود علامہ کا دل دمے: کچھ دیر' ذرا آسودہ: آرام میں بیم: خوف' ڈر نگویم: میں نہیں کہتا' بتاتا

غزل-۳۴

۱-۷: ہوائے خانہ: گھر کی خواہش/آرزو غریب: پردیسی' اجنبی سر راہم: میں راستے میں پڑا ہوں یا راستے میں ہوں خاکستر: راکھ فسرد: افسرد' بجھ گیا گذر نرمک: آرام/آہستہ سے گذر مگرداں: مت کر فرو ریخت: نیچے گرا/گرے از چشمہ سارم: میرے چشموں کے سلسلے میں میندیش: مت ڈر' خوف نہ کھا پایاں: انتہا' اختتام بجانِ تو: تیری جان کی قسم ازل: زمانے کا آغاز جس کی کوئی حد نہیں ابد: زمانے کا اختتام' اس کی حد بھی معلوم نہیں ہے

غزل-۳۵

۱-۵: خرابم: میں نشے میں چور ہوں فزوں تر: افزوں تر' زیادہ' بڑھتا ہے رشتہ شمع: موم بتی کا دھاگا زخمہ: مضراب' جس سے ستار بجاتے ہیں تار رباہم: میں ساز کا تار ہوں خیزد: اٹھے' طلوع ہو خاور: مشرق

بستند خوابم: قدرت نے مجھے بیدار رکھا ہے

غزل-۳۶

۱-۶: سحر نمودی: تو (خدا) نے صبح کر دیا ہے طلعت: چہرہ، صورت سزد: مناسب/ سزاوار ہے، لائق ہے رسیدی: تو پہنچا، تسکین کا سامان کیا آرمیدی: آرام کیا/ کرنے لگا رمیدی: تو دوڑ/ نکل گیا یعنی دور ہے بچنیں: ایسی، اس قدر گراں رکابی: یعنی ثابت قدمی، استقلال کم عیاراں: کم عیار کی جمع، جن کی کوئی قدر و قیمت نہ ہو دل فگاراں: دل فگار کی جمع، زخمی دلوں والے، زخمی دل دوگونہ: دو طرح بکنارِ من: میرے پہلو میں بجلالِ تو: تیرے جلال کی قسم، تیری عظمت کی قسم بکبوتراں: کبوتروں یعنی آج کے کمزور مسلمانوں کو عقابی: مراد طاقت و قوت (عقاب کی سی)

غزل-۳۷

۱-۳: نخستیں آدم: میں پہلا آدمی ہوں فشانی: تو چھڑکتا ہے بیار: لا، لے آ دولت بیدار: یعنی عظیم حکمت جامِ جہاں بیں: دنیا کو دیکھنے والا پیالہ، ایران کے بادشاہ جمشید کا جام، جس میں سے ایک روایت کے مطابق دنیا نظر آتی تھی، اسے جامِ جم کہتے ہیں بزم جے: کسی جم یعنی جمشید کی بزم

غزل-۳۸

۱-۳: تو بگو: تو کہہ/ بتا شناسی؟: کیا تو پہچانتا/ جانتا ہے فرو چکد: نیچے ٹپکتا ہے درشاہوار: بادشاہوں کے لائق موتی، اعلیٰ درجے کا موتی چہ بگویمت: میں تجھے/ تجھ سے کیا کہوں دم مستعار: مراد عارضی یا فانی زندگی نفس نفس شمارد: ایک ایک سانس گنتی ہے

غزل-۳۹

۱-۶: از خود رفتگی: اپنے آپ سے بے خبر ہونے کی حالت/ کیفیت آرد: لائے

اولیٰ: بہتر بہا: قیمت از بس گراں: بہت ہی مہنگا، بہت بڑی قیمت نگیرد: یعنی موافق نہیں ہے شد: وہ وقت / زمانہ گیا، ختم ہو گیا شہادت: گواہی زد رخنہ ہا: خلل ڈال دیا ہے، رکاوٹ بن گئی ہے چرخ مینائی: نیلا آسمان بنا کن: تعمیر/تخلیق کر نوری: فرشتہ مس خامے: کچا تانبا کیمیا: اکسیر، سونا ارمغاں: تحفہ

غزل-۴۰

۱-۲: وانمود: ظاہر کر دیا ہے سپید و سیاہ: سفید اور کالا یعنی ہر شے نتابد: تاب نہیں رکھتا، برداشت نہیں کرتا/ کر سکتا

غزل-۴۱

۱-۴: بیگانہ اندیش: غیروں کی فکر کرنے والا فراگیرد: یعنی مسخر کر لے گیتی: زمانہ، دنیا بندکم وبیش: تھوڑے اور زیادہ کی زنجیر، نفع اور نقصان کے چکر میں پھنسا ہوا صید گیر: شکار پکڑنے والا، شکاری بیروں کش: باہر نکال جگر دوزی: جگر کو زخمی کرنا، جگر میں پیوست ہونا کیش: تیردان خستہ: تھکی ہوئی

غزل-۴۲

۱-۶: فشانم: میں بکھیرتا ہوں بفلک رسانم: آسمان تک پہنچادوں نہ دمیدہ: نہیں اگا بدل نشانم: دل میں بٹھالوں/ چھپالوں نمودے: ایک یا خاص چمک بمیرم: میں مر جاتا ہوں فرونشانم: یعنی اندر لے جاتا ہوں، جو (سانس) میں لیتا ہوں دگرستانم: میں پھر لے لوں، واپس لے لوں ادب کن: لحاظ کر نخوانم: میں نہ پڑھوں سراید: گائے، کہے

غزل-۴۳

۱-۲: جامِ جہاں بینم: میرا جام جہاں بیں، میرا دنیا کو دیکھنے والا جام/ دل فرو

ریزد: نیچے گراتا ہے تلخے کہ: یعنی وہ تلخ شراب/ تلچھٹ جو کام: حلق

غزل-۴۴

۱-۴: ارباب ہوس: حرص و ہوس والے لوگ نہاں خانۂ دل: دل کی گہرائی، پوشیدہ اسرار رکھنے والا می خیزد: اٹھتی ہے، پیدا ہو رہی یا تخلیق ہو رہی ہے حدیث: بات

غزل-۴۵

۱-۶: چنگ و نے: باجا اور بانسری در کنار آئی: (اگر) تو میرے پہلو میں آئے ورنیائی: اور اگر تو نہیں آتا/ آئے گا فرودیں: موسم بہار دے: مراد خزاں درگسست: ٹوٹ گیا حضور: بارگاہ پے بہ پے: مسلسل، لگاتار یک نیستاں نالہ: نالوں کے سرکنڈوں کا ایک جنگل یعنی بہت نالہ و فریاد یک چمن گل: یعنی بے شمار پھول نیروئے او: اس کی طاقت درفتد: الجھ پڑے، ٹکرا لے تخت کے: ایران کے بادشاہ کیخسرو کا تخت، مراد بڑی یا باطل قوتیں خرم: خوش ہو جاؤ

غزل-۴۶

۱-۵: ریخت: گرائے انداخت: ڈالا، پیدا کیا زمیں سائیم: ہم زمین پر چلنے والے ہیں نمی زیبد: زیب نہیں دیتی نمی سازد: موافق نہیں ہے کم کاسہ: کم شراب والا یا چھوٹے پیالے والا مشو: مت ہو، مت بن شایان: لائق، مناسب، سزاوار

غزل-۴۷

۱-۸: گسستہ: ٹوٹ گیا ہے، ٹوٹا ہوا ہے، ناآشنا ہے تیرہ خاک: تاریک مٹی، مراد جسم جولانِ موج: موج/ موجوں کا اچھلنا نگراں: دیکھنے والا شراب ہوا خوردہ: یعنی خراب شدہ شراب مجاز: مراد علم و حکمت وغیرہ

بینائے کور: بینا (دیکھنے والا) ہوتے ہوئے بھی اندھا ہونا گردندہ تر: زیادہ گرش کرنے والا ربایندہ تر: زیادہ اچک لے جانے/لوٹنے والا خو: عادت، خصلت خاکی نہاد: جس کی اصل یا بنیاد مٹی ہو، مٹی کا بنا ہوا انسان بے مدار: بے اصول کلاں کار: چالاک و ہوشیار تو بتو: منافق بزم شبانہ: رات کی محفل ساز: یعنی آراستہ کر، سجا

غزل-۴۸

۱-۶: فرصت کشمکش: کھینچا تانی کا موقع مدہ: مت دے شکن: بل پیچ نہاد: رکھی بفراغ خاطرے: دل کے اطمینان و آسودگی کے لیے مرغ زار: سبزہ زار پلاس: موٹا کپڑا شہریار: بادشاہ بدوش می کشد: کندھوں پر اٹھالیتا ہے

غزل-۴۹

۱-۶: درآویخت: الجھ گئی، متصادم ہوئی پیدا ستیزد: ظاہر یا کھلم کھلا برسرپیکار ہوتی ہے ناپایدارے: جسے بقا نہیں ہے، فانی پایدارے: بقا والا/والی بانگ ہزاراں: بلبلوں کی آواز/چہچہاہٹ (ہزاراں: ہزار کی جمع بمعنی بلبل) تلخے کہ: وہ شراب جو سازد: موافقت کرے، مطلب کی ہو

غزل-۵۰

۱-۵: می سپارم: میں سپرد کرتا ہوں نفس شماری: سانس گننا، مجبوراً زندگی گذارنا آرمیدم: میں نے آرام کیا برفگندی: تو نے پھینک دیا درآبدار: چمکتا ہوا موتی خدنگ: تیر

غزل-۵۱

۱-۶: می تواں گفتن: کہی جا سکتی ہے بردی: تو لے گیا، تو نے چھین لی گویا: بولنے والی انگیز: اٹھان، سرشت نہ می جویم: نہ میں تلاش کرتا

ہوں   فروریزی: تو گراتا ہے

غزل-۵۲

۱-۶: کشی: تو کھینچے گا   کشا: کھول، نقاب ہٹا   فزودہ ام: میں نے بھڑکائی ہے   تشنہ کام: پیاسا، پیاسے حلق والا   ورق ورق بگشت: ایک ایک ورق سے گذری، ایک ایک ورق دیکھا   طائر زیرکے: ایک دانا/ چالاک پرندہ   بے زمام: بے لگام   برہنہ گفتن: کھل کر بات کرنا   کنایہ: اشارہ، رمز   ہم نفسانِ خام: مراد ذوق وشوق اور جستجو سے عاری ساتھی

غزل-۵۳

۱-۶: پیچاکِ روزگار: زمانے/ زندگی کا چکر   خروشیم: ہم شور مچا/ کر رہے ہیں   سطوتِ دریا: سمندر کی ہیبت   نگاہدار: محافظ   نہاں: پوشیدہ، چھپا ہوا   مپرس: مت پوچھ   صیرفیاں: صیرفی کی جمع، سونا پرکھنے والے   عیار: کسوٹی   بوالعجبی: عجیب یا حیران کن بات   کرا: کہ را، کس کو، کسے   دوچار: آمنے سامنے   کشائے: کھول دے، ہٹادے

غزل-۵۴

۱-۶: کشودم: میں نے کھولا/کھولے   جگر: مراد حوصلہ   ندیدنی: نہ دیکھنے کے لائق/ قابل   گذشتی: تو گذرا، تو داخل ہوا   نگیں شناساں: نگیں شناس کی جمع، نگینوں کی پہچان/ شناخت کے ماہر   سپارم: میں حوالے کرتا ہوں، سپرد کرتا ہوں   قدحِ خرد فروزے: عقل کو روشن کرنے/ چمکانے والا پیالہ، مراد علم ودانش

غزل-۵۵

۱-۵: افتندہ تر: زیادہ گرے ہوئے، زیادہ عاجز   پرتومہ: چاند کا عکس، چاندنی   چساں: کس طرح   برافگن: ہٹا، اٹھا   پختہ ترک: زیادہ پختہ/ قوی

بے خیل وسپہ: گھوڑوں اور فوجیوں کے بغیر

غزل-۵۶

۱-۵: خاک پریشانے: منتشر/بکھری ہوئی مٹی فرو پیچد: سموتا ہے، سموئے ہوئے ہے عشق بلا انگیز: مصیبتوں کو ابھارنے والا، مصائب و آلام والا شوید: دھوتا ہے آلودہ دامانے: ایک آلودہ دامن، ایسا آدمی جس کا دامن مادیات سے بھرا ہوا خیزد: اٹھتی ہے

زبورِ عجم

حصہ دوم

۱: سدرہ: بہشت میں عرش کی دائیں جانب (بیری کا) ایک درخت، جبرئیل کی پرواز وہیں تک ہے، اس سے آگے نہیں جاسکتے مشو: مت ہو

الگ چار اشعار

۱-۴: تواں دیدن: دیکھا جا سکتا ہے افگند ہوئے: نعرہ ''اللہ ہو'' لگا رہا ہے مخور: مت کھا درخشد: چمکتا ہے داغ سیما: پیشانی کا داغ ترسم: میں ڈرتا ہوں

غزل-۱

۱-۲: برخیز: اٹھ، بیدار ہو جا ہنگامِ نمود: ظاہر ہونے کا موقع/ وقت، اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع بسجود آمد: سجدہ کیا گفت وشنود: گفتگو، بیان

غزل-۲

۱-۲: ہم سفر اند: اکٹھے سفر کرنے والے ہیں، ہمسفر ہیں کرشمہ سنج: نگاہ و ابرو کے اشاروں کو پرکھنے والے/ ماہر قفا: پشت

غزل-۳

ا-۵: توانی کرد: تو کر سکتا ہے واتوانی کرد: تو کھول سکتا ہے کجا: کیونکر، کیسے مسجود: جسے سجدہ کیا جاتا ہے چہا: چہ کی جمع، کیا کیا جہانے بپا...: ایک نئی دنیا پیدا کر سکتا ہے چساں: کس طرح فروختی: افروختی، تو نے روشن کیا

غزل-۴

ا-۵: کرانہ: ساحل، کنارہ زبانہ: چنگاری می خواہی: تو چاہتا ہے یکے: ذرا، کچھ دیر مردانِ آشنا: مراد عارفانِ حق/ صادق آویز: تھام ہوئے فگندہ ای: تو نے شور مچا رکھا ہے/ مچا رہا ہے شکستی: تو نے توڑ ڈالا کوش: کوشش کر آموز: سیکھ بعشوہ گری: معشوقانہ ناز وادا میں

غزل-۵

ا-۷: قاصد طیار: بہت اڑنے والا پیغام رساں دلآرام: دل آرام، دل کو سکون پہنچانے والا گماں مبر: مت خیال کر گرفتم: یعنی میں نے مان لیا بلند پروازی: تو اونچا اڑنے والا ہے بہوش باش: ہوش میں رہ، ہوش کر کہن دام: پرانے جال والا، بڑا تجربہ کار شکاری باوجِ مشت غبارے: یعنی انسان کی سی بلند مقامی/ بلند مرتبے تک بلند نامی: نام کی شہرت بلندیِ بام: بلند رہائشی چھت مراد آسمان شمار نفس: سانسوں کو گننا، وقت کی قید میں ہونے کی کیفیت دگر نیندیشم: مجھے اس کے سوا کوئی اور ڈر نہیں

غزل-۶

ا-۷: نتواں گفت: نہیں کہا جا سکتا بالین: سرہانہ درماں: علاج خوشا کسے: وہ بڑا مبارک/خوش بخت ہے فرو رفت: ڈوب گیا، اتر گیا برکشید: پرویا، نکالی شناخت مرا: مجھے پہچان لیا خراب: مراد سرشار

عتاب زیر لبی: زیر لب (مسکراتے ہوئے) غصے کا اظہار خانہ ویراں: جس کا گھر ویران ہو چکا ہو غمیں مشو: تو غمگین نہ ہو بروں ندہد: ظاہر نہیں کرتا شوریدہ: بکھری بکھری، منتشر

غزل-۷

۱-۲: گرم تماشا: دیکھنے یا نظارہ کرنے میں محو جوئندہ: تلاش کرنے والا یابندہ: پالینے والا نگہ آلود: مراد مادیات سے آلودہ نگاہ والا

غزل-۸

۱-۷: عاشق سرہ اند: خالص/ سچے عاشق ہیں عیار: کسوٹی، پرکھ نہ نہند: نہیں رکھتے/ بناتے باہمہ اند: سب کے ساتھ ہیں بچشم کم: حقارت کی نظر سے منگر: مت دیکھ شکستہ بہایاں: شکستہ بہا کی جمع، جن کی قدر و قیمت ناقص ہو، خستہ حال و مفلس رقم کردند: انہوں نے لکھا شبان بے رمہ: ایسا گڈریا جس کا کوئی ریوڑ نہیں حدیث: بات غریب: انوکھی، عجیب راویاں: راوی کی جمع، بیان کرنے/ کہنے والے ثقہ اند: قابل اعتبار ہیں

غزل-۹

۱-۶: سپر: ڈھال میندار: مت گرا/ چھوڑ باغوشش: اس کی گود میں مہد: جھولا، پنگھوڑا آسودہ نشینی: تو آرام سے/ مزے سے بیٹھا ہوا ہے بگرداب: بھنور میں نہنگ: مگرمچھ بسا: بہت سے باش: ٹھہر، رک جا نقش پرداز: نقش بنانے والا، نقاش/ خالق نگریست: اس نے دیکھا

غزل-۱۰

۱-۷: حجت: دلیل اعجازِ بیاں: بیان کا معجزہ، بیان کی غیر معمولی قوت گاہ باشد: کبھی ایسا ہوتا ہے زرہ: میدان جنگ میں جاتے وقت لوہے کے تاروں کا بنا ہوا حلقہ جو کرتے/قمیص کے اوپر پہنتے تھے تہ خرقہ: گدڑی کے نیچے پاک

بسوزند: پوری طرح جلا ڈالتے ہیں بدہند: دے دیتے ہیں بزیاں: گھاٹے میں، نقصان والا ارزاں: سستی گراں: مہنگی

غزل-۱۱

۱-۴: سرکش: ٹکرا، ٹکرا جا کہ گفت: کس نے کہا پلنگ: چیتا رخت کشا: سامان کھول، قیام کر کمند گلوفشار: گلا دبانے والی کمند بدرماں کش: علاج کے لیے استعمال کر

غزل-۱۲

۱-۵: فرسلطاں: بادشاہوں کی سی شان وشوکت محمود: مراد سلطان محمود غزنوی ایاز: محمود غزنوی کا غلام جس سے محمود کو محبت تھی عمرہا: مدتوں طرح نو: نئی بنیاد می افگند: رکھتے ہیں اہل نیاز: مراد اللہ کے برگزیدہ اور تسلیم ورضا والے لوگ، نیازمند کار از دست رفت: معاملہ ہاتھ سے نکل گیا ہے

غزل-۱۳

۱-۷: سلطان: مراد مالک حقیقی، خدا تعالیٰ الٰہی: کوئی معبود/ بت فتد: افتد گرتا ہے فروریزم: میں گرا دیتا ہوں فرونا ید: نیچے نہیں آتا بدریوزہ پرتو: عکس یعنی روشنی کی بھیک کے لیے خرامد: ٹہلے یعنی آئے، آتا ہے بگردانم: میں لوٹا دیتا ہوں درخشم: میں چمکتا ہوں شناسم: میں پہچانتا ہوں، میں آگاہ ہوں خراں: خر کی جمع، گدھے، یعنی گھٹیا اور نااہل لوگ برسربام: چھت پر ہیں، یعنی سرفراز ہیں

غزل-۱۴

۱-۷: درساز: موافقت کر دمادم زن: مسلسل پیتا رہ سلطنت جم: جمشید، عظیم ایرانی بادشاہ کی سلطنت، مراد بڑی اور باطل قوت زن: مار یعنی ٹکرا جا برہم زن: اسے درہم برہم/ تلپٹ کردے شایستہ حریفے: کوئی لائق/ سزاوار

یا مناسب ساتھی رستم دستاں: ایران کا مشہور رستم ابن دستاں، بعض کے نزدیک دستاں، داستاں کا مخفف ہے، رستم کے باپ کا اصلی نام زال تھا، مراد مردان خدا، جذبہ جہاد سے سرشار مسلمان یا عالی ظرف انسان زن: پی، یہاں بمعنی صحبت اختیار کر مغبچہ ہا: مراد گھٹیا لوگ کم زن: نہ پی، ان گھٹیا لوگوں کی صحبت میں نہ بیٹھ نتوانی سوخت: اکیلے نہیں جلا جا سکتا داغ جگر تابے: جگر کو حرارت دینے والا داغ (داغ جو گل لالہ کے اندر ہوتا ہے) چاکے: ایک یا کوئی دراڑ بنہ: رکھ ایاغ: پیالہ زبدخشانم: (میرے بدخشاں کا ایک لعل ہے، بدخشاں، ترکستان کا ایک شہر جو اپنے لعل، زمرد اور سونے، تانبے کی دولت کی وجہ سے مشہور ہے) بخاتم زن: انگوٹھی میں جڑ لے

غزل-۱۵

۱-۷: تماشا گر: تماشا کرنے والی پردہ ہائے زنگاری: ہرے رنگ کے پردے، مراد آسماں می تراشد: تراشتی ہے زماں زماں شکند: ہر لحہ/ ساتھ ساتھ توڑتی جاتی ہے زناری: جنیو پہننے والی، کافر، بت پرست سخت کوش: بے حد کوشش/ جدو جہد کر پیہم کوش: مسلسل کوشش کرتا رہ حیدری: حیدر یعنی حضرت علیؓ کی سی شیرانہ دلیری کراری: بار بار حملہ کرنے کی حالت، پے در پے حملے کرنے کی صلاحیت تو چشم بستی: تو نے آنکھ بند کر لی آفریں: پیدا کر، برپا کر یکی شناس: وحدت کی پہچان رکھنے والی تماشا پسند بسیاری: بہت سوں کا نظارہ کرنیوالی تپید: تڑپا می پاشم: میں بکھیرتا ہوں کند بازاری: بازار مندا ہونا، گاہک نہ ہونا اور بھاؤ کم ہونے کی صورتحال، مراد ناقدر شناسی

غزل-۱۶

۱-۶: گماں مبر: (یہ) خیال مت کر می بازند: کھیلتے ہیں ادا می تواں: کہی جا سکتی ہے مردم: آنکھ کی پتلی کشائے چہرہ: چہرہ بے نقاب کر دے ''لن ترانی'': تو مجھے نہیں دیکھ سکتا، قرآنی تلمیح، حضرت موسیٰ کی خدا سے جلوے کی

درخواست پر انہیں خدا نے یہ جواب دیا   کہ سرود است: کس نے گایا ہے، کون گا رہا ہے   عرقناک: پسینے میں شرابور

غزل-۱۷

۱-۷: بازدہد: مراد زندہ کرے یا پھر قائم کرے   رود: ساز، نغمہ   سبو چہ ہا: چھوٹے چھوٹے مٹکے یا چھوٹی چھوٹی صراحیاں   فغاں: فریاد ہے   نشناسد: نہیں پہچانتا/ جانتا   مے جوانہ: جو کی بنی ہوئی شراب، مراد فقیرانہ، درویشانہ شراب   واسوزد: جلا ڈالے   خیز: اٹھ   می آویز: گھلا ملا رہ   می طلبی: تو طلب کر رہا/ چاہتا ہے   دوید: دوڑا، پیدا ہوا   دگر مگوے: پھر نہ کہنا   بیک نورد: ایک ہی لپیٹ/ چھلانگ میں   فرو پیچ: طے کر لے، لپیٹ لے   دیر و زود: دیر اور جلدی، ظاہری وقت/ زمانے کی تقسیم

غزل-۱۸

(یہ غزل نہیں بلکہ جدید انداز میں کہی گئی نظم ہے یعنی تین تین مصرعوں پر مشتمل ہر بند کا اپنا اپنا ردیف وقافیہ ہے)

۱-۸: وزیدن: ہوا کا چلنا   دگر آموز: پھر سے سیکھ   کشیدن: کھینچنا   دلک: چھوٹا سا دل   خزیدن: گھسنا، خلش پیدا کرنا   موئینہ: صوف کا لباس   بہ بر کردی: تو نے پہنا   تپیدی: تو تڑپا   نہ رسیدی: تو نہ پہنچا   باو بند: اس سے لگا، یعنی اس محبوب حقیقی سے لگا   فرو بند: بند کر لے   غیر: اللہ کے سوا جو کوئی ہے، ماسوا اللہ، غیر اللہ   دیدن: دیکھنا   شنیدی: تو نے سنا   ندیدی: تو نے نہیں دیکھا   شنیدن: سننا   مرغ سرا: پالتو پرندہ، گھر میں پلا ہوا پرندہ   پریدن: اڑنا   نفروشند: نہیں بیچتے، قدرت یونہی عطا نہیں کرتی   خریدن: خریدنا   تخت جم و دارا: ایران کے قدیم مشہور بادشاہ جمشید اور دارا کا تخت، مراد عظمت و بلند مرتبہ   نالیدی: تو رویا، تو نے نالہ وزاری کی   ہمان است: وہی ہے   مشو: مت ہو   نالہ کشیدن: نالہ کھینچنا، رونا، آہ وزاری کرنا   واسوختہ ای؟: کیا تو جل گیا

ہے، پوری طرح جل گیا ہے؟ ہمہ در گیر: لپیٹ میں لے لے دویدن: دوڑنا

نظم-۱۹

(یہ بھی غزل نہیں ہے)

پہلا بند

= خوابیدہ: سویا ہوا نگراں: دیکھتے ہوئے کاشانہ ما: ہمارا گھر رفت بتاراج: لوٹ لیا، برباد کر دیا آتش نفساں: آتش نفس کی جمع، جن کے سانسوں میں آگ بھری ہو، سوزِ عشق سے سرشار۔

دوسرا بند

= پیرایہ بست: سجایا، آراستہ کیا آویزہ: کان کا بندا

تیسرا بند

= خاور: سرزمین مشرق اثر باختہ: بے اثر گرہ خوردہ نگاہے: ایسی نگاہ جس پر گرہ لگا دی گئی ہو، نہ دیکھ سکنے کی حالت، غفلت ہمدان: ایران کا ایک شہر سمرقند: وسطی ایشیا یا قدیم ایران کا ایک شہر جو کبھی امیر تیمور کا پایہ تخت تھا

چوتھا بند

= افزوں نشد: بڑھا یا زیادہ نہیں ہوا کاست: گھٹ گیا، کم ہو گیا آشوب: طوفان، طلاطم نہنگ: مگر مچھ

پانچواں بند

= کشایندہ: کھولنے/ ظاہر کرنے والا روح رواں: ایسی روح جسے فنا نہیں خواب گراں: گہری نیند

چھٹا بند

= ناموس: عزت، توقیر توامینی: تو امین ہے، تو امانت رکھنے والا ہے تویساری: تو دایاں بازو ہے تو یمینی: تو بایاں بازو ہے درکش: پی جا دیرگماں: وہم کا مندر، مراد وہم وگماں

ساتواں بند

= دل آویزی: دل لبھانے والی (فضا) شیرینی: شیریں ہونا، شیریں کا سا حسن ومحبوبی پرویزی: خسرو پرویز کی سی عیاری و مکاری چنگیزی: چنگیز ہونے کی حالت، چنگیز کی طرح (جس نے ۶۱۶ ھ/ ۱۲۱۹ء میں ایران پر حملہ کیا تھا) لوٹ مار اور قتل و غارت گری

غزل-۲۰

۱-۵: پے سپر گردد: اڑ جائے گی، فنا ہو جائے گی نفسہاے رفتہ: وہ سانس جو جا چکے ہیں گورِ غریباں: مسافروں یعنی آخرت کا سفر کرنے والوں کی قبر/ قبریں لایزال: جسے زوال نہیں می طلبد: مانگتا/ چاہتا ہے کرا: کہ را، کسے کس کو مترس: مت ڈر بزی: زندگی بسر کر، زندگی گذار مرگِ دوام: ہمیشہ ہمیشہ کی موت زکردۂ خود: اپنے کیے پر، اپنے عمل پر

غزل-۲۱

۱-۵: ہلہ: خبردار ہو جا برخیز: اٹھ کھڑا ہو اندیشہ: سوچ، فکر ناقہ ایام: زمانے کی اونٹنی کشد محمل خویش: اپنا کجاوہ رکھتا ہے (محمل: ڈولی، کجاوہ) راحلہ: سواری قطع نظر: توجہ نہ کرنا سرِ اوداری: اس کا قصد/ خواہش رکھتا ہے گفتمش: میں نے اس (محبوب) سے کہا لات ومنات: مشہور قدیم عرب کے بت، مراد شیطانی خیالات وافکار اور کردار

غزل-۲۲

۱-۵: گماں مبر: (یہ) خیال مت کر مورِ فرومایہ: حقیر چیونٹی الوند: ہمدان (ایران) کے اطراف میں ایک اونچے پہاڑ کا نام' مراد پہاڑ بیستون: ایران کے ایک پہاڑ کا نام جس سے فرہاد' عاشق شیریں نے بادشاہ خسرو پرویز کے حکم پر نہر کھودی تھی' مراد پہاڑ گسستہ نفس: یعنی سانس نہ لینے والا

غزل-۲۳

۱-۷: قیامت رفت: قیامت گذر گئی' بہت بڑی مصیبت پڑ گئی بم وزیر: اونچے نیچے سُر مقام وراہ: راگ کے پردے اور سُر در نہادم: میری فطرت میں' میری سرشت میں آمیختند: قدرت نے ملایا ہے ناتمام جاودانم: میں ہمیشہ ناتمام/ نامکمل رہنے والا ہوں لب فرو بند: ہونٹ بند کر لے' خاموش ہو جا درساز: موافقت کر می باش: بنا رہ/ بن جرہ شاہینی: تو تو نر شاہین ہے کرمِ شب تاب: جگنو جو رات کو چمکتا ہے شبستانِ وجود: وجود کی محفل شب فروغے: روشنی فاش گفت: کھل کر یا واضح طور پر بیان کیے/ کہے نو کافر: نیا نیا ہونے والا کافر

غزل-۲۴

۱-۷: جم: جمشید' قدیم ایرانی بادشاہ جس کے جام میں دنیا کا عکس نظر آتا تھا فشردۂ جگر من: میرے جگر کا نچوڑ می تپد: تڑپتا ہے خلیل: حضرت ابراہیم خلیل اللہ جنہوں نے نمرود سے ٹکر لی تھی در شکنیم: ہم توڑ ڈالیں' ہم اس کا توڑ کریں در نروی: اندر تک نہ جائے گا غلط خرامِ ما: ہمارا صحیح راستے کو نہ پا سکنا خم بخم: پیچ در پیچ' بہت دشوار گذار التفات: توجہ چکید: ٹپکا

غزل-۲۵

۱-۶: برید: لے چلو' لے جاؤ ہوائے دشت: جنگل کی فضا روبہی: لومڑی پن' عیاری و مکاری آموختم: میں نے سیکھا/ سیکھی چارہ پردازاں: چارہ

پرداز کی جمع' علاج کرنے والے **بازم:** پھر مجھے **پردہ گرداند:** ساز کے سروں سے آشنا کردے یعنی سازندہ یا موسیقار

غزل-۲۶

۱-۶: **وانرسید:** تہ تک نہ پہنچا **کارگہِ شیشہ:** شیشے کا کارخانہ مراد یہ دنیا **وائے:** افسوس' افسوس کہ **ورطہ لا:** لا کا بھنور (نہیں کوئی معبود) **بہ الانرسید:** وہ الا تک نہیں پہنچا (مگر یا سوائے اللہ تعالیٰ کے) **جوئے تنک مایہ:** تھوڑے پانی والی ندی **شگافید:** پھاڑ ڈالا **سینا:** طور سینا **تپیدن:** تڑپنا **برجست:** اچھلا/ اچھلی

غزل-۲۷

۱-۵: **درنسازو:** موافقت نہیں کرتا **کرانے دارد:** کنارہ رکھتا ہے' محدود ہے **ندادند:** قدرت یا قضا و قدر کے کارکنان نے نہیں دیا **چشم نگرانے:** ظاہر کو دیکھنے والی آنکھ **ناپید:** غائب ہے' نہیں ہے **می گزدش:** اسے ڈستی ہے **صورتِ مار:** سانپ کی طرح **کاسہ زر:** سونے کا پیالہ **لعل روانے:** رواں لعل' مراد لعل کی سی سرخ اور چمکتی شراب **دُرد:** تلچھٹ

غزل-۲۸

۱-۴: **زماں زماں:** ہر ہر پل' لحہ بہ لحہ **نکونگرد:** اچھا یا صحیح مشاہدہ کرے **طریق میکدہ:** شرابخانے کا راستہ **میر قافلہ:** قافلے کا سالار **رساں:** پہنچا **ہمان است:** وہی ہے

غزل-۲۹

۱-۷: **بجستجو است:** تلاش میں ہے **نویسد:** لکھتا ہے **بہ ہاو ہوست:** شور و غُل میں لگا ہوا ہے **آرمید:** اس نے آرام کیا' آرام سے بیٹھ گیا **چنداں:** اتنا' اس حد تک **کرشمہ داں:** نازو ادا جاننے والا **زند:** کھینچتا ہے

ہنگامہ بست: اس (خالق کائنات) نے ہنگامہ برپا کیا ہے ناآشنا: یعنی جو نظر نہیں آتا پیدا: ظاہر کاخ وکو: محل اور کوچہ' مراد ہر شے خاکدان: مٹی کا گھر' جسم

غزل-۳۰

۱-۹: خواجہ: آقا' صنعت کار' کارخانے کا مالک ساز د: بناتا ہے لعل ناب: خالص لعل انقلاب: بدل دو' الٹا دو از جفائے دہ خدایاں: گاؤں کے خداؤں یعنی زمینداروں کے ظلم سے انقلاب: یعنی ایسا نظام بدل دو رشتہ تسبیح: تسبیح کا دھاگا بدام: جال میں پھنسائے ہوئے ہے زنار تاب: پکا جنیو' برہمن کا مقدس دھاگا نرد باز: چوسر کھیلنے والے کعبتینِ شاں: ان کے کھیل کے پانسے دغل: دغا' فریب محکوماں: محکوم کی جمع' مراد کمزور اور غریب بہ پیری کود کے: وہ بڑھاپے میں بھی بچہ ہے پیر: بوڑھا اہرمن: شیطان یزداں: خدا دیریاب: مشکل سے ملنے والا کمین: گھات کلیسا: گرجا شپّر: چمگادڑ کوری: اندھاپن' مراد دن کو نہ دیکھ سکنا شیشہ ہائے عصر حاضر: اس دور کی صراحیاں مارہا: مار کی جمع' سانپ نیروئے پلنگاں: چیتوں کی سی قوت ابن مریمؑ: حضرت عیسیٰؑ

غزل-۳۱

۱-۶: تانہ پنداری: کہیں یہ نہ سمجھ لینا پیچ و تاب: بیقراری' اضطراب ضربتے: ایک چوٹ جانِ خفتہ: سوئی ہوئی روح برخیزد: اٹھے' اٹھ کھڑی ہو کے: کیونکر' کیسے تاکِ خویش: اپنی انگور کی بیل' مراد اپنا وجود آید بروں: باہر آئے ذرہ بے مایہ ای: تو ایک بے قیمت ذرہ ہے یا حقیر ذرہ ہے ترسم: میں ڈرتا ہوں' مجھے ڈر ہے پختہ ترکن: مضبوط بنا (خودی کو) مگیر: مت سمجھ ریزی: تو گرائے' ڈال لے بروئے تو: تجھ پر لعل ناب: خالص لعل

غزل-۳۲

۱-۴: کشادہ رو: مراد ہنسی خوشی گرفتم: میں نے مانا غریبی: تو اجنبی ہے نہ ای: تو نہیں ہے برآری: تو باہر نکالتا ہے دگرگوں کن: بدل دے، انقلاب پیدا کر دے رباطِ کہن: پرانی سرائے، یہ دنیا عنان: لگام ریز: گرا، ڈال

غزل-۳۳

۱-۵: صدف: سیپی ساختن: بنانا فرو رفتن: داخل ہو جانا نگداختن: نہ پگھلنا گنبدِ در بستہ: ایسا گنبد جس کا دروازہ بند ہو، مراد آسمان بروں تاختن: باہر نکل جانے کا عمل طاق فلک: آسمان کا طاق (طاق: دیوار میں بنی ہوئی وہ محرابی جس میں چھوٹی چھوٹی چیزیں رکھتے ہیں) انداختن: گرانا جاں باختن: جان ہار دینا جہاں بردن: دنیا کو جیت لینا، فتح کر لینا آختن: کھینچنا، سونتنا ساختن: تعمیر کرنا

غزل-۳۴

۱-۷: اندیشہ: سوچ، خیال می پرد: اڑتی ہے ببالِ تو: تیرے بڑے پروں کو ہوائے او: اس کی فضا گشتہ ای: تو ہو گیا ہے نتواں زیستن: نہیں جیا جا سکتا، زندگی بسر نہیں کی جا سکتی در پیچ: لپٹ جا منشیں: مت بیٹھ نیلِ آسماں: آسماں کا دریائے نیل، مراد نیلا آسماں (نیل: مصر کا مشہور دریا) بمیرد: مر جاتا ہے بچشم: میری آنکھوں میں می نیرزد: قدر و قیمت نہیں پاتا مپرس: مت پوچھ چساں: کس طرح دریابند: سمجھیں گے

غزل-۳۵

۱-۷: مزد: اجرت، مزدوری برتقدیرِ او: اس کی یعنی ابلیس کی تقدیر سے بستند تقصیرم: قدرت نے میرا گناہ وابستہ کر دیا ہے دنبالہ: پیچھے، پس پشت جا کر

صبح نخستیں: پہلی صبح، روز پیدائش چارہ بر گیرم: میں علاج / چارہ کر لیتا ہوں آتش زیرِ پا کردم: میں نے مضطرب / بیقرار کیا ہے بم و زیرم: میرے اونچے اور نیچے سر، اتار چڑھاؤ پاک می سوزد: بالکل جلا دیتا ہے رقصیدم: میں نے رقص کیا زنار بر بستم: میں نے زنار / جنیو باندھ لی، پہنی آمیزند: میل جول رکھتے ہیں، ملتے ہیں صیادم: میں شکاری ہوں نخچیرم: میں شکار ہوں نصیب: حصہ مسِ تابیدہ ے: چمکدار پیتل آور: لا

غزل-۳۶

۱-۸: کور است: اندھا / اندھی ہے بینا شد: دیکھنے والی ہوگئی افتاد است: پڑی ہے، گری ہے، واقع ہوئی ہے دلیل: راہنما خام سودا: ناقص عشق والا گہے باشد: کبھی ایسا ہوتا ہے کشتیم: میری کشتی خزف: ٹھیکری مرز و بوم: میرا وطن، میری کھیتی، مراد مخاطب لوگ باطل افتاد است: بے کار ہوگئی، کوئی اثر نہ ہوا بسمل: زخمی ناخدائی: ملاح والا کام

غزل-۳۷

۱-۷: داند: جانتا ہے نگہ دار: رکھوالی / حفاظت کر کار آفریں: کام پیدا کرنے والا، مراد خالق کائنات ذوق پیدائی: اپنی نمود یا اپنے ظاہر ہونے کا شوق کارسازی: مراد کائنات کا نظم و نسق شیوہ ہا: انداز، طور طریقے ایاز: سلطان محمود غزنوی کا غلام، جس سے محمود کو بہت محبت تھی مہرِ غزنوی: یعنی محمود غزنوی کی محبت افزوں کند: بڑھاتی ہے دردِ ایازی: ایاز کا درد علم و فراست: علم و حکمت با پرکاہ: گھاس کے ایک تنکے کے بدلے، یعنی معمولی سی قیمت پر بھی کالا: سامانِ تجارت سود مند: مفید، فائدہ مند ادراکِ رازی: امام فخر الدین رازی (مشہور فلسفی) کی عقل، (ادراک: عقل کے ذریعے کسی نئی بات کا علم حاصل کرنا) آموزم: میں سکھاؤں چہ نادانی: تو کیسا / کتنا نادان ہے دمِ شمشیر: تلوار کی دھار، یعنی تلوار کی سی طاقت و قوت

غزل-۳۸

۱-۵: تو آموزی: تو سیکھتا، حاصل کرتا ہے واماندہ ٔراہے: کسی راستے میں تھک کر بیٹھ جانے والا آوارہ ٔراہے: مراد راستہ طے کرنے والا نہ بردارم: میں نہیں اٹھاتا روئے نگارینش: اس کا دل کش اور حسین چہرہ قبا پوشد: چغہ پہنتا ہے کوشد: کوشش کرتا ہے، مصروف رہتا ہے دریاب: پالے، جان لے دلق: درویشی بوریا

غزل-۳۹

۱-۵: می تواں کردن: کی جاسکتی ہے سوزن: سوئی کشودِ غنچہ: کلی کا کھلنا ہمچو طفلاں: بچوں کی طرح صید: شکار جوہر: آئینے کی چمک

غزل-۴۰

۱-۵: کشیدی بادہ ہا: تو نے شرابیں پیں افروختی: تو نے روشن کیا، چمکایا ساقی خاور: مشرق کا ساقی، مراد مشرق کے علم وفن اور فکر وخیال ارغواں: سرخ (شراب) درکش: پی، پی جا کو: کہ او، کہ جو/ وہ

غزل-۴۱

۱-۲: حاصل: فصل، پیداوار، نتیجہ می تواں دادن: دِیے جاسکتے ہیں بہا: قیمت

غزل-۴۲

۱-۷: خاوریاں: خاوری کی جمع، اہل مشرق مرو: مت جا بشکستند: انہوں (اہل مشرق) نے توڑ ڈالا ہے برجستند: اچھل پڑے تورانیانِ شہر آشوب: ہنگامہ/ جنگ کو پسند کرنے والے تورانی مسلمان (توران: وسط ایشیا کا شہر) خستند: انہوں نے زخمی کرلیا/ کرلیے رس: پہنچ بریدہ: کٹ گئے، قطع تعلق کرلیا بخویش پیوستند: خود سے پیوست ہوگئے، اپنی خودی کو پالیا

زندانے: ایک قید خانہ رستند: نجات پا گئے سفتہ: پرویا مستند: مست ہیں خاکیاں: خاکی کی جمع، مٹی کے بنے ہوئے یعنی انسان

غزل-۴۳

۱-۷: نازم: میں ناز/فخر کرتا ہوں بودش: اس کا وجود/ہستی غم نابود: عدم/نیستی کا غم نے: نہیں ہے سومنات: ہندوؤں کا مشہور مندر محمود: سلطان محمود غزنوی جس نے سومنات کا مندر گرایا تھا کنشت: آتش پرستوں کی عبادتگاہ فسوں: افسوں، جادو، سحر آموختم: میں نے سیکھی/سیکھا درد آلود: درد سے بھرا ہوا/پر آئی؟: کیا تو آئے گا یا کیا تو آنا چاہتا ہے؟ اندرتست: تجھ میں ہے نغمۂ داؤدؑ: حضرت داؤدؑ کا نغمہ کم جوے: نہ/مت تلاش کر عیار: معیار تلخاب: تلخ شراب غم فرسود: غم میں گھلی ہوئی

غزل-۴۴

۱-۵: زند: ڈالتا ہے مے ناب: ایک خالص شراب سیماب: ایک پارہ بیاض: روشنی، چمک دمک می آرد: لاتی ہے، کر رہی ہے غم مخور: غم نہ کھا/کر نوشم: میری شیریں غذا یا میٹھا پانی، مراد شاعری خوردہ ای: تو نے کھائی ہے، پیا ہے نیشم: ڈنگ مرنج: برا نہ مان، رنجیدہ نہ ہو رگِ خوابے زند: سوئی ہوئی رگ کو پھڑکا دے

غزل-۴۵

۱-۴: فروغ: روشنی خاکیاں: خاکی کی جمع، انسان جو مٹی سے بنائے گئے ہیں افزوں شود: بڑھ جائے گی کوکب: ستارہ چہ می پرسی: تو کیا پوچھتا ہے می خلد: مچل رہے ہیں پیش پا افتادہ: عام سا یا آسان سا

غزل-۴۶

۱-۸: زندیق: آتش پرست، غیر مسلم آدم خاکی نہاد: مٹی کی اصل/بنیاد والا آدمی،

یعنی جو مٹی سے بنا ہے   دریا بند: پالیں، سمجھ لیں   طریق: راستہ   نہ پرسم: میں نہیں پوچھتا   می جویم: میں تلاش کرتا ہوں   نخستیں: پہلے تلافی: کمی یا نقصان پورا کرنا   بجامِ عقیق: مراد سرخ شراب کے جام میں فزوں تر: زیادہ   نکوتر: زیادہ اچھا   بے بصری: مراد جہالت دقیق: مشکل   بہ: اچھا   پیچ و تاب: مراد بھول بھلیاں   فرو شستم: میں نے دھوڈالا   کشادم: میں نے کھولا، کھول دیا   پرستم: میں پوجا کروں خدائے بے توفیق: بے اختیار اور بے طاقت خدا

غزل-۴۷

۱-۷: طلب: مانگ، طلب کر   بسر کشیدن: پی جانا، چڑھا جانا   شیشہ: صراحی جامِ جہاں نما: ایسا جام جس میں دنیا نظر آئے (جام جمشید کی طرف اشارہ ہے، مشاہدے کی حالت)   مجو: مت تلاش کر   دستِ جہاں کشا: دنیا کو فتح کرنے والا ہاتھ   خار زار: جہاں کانٹے ہی کانٹے ہوں   رسی: تو پہنچے راحلہ: سواری   مسند کیقباد: ایران کے مشہور بادشاہ کیقباد کا تخت، مراد دنیاوی بادشاہی یا دنیاوی شان   بود و رفت: گذر چکا   بنہ: رکھ، رکھ دے مومیا: سیاہ رنگ کی دوا جو غاروں سے اور پہاڑوں کی درزوں اور شگافوں سے نکلتی ہے اور ٹوٹی ہوئی ہڈی کو جوڑ دیتی ہے

غزل-۴۸

۱-۵: تا چند: کب تک   برافروز: روشن کر   در آستینی: تو آستین میں ہے   بنہ: رکھ   پیش ازینی: تو اس سے پہلے کا/مقدم ہے   ترسی: تو ڈرتا ہے   در کمینی: تو گھات میں ہے   بمیرد: مرتا ہے   بیاموز: سیکھ   باز آفرینی: تو پھر (ایک نئی صورت میں) پیدا کرلے   زندہ جاوید: ہمیشہ زندہ رہنے والا

غزل-۴۹

۱-۵: نمی ترسم: میں نہیں ڈرتا   نشناخت: نہ پہچانا   افتاد: گرا، پھنس گیا

نمودے خواست: اظہار چاہا خیزد: اٹھتی ہے شکن: توڑ ڈال' جذب کر لے مکن: مت کر نمی گنجد: نہیں سماتی مشرب ہا: مشرب کی جمع، مذہب گسست: ٹوٹ گیا' جدا ہو گیا

غزل-۵۰

۱-۷: تو کیستی؟: تو کون ہے؟ زکجائی: کہاں سے آیا ہے کبود: نیلا کشود: کھولیں چہ گویمت: میں تجھے کیا کہوں چہ شدی: تو کیا ہو گیا ایازیِ محمود: محمود کا ایاز بن جانا' سلطانی چھوڑ کر غلام بن جانا نہ ای: تو نہیں ہے زخویش ربود: خود سے بیگانہ کر دیا نامہ ومیزاں: مراد قیامت کے روز کے نامہ اعمال شناخت: پہچان لیا تپید: تڑپا درِ جبیں فرسود: ایسا دروازہ جس پر ماتھے/ پیشانیاں گھسے/ گھسی ہوں

غزل-۵۱

۱-۳: دیارِ شوق: عشق کی دنیا تواں دید: دیکھی جا سکتی ہے مے مغانہ: شراب کشید کرنے والوں کی شراب مغ زادگاں: مغ زادہ کی جمع' شراب کشید کرنے والوں کے بچے می شکند: توڑ ڈالتی ہے شیشہ ہائے تاک: انگور کی بیل کی صراحیاں' شراب سے بھری صراحیاں کوش: کوشش کر مقام نیاز: مراد ادب واحترام کا مقام بہوش باش: ہوش میں رہ مرو: مت جا قبائے چاک: پھٹا ہوا لباس

غزل-۵۲

۱-۵: مے دیرینہ: پرانی شراب چیزے نیست: کوئی چیز نہیں ہے' اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے' توجہ کے لائق نہیں ہے شناسی: تو پہچانتا ہے' تو سمجھتا ہے گذرد: گذر جاتی / جاتا ہے' فنا ہو جاتا ہے بر: خشکی' میدان کراں: ساحل' کنارہ مغربیاں: مغربی کی جمع' اہل یورپ مشرقیاں: مشرقی کی جمع' اہل مشرق ازخود اندیش: اپنے بارے میں سوچ' خود پر غور کر' اپنی

معرفت حاصل کر ترساں: ڈرتے ہوئے مگذر: مت گذر، مت جا
طریقے: وہ راستہ، وہ راہ کاویدم من: میں نے کھودا ہے •

غزل-۵۳

۱-۶: کوشند: کوشش کرتے ہیں باج ستانند: خراج وصول کرتے ہیں می
پوشند: پہنتے ہیں پیچند: ڈالتے یا پھینکتے ہیں درآغوشند: گود میں لیے
ہوئے یا ان کی گود میں ہوتے ہیں پرنیان وحریر: ریشمی کپڑوں کی قسمیں
بروزِ رزم: جنگ کے دن/ موقع پر تن فراموشند: جسم کو بھولے ہوتے ہیں،
انہیں جان کی کوئی پروا نہیں ہوتی جنازہ بردوشند: کندھوں پر ان
(ستاروں) کا جنازہ اٹھائے ہوتے ہیں کشود: کھولا، اٹھایا
معاشراں: معاشرہ کی جمع، مرد ملت اسلامیہ کے افراد، مسلمان بلب رسید:
ہونٹوں پر آگئی

غزل-۵۴

۱-۵: دو دستہ تیغم: میں دونوں ہاتھوں سے چلانے والی تلوار ہوں برہنہ
ساخت: مراد نیام سے باہر کر دیا فساں کشید: سان پر چڑھایا، تیز کیا
آخت مرا: مجھے چلا دیا می ریزم: میں ڈالتا ہوں راوق: شراب کا
وہ برتن گداخت: پگھلا دیا/ ڈالا کشتیِ ادراک: عقل وخرد کی کشتی
مرشدانِ کہن: مراد پرانے اور ہر طرح کے علما اور حکما

غزل-۵۵

۱-۵: تپیدن: تڑپنا، گرم ہونا/ کرنا پریدن: اڑنا خوئے چکیدن: ٹپکنے کی
خصلت وعادت میل دمیدن: پھوٹنے یا طلوع ہونے کی رغبت تنک
مایگاں: تنک مایہ کی جمع، تھوڑے سرمائے والے یا کم حوصلہ لوگ شکیب
آزما: صبر کو آزمانے والا زخود رفتہ: خود کو بھولی ہوئی/ بھولا ہوا
دیدن: دیکھنا مقام نمود: مراد ہے اصل وجود صرف خالق کا ہے باقی انسان

اور کائنات کے وجود کا نام نمود ہے یعنی ظاہری طور پر ہے، حقیقتاً نہیں ہے، علامہ کے مطابق عشق و مستی کا مقام

غزل-۵۶

۱-۷: مردم آمیزی: عام لوگوں کے ساتھ گھلنا ملنا یا اٹھنا بیٹھنا دلیل نارسائی ہا: (نارسائی کی جمع) مراد منزل تک نہ پہنچنے کی دلیل تا کجا: کب تک چہرہ سائی ہا: چہرہ سائی کی جمع، چہرے یعنی ماتھے گھسانے یا رگڑنے بیاموز: سیکھ افتد: گر جائے گا کشیدم: میں نے کھینچا، الاپا، بلند کیا محرماں: محرم کی جمع، واقف حال می بالم: میں فخر/ ناز کرتا ہوں مشتری: گاہک نافرسودہ ماند: بے آبرو نہ ہوئی کم روائی: عام عمل دخل پا کوبیم: ہم پاؤں ماریں یعنی ہم ناچیں بحل کردند: حلال کیا گیا ہے گریز: بھاگ، داخل ہو کافرماجرائی: کافروں کے سے طور طریقے

غزل-۵۷

۱-۷: چوں: مانند سوزم: میں جلتا ہوں خیابان: کیاری (جدید فارسی میں بمعنی Road) جوانانِ عجم: غیر عرب ملکوں بالخصوص ایرانی نوجوانو جانِ من و جانِ شما: مجھے اپنی جان کی قسم اور تمہاری جان کی قسم گذشت: گذر گئی پرویں: ستاروں کا جھرمٹ، جسے ثریا بھی کہتے ہیں ریختم طرحِ حرم: میں نے حرم کی بنیاد رکھی سنانش: اس کی نوک فرو پیچیدمش: میں نے اسے اچھی طرح لپیٹ لیا آشفتہ: بکھرا ہوا، منتشر بدخشاں: وسط ایشیا کا ایک شہر جہاں کے لعل مشہور ہیں می رسد: پہنچتا ہے، آرہا ہے اے پیکرانِ آب و گل: اے پانی اور مٹی کے ڈھانچو، یعنی بے سوز جسم والے لوگو نیاگان: پرانے یا گذرے ہوئے بزرگ، اسلاف

غزل-۵۸

۱-۶: بادِ فرودیں: موسم بہار کی ہوا سرشکم: میرے آنسو خونابم: خونِ

نابم: میرا خالص خون بساتگین: پیالے میں بلند بال: اونچی پرواز کرنے والا کمیں کردند: گھات میں بیٹھے تازہ کاری ہا: نت نئے کام کرنا برافروختم: میں نے روشن کیا' جلایا نہاں: پوشیدہ دست کلیم: حضرت موسیٰ کے معجزے کا حوالہ' جب وہ اپنا ہاتھ آستین سے باہر نکالتے تو وہ روشن ہوتا یاری: مدد مطلب: مت مانگ' طلب نہ کر

غزل-۵۹

۱-۵: ندیداست: ندیدہ است' نہیں دیکھا ہے نخل: درخت برو: براو' اس پر پیر دیر: زمانے کا بوڑھا' ہزاروں برسوں سے چلا آنے والا زمانہ می نازد: فخر یا ناز کرتا ہے تاب: چمک یوسفے: کوئی یوسف' مراد جلوہ شرر شرر: مراد تھوڑی تھوڑی شعلہ شعلہ: مراد زیادہ سے زیادہ

غزل-۶۰

۱-۲: گذر افتاد: گذر ہوا ہے سار بانے: کوئی اونٹ ہانکنے والا یوسف: حضرت یوسفؑ' مراد سرفروش فرعون: فرعون اور حضرت موسیٰؑ کا ذکر آتا ہے لیکن یوسفؑ اور فرعون کا نہیں' دراصل مصر کے حکمرانوں کا لقب ہی فرعون تھا' یہاں مراد عزیز مصر ہے' ظالم حکمران بھی مراد ہو سکتی ہے

غزل-۶۱

۱-۷: افرنگ: مراد یورپ غم گساری: ہمدردی چنگ: پنجہ پشیماں شو: تو پچھتا' شرمندہ ہو بروں آوردن: باہر نکالنا بود و نابود: وجود/ ہستی اور نیستی/ عدم' نہ ہونا من ہستم: میرا وجود ہے' میں ہوں نیرنگ: عجیب بات بیم: خوف' ڈر محتسب: احتساب کرنے یا پکڑ دھکڑ کرنے والا' کوتوال لرزہ: کپکپی مزن: مت لگا' مت ڈال برآوردی: تو نے نکالے برگش: اس کے پتے برداشتن: اٹھا لینا ننگ: شرم کا باعث پردہ گرداند: پردہ سمجھے' سر یا راگ سمجھے چاک: پھاڑ' پھٹا ہوا ہم آہنگ:

آواز میں آواز یا سر میں سر ملانے والا

غزل-۶۲

ا-۶: خاور: مشرق افسونی: جادو کا اثر لینے والا مشو: مت ہو نیرزد: قیمت نہیں پاتا بجوے: ایک جو، معمولی سی دیرینہ: پرانا پرکاہ: گھاس کا تنکا، تنکا اسکندر و دارا و قباد و خسرو: یہ سب قدیم بادشاہوں کے نام ہیں، یہاں مراد بڑے بڑے حکمران یا بادشاہ انجمن آرا: محفل سجانے والی نگہدار: حفاظت کرنے والی بے ہمہ شو: سب سے الگ رہ باہمہ رو: سب کے ساتھ چل فروزندہ تر: زیادہ روشن مہر منیر: روشن اور روشنی دینے والا سورج زی: زندگی بسر کر رسانی: تو پہنچائے پرتو: روشنی اہرمناں: اہرمن کی جمع، شیطان باختہ ای: تو ہار گیا ہے نتواں کرد گرو: گروی نہیں رکھا جا سکتا تنک جامی: چھوٹا پیالہ ہونا بیاشام: پی

غزل-۶۳

ا-۵: پیدا: ظاہر یکے: ذرا، کچھ دیر کے لیے زن: لگا نگاہِ جلوہ بدمست: ایسی نگاہ جو جلوے میں پوری طرح مست و محو ہو می لغزد: پھسل جاتی یا ڈگمگا جاتی ہے درکش: کھینچ طناب: رسی، رسیاں مجاز: حقیقت کی ضد ایں خاکدانِ من: مراد میری یہ دنیا خوشتر: زیادہ اچھی زمانے: کبھی تو یابم: میں پاتا ہوں، پالیتا ہوں

غزل-۶۴

ا-۲: چمنے دارم: میں ایک چمن رکھتا ہوں، مجھ میں ایک چمن ہے سخنے دارم: مجھے کچھ کہنا ہے بہ: اچھی ہے کارے...... دارم: مجھے واسطہ پڑا ہوا ہے

غزل-۶۵

ا-۳: درونِ لالہ: گل لالہ کے اندر دیدم: میں نے دیکھا، میں نے جھانکا ہمہ:

سب، پوری طرح　　دمن: دامن، وادی　　تل: ٹیلا　　رم: چوکڑیاں بھرنا، دوڑنا　　غزالہ: ہرنی　　بلند و پست: اونچ اور نیچ، بلندی اور پستی

غزل-٦٦

:۱-۸ بیکرانے: یعنی بے کراں جس کا کوئی کنارہ نہ ہو، نہایت وسیع، لامحدود　　موجِ دخانے: دھوئیں کی لہر　　یک دو آنے: ایک دو پل کی، عارضی و فانی　　کم عیارے: کم عیار، کم قدر و قیمت والی　　نقد روانے: ایک چلتی رہنے والی نقدی　　مقامے: ایک مقام، مراد کچھ عرصہ ٹھہرنے کی جگہ　　زمانے: ایک زماں، کچھ عرصہ کے لیے　　چہ کارم: میں کس کام کا ہوں یا مجھے کیا کام ہے　　رہزن: لٹیرا، راہ مار، لٹیری　　زیانے: زیاں، نقصان　　فروزم: میں روشن/منور کرتا ہوں　　بسوزم: میں جلا دیتا ہوں

غزل-٦٧

:۱-۳ می غلتد: لڑھکتی ہے، لوٹ پوٹ ہوتی ہے　　خیزد: اٹھتے ہیں، پیدا ہوتے ہیں　　دل پر کالہ پر کالہ: ٹکڑے ٹکڑے ہوا دل　　فشاں: بکھیر، ڈال　　جرعہ: گھونٹ　　روید: اگتے ہیں　　چیست؟: کیا ہے　　سازد: بناتا ہے　　ہالہ: دائرہ، وہ دائرہ جو زمین کے بخارات کے باعث چاند کے گرد بنتا ہے۔

غزل-٦٨

:۱-۳ صورت گر: نقاش، مراد خالق کائنات　　رسید: پہنچا　　بنگہ: تاریک حجرہ　　بنہ: رکھ　　بسوداگری کشید: سوداگری کے لیے لا رکھا ہے　　تواں خرید: خریدے جا سکتے ہیں

غزل-٦٩

:۱-۵ نرگس طناز: شوخ اور بیباک نرگس (نرگس کے پھول کو آنکھ سے تشبیہ دی جاتی ہے)　　پیدا نبود: ظاہر یا نمایاں نہ تھی　　کالائے: کوئی ساز و سامان

در میناش: اس کی صراحی میں باده پیمائے: کوئی شراب پینے والا برق سینا: طور سینا کی بجلی، وادی سینا جہاں حضرت موسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ کا جلوہ نظر آیا تھا، وہ اس کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو گئے تھے اور سینا کا پہاڑ جل گیا تھا (قرآنی تلمیح) شکوہ سنج: شکوہ کرنے والی وادی ایمن: جہاں طور کا پہاڑ ہے

غزل-۷۱

۱-۷: کہ بست: کس نے باندھا، یعنی پیدا کیا دیرِ دیر پائے: مدتوں سے موجود مندر 'یہ دنیا زناریاں: زناری کی جمع' پجاری، دنیا دار لوگ نالندہ: فریاد کرنے والے ہم چو: مانند، مثل، کی طرح کند دوتائے: دہری کر دیتے ہیں، جھکا دیتے ہیں فزوں شود: بڑھ جاتا ہے سیمیائے: نظر فریب جادو نمی رود: نہیں چلتی عربدہ: جھگڑا، لڑائی، شکوہ و شکایت ناخدائے: ایک یا کوئی ملاح مپرس: مت پوچھ در ساختم: میں نے موافقت کر لی گذشتم: میں گذر گیا آمیختم: میں نے ملا دیا گشتم: میں گھوما پھرا نانہادہ پائے: پاؤں نہ رکھتے ہوئے بکاخ: محل میں

غزل-۷۲

۱-۵: راغ: سبزہ زار بوئے پریشیدہ: منتشر یا پریشان پھرنے والی خوشبو نیستیم: ہم نہیں ہیں مائیم: ہم وہ ہیں آنچہ: جو کچھ ایاغ: پیالہ، جام نتواں خورد: نہیں پیا جا سکتا شناختن: پہچاننا کشائے: کھول مجو: مت تلاش کر سوختن: جلنا فراغ: فراغت، آسودگی

غزل-۷۳

۱-۵: امام: رہنما، پیشوا آسودہ: سکون و اطمینان سے تھی ہنگامہ: مراد رونق نواہا زد: اس نے آوازیں نکالیں یا پیدا کیں تا چند: کب تک دوام: بقا، ہمیشہ رہنا، فانی یا فنا کی ضد دریاب: پالے، سمجھ لے

غزل-۷۴

۲-۱: کم سخن: نہ بولنے والا/والی داشت: رکھتا تھا ریحان: نرم اور خوشبودار گھاس غم دم سازے: کسی ایسے ساتھی یا دوست جو ہمدردی یا غمگساری کرے تکیہ....کرد: بھروسا کیا

غزل-۷۵

۶-۱: نماندہ: نہیں رہے زیروبم: نچلے اونچے سر/راگ توفیقِ رم: دوڑنے یا حرکت کی توفیق آرمیدند: انہوں نے آرام کیا بیاض: چھوٹی کاپی' نوٹ بک خامہ: قلم تابِ رقم: لکھنے کی طاقت سیارہ ہا: گردش کرنے والے ستارے

گلشن رازِ جدید

= یہ مثنوی علامہ نے مشہور بزرگ صوفی شیخ محمود شبستری کی مشہور مثنوی ''گلشن راز'' کے جواب میں کہی ہے۔ محمود کا تعلق تبریز کے قریب ایک مقام شبستر سے تھا۔ لقب سعدالدین نجم الدین تھا۔ سال ولادت ۱۲۵۰ء اور سال وفات ۷۲۰ھ (۱۳۲۰ء) ہے۔ گلشن راز محمودؒ سے پوچھے گئے پندرہ سوالات کا مثنوی کی صورت میں جواب ہے۔ اس مثنوی کی کئی ایک زبانوں میں شرحیں لکھی گئی ہیں۔ مولانا جامیؒ کے بقول انہوں نے کوئی اٹھائیس شرحیں دیکھی ہیں۔ اس مثنوی کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

بنامِ آنکہ جاں را فکرت آموخت
چراغِ دل بنورِ جاں بر افروخت

''گلشن راز'' میں تصوف کے اسرار و رموز سے بحث ہے۔ علامہ نے اس مثنوی کے نو سوال ''گلشن راز جدید'' میں لے کر ان کے جواب اپنے انداز میں دیئے ہیں۔

۲-۱: سوادِ دیدۂ تو: تیری آنکھ کی پتلی آفریدہ ام من: میں نے پیدا کر دی ہے نہاں: پوشیدہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گلشنِ رازِ جدید

تمہید

۱-۹: سوزِ کہن: پرانا سوز (پرانے جوش اور جذبے) جانِ خاور: مشرق یعنی مشرق کے مسلمانوں کی جان دمش وامانده: اس کی سانس تھک گئی ہے نفس: سانس زیست: زندگی گذاری، مراد زندہ ہے مدعا: آرزو بیگانہ گردید: بے خبر یا غافل ہو گیا نامہ محمود: مراد محمود شبستری کی مثنوی (گلشن راز) زعہدِ شیخ: شیخ محمود شبستری کے زمانے سے آرمیدیم: ہم آرام کرتے رہے، ہم سوئے رہے رست: اگیں، پیدا ہوئیں کشتِ چنگیز: چنگیز کی کھیتی، اشارہ ہے منگول سردار چنگیز کے قیامت خیز قتل و غارت کا، چنگیز نے ۶۱۶ھ (۱۲۱۹ء) میں ایران پر حملہ کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی اور ایسا قتل عام کیا کہ تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی، معاصر کتب تاریخ کے مطابق اس نے اس وقت کے ایران کے حکمران سلطان علاء الدین خوارزم شاہ کے پاس اپنے چند تاجر اس پیغام کے ساتھ بھیجے تھے کہ تاجر معموریِ خزانہ کا باعث ہوتے ہیں۔ امید ہے تم بھی جواب میں اپنے تاجر بھیجو گے۔ جب وہ تاجر سرحد/ بارڈر اترار پر پہنچے تو وہاں کے حاکم نے ان کا مال لوٹ کر انہیں قتل کر دیا۔ کوئی ایک بچ کر واپس چلا گیا یا کسی طرح چنگیز کو خبر ہو گئی، اس نے سلطان کے پاس ایلچی بھیجا کہ اترار کے حاکم کو میرے سپرد کرو۔ سلطان نے اس ایلچی کو قتل کر دیا جس پر چنگیز نے یہ قیامت خیز حملہ کیا کشودم: میں نے کھولا، میں نے اٹھا دیا۔

۱۰-۲۰: نہ پنداری: تو یہ نہ سمجھ لینا افسانہ بستم: میں نے افسانے گھڑے ہیں، میں نے خیالی باتیں کی ہیں مردِ فرودست: گھٹیا یا پست آدمی ہم داستانم: میں ہم زبان ہوں فرِ شاہنشہی: شاہانہ شان و شوکت نہ گنجم: میں نہیں سماتا زجاج: شیشہ بلرزد: کانپتا ہے یم افکارِ من: میرے افکار کا سمندر

نہ ورزد: اختیار نہیں کرتا یعنی بیکنار ہے بغل پروردہ ٔمن: میری آغوش کی پالی ہوئیں گزیدم: میں نے اختیار کی آفریدم: میں نے پیدا کیا عارناید: شرم محسوس نہیں ہوتی عطار: مشہور فارسی صوفی شاعر فرید الدین عطار، اصل نام محمد، لقب فرید الدین اور عطار تخلص، ولادت نیشاپور کے گاؤں شادباغ میں، ولادت ۵۱۳ ھ/ ۱۱۱۹ء، ۲۶ اپریل ۱۲۳۰ء کو شہید ہوئے، بہت بڑے صوفی اور مشہور مثنویوں منطق الطیر، پند نامہ، الٰہی نامہ اور نثر میں تذکرۃ الاولیا کے شاعر و مصنف تھے۔

۲۱-۲۶: رزم: جنگ، لڑائی باندامِ تو: تیرے جسم میں دمیدم: میں نے پھونکی/ ڈالی بیفروز: روشن کر، جلا کشتند: انہوں نے یعنی قضا و قدر کے کارکنوں (قدرت) نے بویا انگبیں: شہد آزمودم: میں نے آزمایا قسمت نمودم: میں نے تقسیم کر دیا، بانٹ دیا

۲۷-۳۱: خواند: پڑھے، پڑھیں نورِ ناب: خالص نور، جس سے فرشتوں کی تخلیق ہوئی ہے فشاند: جھاڑ دے/ دیں بنالد: فریاد کرے/ کریں، روئیں گذشتم: میں (جبرئیل) گذر گیا، میں نے چھوڑا

سوال (۱)

۱-۲: نخست: پہلے در تحیر: حیرت میں، حیرانی میں گویندش: اسے کہا جاتا ہے تفکر: غور و فکر کدامیں: کون سی/ سا چرا: کیوں، کس لیے

جواب

۱-۱۰: غیب: سامنے نہ ہونا، ظہور کی ضد ظہور: ظاہر ہونا ثابت سیارہ: (وہ نور) جو سکون میں بھی ہے اور حرکت میں بھی نارش: اس کی آگ برہان: دلیل، حجت جاں فروزے: جان یا روح کو منور کرنے والا سینہ تابے: سینے میں حرارت و گرمی پیدا کرنے والا نیرزد: قیمت نہیں رکھتا شمار: گنتی جوینده: تلاش کرنے والا یابندہ: پا لینے والا واماندہ: تھکا ہوا چوب کلیمؑ: حضرت موسیٰؑ کا عصا جسے وہ دریا میں مارتے تو دریا خشک

ہو جاتا یعنی آدھا ایک طرف اور آدھا ایک طرف تاکہ انہیں گذرنے کا راستہ مل جائے

۱۱-۱۹: ظلمت: تاریکی صور: وہ بگل جو قیامت کے روز اسرافیل بجائیں گے نمودے: ظاہر ہونے کی حالت، وجود کشود: مراد کشمکش ناشکیب: بے صبر، بے قرار بربند: بند کرلے آفریند: تخلیق کرتا ہے قعر: گہرائی پذیرد: قبول کرتا یعنی اختیار کرلیتا ہے غواص: غوطہ خور بتدریج: درجہ بدرجہ یزداں فریب: مراد خدا کی پسندیدہ

۲۰-۲۶: براندازد: پھینکتی ہے صیاد: شکاری ماسوا: اللہ کے سوا جو کچھ ہے، باطل قوتیں فشارد: دبا دیتی ہے کمند تابدارش: اس کی چمکدار یا بل کھائی ہوئی کمند میرد: مرجائے گا منہ: مت رکھ زیری: تو نیچے یعنی کمزور و ناتواں ہے زبر شو: طاقت والا بن جا خودگیری: اپنی معرفت حاصل کرنے کا عمل طاق: کامل، ماہر، لاثانی

۲۷-۳۴: خنک روزے: مبارک ہے وہ دن شگافی: تو پھاڑے، چیر لے نُہ: نو (۹) گذارد: یعنی ادا کرے گا پیچی: تو لپیٹے گا فزونش: اس کا زیادہ دل نہ بستن: دل نہ لگانا فرورفتن: کھب جانا، دھنس جانا شعیرش: اس کا جو کو: کہ او، کہ وہ توام: جڑواں

سوال (۲)

= علمش: اس کا علم ساحل آمد: ساحل ٹھہرایا قرار پایا ہے قعر: گہرائی

جواب

۱=۱۰: پرنفس: سانسوں بھری آگہی: آگاہی، واقفیت کرانے: کنارہ ہے یا کنارے ہیں ژرف: بہت گہرا مپرس: مت پوچھ بروں جست: باہر کو اچھلی ہوئی ہے لذت کیف و کے: مراد ہر قسم کے اسرار و احوال کو دیکھنے کی لذت درحضورش: اس کے حضور میں صحبت ناپذیر: صحبت قبول یا پسند نہ کرنے والی مستنیر: روشن، منور نخستیں: پہلے می

نماید: کرتی ہے اسیرش: اسے قید' اسے مقید' اسے پابند کشودش: اس کا (نقاب) کھولا یا اٹھایا نطق: زبان عریاں تر: زیادہ ظاہر نگنجد: نہیں سماتی دیرِ مکافات: ایسی دنیا یعنی یہ دنیا جہاں ہر کام یا چیز کا بدلہ ہے

۱۱-۲۳: یم: سمندر وابستۂ ما: ہم سے وابستہ ہے' یعنی ہم سے الگ نہیں ہے ممنونِ نگاہے: ایک نگاہ کا احسان مند فربہی: موٹاپا دیدن: دیکھنا رستہ: اگا ہے بالیدن: نشوونما سے بڑھنے پھولنے کی کیفیت' اگنا حدیث: بات ناظر: دیکھنے والا' مراد حق بیں نگاہ سے دیکھنے والا منظور: دیکھا گیا' مشہود' نگاہ حق سے جس کا مطالعہ کیا جائے گرداں: کردے بودن: ہونا نبودن: نہ ہونا ادب کن: مراد مستفید ہو' ادب کر خواستند: انہوں (شیروں) نے چاہی یاری: مدد' فائدہ مور: چیونٹی

۲۴-۲۸: بسیاری: کثرت' بہت سی اشیا کشا: کھول' مشاہدہ کر دریابی: پالے' کر لے احد: ایک' واحد' خدائے واحد نصیب خود: اپنا حصہ کنعاں: حضرت یعقوبؑ کا شہر جہاں انہیں حضرت یوسفؑ کے بھیجے ہوئے پیرہن سے (جو انہوں نے مصر سے بھیجا تھا) ان کی خوشبو پہنچی تھی یمن: وہ شہر جہاں حضرت اویس قرنی کو حضور اکرمؐ کے کرتے کی خوشبو پہنچی تھی نکہت: خوشبو (کاف کے ساتھ صحیح اور گاف کے ساتھ غلط ہے۔ زبور میں غلط چھپا ہے) نخچیرش: اس کا شکار زن: مار' لگا' پھینک شبخون: رات کو کیا جانے والا اچانک حملہ

سوال (۳)

= ممکن: جو خدا کا غیر ہے واجب: خدا کی ذات بُعد: دوری چیست: کیا ہے

جواب

۱-۱۵: جہانِ چون و چند: کتنا اور کیسا کا یا نفع ونقصان کا جہان' یہ دنیا کیف وکم: وہی

کیسا اور کتنا جہانِ طوسی: طوسی کی دنیا' مراد نصیر الدین طوسی جو چنگیزی حملوں (ساتویں صدی ہجری) کے زمانے کا ایک فلسفی، ریاضی دان، محقق اور ستارہ شناس تھا اقلیدس: قدیم زمانے کا علم ہندسہ و ریاضی کا ماہر و عالم عقل زمیں فرسا: زمین گھسانے والی یا زمین گھساتی ہوئی عقل اعتباری: مراد فرضی، وہ شے/ بات جو ذہن فرض کرے یا جس کا گمان ہو زہ کن: چلہ چڑھا آماج: نشانہ دریاب: پالے' پہچان لے معراج: بلندی' مراد حضور اکرمؐ کا واقعہ معراج شریف مجو: مت تلاش کر مطلق: وجودِ مطلق' اللہ تعالیٰ کا وجود نور السموات: آسمانوں کا نور مگو: مت کہہ کران: انتہا وسعت پذیر: وسعت اختیار کرنے والا' آگے بڑھنے والا ناسازگار: ناموافق' جسے نہ پایا جا سکے یکی: اکائی جو تقسیم نہیں ہوتی' غیر منقسم لنگ: لنگڑی' لنگڑا دوست دارد: پسند کرتی ہے مغز: مراد باطن پوست: کھال' مراد ظاہر ثابت: ساکن سیارہ: حرکت میں رہنے والا تمیز: فرق' امتیاز طرح..ریخت: بنیاد ڈالی زنارے: ایک زنار' زنار ہندوؤں کا مقدس دھاگا مہ: ماہ' مہینہ آفریدم: میں نے پیدا کر لیے مہ و سالت: تیرا مہینہ اور سال نمی ارزد: قیمت نہیں پاتا/ پاتے کم لبثتم: قرآنی تلمیح' قیامت کے روز خدا تعالیٰ گنہگاروں سے پوچھے گا کہ تم دنیا میں کتنے سال رہے' وہ کہیں گے ہم ایک دن یا چند گھنٹے رہے (سورہ المومنون' آیات ۱۱۲-۱۱۳) بخود رس: خود تک رسائی حاصل کر' اپنے اندر محو ہو' اپنی معرفت حاصل کر فروریز: نیچے ڈال' یعنی اندر ڈال

۱۶-۱۹: دوتا: دو عدد' دو کلام است: مراد ٹھیک نہیں ہے دیدن: دیکھنا عروسِ معنی: جان/ روح کی دلہن حنابست: مہندی لگائی پیرایہ ہا: لباس' کئی لباس پردہ باف: پردہ بننے والی رمز: گہری اور باریک بات

۲۰-۲۴: کلیسا: گرجا سبحۂ پطرس: پطرس کی تسبیح یا مالا' حضرت عیسیٰ کا ایک حواری جو پہلے شمعون انطاکیہ کا بشپ/ پوپ مقرر ہوا' بعد میں روم چلا گیا جہاں اسے سولی پر چڑھایا گیا' عیسائی فرقہ رومن کیتھولک کے لوگ اسے پوپ کہتے ہیں شمارد: گنتی ہے' جپتی ہے ہم سفر کن: ہم سفر بنا' ساتھ چلنے والی بنا ملت ترکان:

ترکوں کی قوم، مصطفیٰ اتاترک کے زمانے میں ترک حکومت نے یورپ والوں کی پیروی کی تھی   از خود رمیدند: مطلب اپنے آپ سے دور ہو گئے

۲۵-۳۷: کہین دیرے: وہ پرانا مندر یعنی یہ دنیا   ید موسیٰؑ: حضرت موسیٰؑ کا ید بیضا، جب وہ آستین سے باہر نکالتے تو وہ روشن ہوتا (قرآنی تلمیح)   دمِ عیسیٰؑ: حضرت عیسیٰؑ کا معجزہ، جس مردے پر وہ دم پھونکتے وہ زندہ ہو جاتا   تپید است: تڑپا ہے   رازی: مراد امام فخر الدین رازی، مشہور فلسفی   طوسی: نصیر الدین طوسی، مشہور فلسفی   ارسطو: مشہور یونانی فلسفی اور سکندر اعظم/رومی کا استاد جس نے سکندر کے ایما پر علم منطق سب سے پہلے ترتیب دیا تھا، وہ واجب الوجود کو علت قرار دیکر اس سے معلولات (علت دیئے گئے) کے ظہور کا قائل ہے، اس کے طریقہ کو طریقہ استخراجی کہتے ہیں   بیکن: ایک مشہور فلسفی جو ارسطو کے برعکس معلولات سے علت کا یعنی واجب الوجود کا پتا چلاتا ہے، اس کے طریقے کو طریقہ استقرائی کہا جاتا ہے   شناسد: پہچانتی ہے   مکیں کن: ساکن کر دے، تسخیر کر   بیاموز: سیکھ   رہاں: رہا کر   یمیں: دایاں یسار: بایاں، جہت، طرف مراد ہے

سوال (۴)

۱-۲: قدیم: پرانا، مراد خدا   محدث: جدید، نیا یا تازہ پیدا شدہ، جس کا سنت و کتاب (قرآن) میں کوئی ذکر نہ ہو، مراد ممکن الوجود   معروف: جانا گیا، جس کی معرفت حاصل کی جائے   عارف: معرفت حاصل کرنے والا   سودا: جنون، دیوانگی، مراد عشق   مشت خاک: انسان

جواب

۱-۱۲: ایجادِ غیر: اپنا غیر پیدا کرنا   خیر: اچھی بات   دمادم: مسلسل، پیہم طلسم: جادو   می شماریم: ہم گنتے رہتے ہیں   ہست: جو ہے   بود: جو تھا باشد: جو ہوگا   بریدن: مراد الگ یا جدا کرنا   تپیدن: تڑپنا، بے قرار ہونا   نارسیدن: نہ پہنچنا   عیارے: کوئی معیار یا قدر و قیمت   بخشد:

عطا کرتی ہے   پاینده ایم: ہم ہمیشہ رہنے والے ہیں   دوام: ہمیشگی، بقا
بودن: ہونا   دیده ور: نظارے کرنے والی

۱۳-۲۳: بنگر: دیکھ   ناپید: ظاہر نہیں ہے، وجود نہیں ہے   کاخ: محل   می نوازد: بجاتا ہے   تراشیم: ہم تراشتے یا بناتے ہیں   نادیده: ان دیکھے
پاشیم: ہم بکھیرتے یعنی کرتے ہیں   دریدیم: ہم نے پھاڑ ڈالا   تابناک: روشن، منور   نالد: روتا ہے، گریہ وزاری کرتا ہے   ببالد: بڑھ رہا، پھل پھول رہا ہے   سلک سلک: لڑی لڑی یعنی موتیوں کی بہت سی لڑیاں، ہار   ثمر برد: پھل لے گیا   نخل ماتمے: ماتمی درخت، ایران میں کبھی رواج تھا کہ مردے کے تابوت کے چاروں کونوں پر سرو کے درخت بنا دیتے تھے، انہیں نخل ماتم کہا جاتا تھا

۲۴-۳۰: بستن: باندھنا   درگذشتن: گذر جانا   نہایات: نہایت کی جمع، حد، انتہا
براہش: اس کے راستے میں   فروغ: روشنی، تجلی   افتد: پڑتے ہیں
بپایاں کے رسد: کیسے طے ہوگا   جولان گہ: جولان گاہ: دوڑنے کی جگہ، میدانِ سفر   زی: جی، زندہ رہ، زندگی بسر کر   میر: مر، مرجا   فراگیر: یعنی مسخر کر   درگیری: تو پکڑ لے، خود میں لے لے   گنجد: سماتی ہے، سمائے
عینِ خود بودن: اپنی انفرادیت اور شخصیت برقرار رکھنا

سوال (۵)

=   کہ من باشم: میں کون ہوں   خبر کن: بتا

جواب

۱-۱۴: حفظ: تحفظ، حفاظت   نخستیں: پہلا   خوابِ خوش: میٹھی نیند، گہری نیند
یکی: ایک، وحدت، اکائی   بسیار: کثرت   نمود: ظہور، وجود   کشود: ظہور
ناپیدا کنارے: جس کا کوئی کنارہ نہ ہو، بے حد وسیع، لامحدود   سروبرگ: ساز وسامان، مراد حوصلہ   شکیبائی: صبر وقرار   افراد: فرد کی جمع، مراد مختلف صورتیں   پیدائی: ظہور   زِخود نارفتہ بیروں: یعنی اپنے مقام پر برقرار رہ کر

بخود پیچیدنِ او: اس کا خود سے لپٹنا پے سپر: پاؤں میں مسلی ہوئی
بالیدن: اگنا' ابھرنا' باہر آنا درجست وخیز: اچھل کود میں' مراد حرکت وعمل
میں بہ آیینے کہ: اس طور/ طرح کہ ستیز: لڑائی' جنگ آئینہ فامے:
آئینے کا رنگ' پرنور نریزد: نہیں ٹپکتا نخیزد: نہیں ابھرتا پرتو: عکس'
نور زواو: اس کا دریا/ سمندر خاور: مشرق' آفتاب

۱۵-۳۰: زادن: پیدا ہونا بے اب و مام: باپ اور ماں کے بغیر گرفتن: پکڑنا
ابد بردن: ہمیشہ کے لیے لے جانا ستردن: مٹانا زدن: لگانا
زدن چاکے: پھاڑ دینا شکستن: توڑنا شگافیدن: دو ٹکڑے کر دینا' شگاف
ڈالنا بازآمدن: واپس آنا' لوٹنا سفال: ٹھیکرا طلسم: جادو توش و
تابش: اس کی قوت وطاقت انا عرضنا: قرآنی تلمیح' سورہ الاحزاب آیت ۷۲:
''ہم نے یہ امانت آسمان وزمین کے سامنے پیش کی تھی' سو انہوں نے اس کی ذمہ
داری سے (اٹھانے سے) انکار کر دیا اور انسان نے اٹھا لیا بیشک وہ ظلوم وجہول
(ظالم وجاہل) ہے لرزہ: کپکپی' کانپنے کی حالت فر: شان وشوکت
بر: پہلو نہاد: بنیاد چسان: کیسا' کیا شے مشو: مت ہو

سوال (۶)

= فزوں: افزوں' زیادہ' بڑھ کر جستن: تلاش کرنا چون است: کیونکر
ہے' کیا ہے

جواب

۱-۱۴: افتد: گرتی ہے خیزد: اٹھے خودنگر: یعنی اپنی معرفت حاصل کرنے والی
کیست: کون ہے بے بالی: پر نہ ہونے' پروں کے بغیر ہونا پروازگر:
پرواز کرنے والا/ والی ظلمت: تاریکی نطقے دل آویزے: دل کو
لبھانے والی زبان یا بولنے کی قوت قعر: گہرائی برآرد: نکالتی یا نکال لاتی
ہے چہ می پرسی: تو یہ کیا پوچھتا ہے چہ گون است: کس طرح کی ہے
نہاد: سرشت' فطرت سلطانِ بدر: بدر کے سلطان' یعنی حضور اکرمؐ حضورؐ نے

بدر کے مقام پر کفار کو پہلی شکست دی اور یوں اسلام کی بنیاد رکھی جان آفرین: جان پیدا کرنے والا، خدائے خالق حدیثے: ایک یا کوئی بات قدم زد: قدم رکھا، یعنی چلی

۱۵-۱۹: فشاند: جھاڑ دیتی ہے راند: ہانکتی ہے چوں ناقہ: اونٹنی کی طرح نگردد: گردش نہیں کرتا بے رخصتِ او: اس کی اجازت کے بغیر نہ تابد: نہیں چمکتا روزِ مضمرش: اس کا چھپا ہوا/ پوشیدہ دن نوریاں: نوری کی جمع، فرشتے تاکش: اس کی انگور کی بیل عیارِ خویش: اپنا معیار، قدر و منزلت

۲۰-۲۶: جستجویش: اس کی تلاش فرو آرد: اپنے اندر سمو لیتی/ لیتا ہے برابد زن: ابد پر لگا، ابدی کر لے حواس: مراد حواس خمسہ، پانچ حواس، لامسہ (چھونے کی قوت) سامعہ (سننے کی قوت) باصرہ (دیکھنے کی قوت) ناطقہ (بولنے کی قوت) اور شامہ (سونگھنے کی قوت) آید متاعے: متاع یا دولت ملتی ہے/ حاصل ہوتی ہے میرد: مر جاتی ہے سوزنِ ساعت: گھڑی کی سوئی تراشد: تراشتا ہے، پیدا کرتا ہے چیند: چنتا ہے

۲۷-۳۴: ممکناتش: اپنے ممکنات، اپنی پوشیدہ صلاحیتیں، وہ کام جو اس سے ہو سکیں وانماید: ظاہر کرے وابیند: واضح طور پر دیکھا جا سکے آنی و فانی: وقتی/ عارضی اور فانی لرزد: کانپتا ہے برفتادن: چھوڑ دینا، ترک کر دینا بریدن: پھاڑنا، مراد پہننا در کمیں: گھات میں بترس: ڈر نکیر و منکر: وہ دو فرشتے جو قبر میں مردے کا حساب کتاب لیتے ہیں در برتو: تیرے پہلو میں ہیں ظرف: برتن، حوصلہ، صلاحیت

سوال (۷)

=: کدام: کون چون بود: کیسا ہوتا ہے کرا: کس کو، کسے مردِ تمام: مردِ کامل

جواب

۱-۱۷: کشائی: تو کھولے حضر: سفر کی ضد، وطن میں قیام، قیام، ایک جگہ ٹھہرنے یا مقیم

رہنے کی حالت　ما کجائیم: ہم کہاں ہیں　نیائیم: ہم نہیں آتے
مجو: مت تلاش کر　پایاں: اختتام، حد　تارسی: تو پہنچے گا　پنداری: تو سمجھے　خامیم: ہم خام یا ناقص ہیں　تابمہ: چاند تک　بخود پیچیم: ہم خود پر لپٹتے ہیں　باش: رہ　رستن: (ر پر زبر) نجات پانا، آزاد ہونا
جہات: جہت کی جمع، طرفیں　گزینی: (گ پر پیش) تو اختیار کرے
''من یرانی'': حدیث رسول اکرمؐ جس نے مجھے خواب میں دیکھا، اس نے گویا حق کو دیکھ لیا　مژہ برہم مزن: پلکوں یا نگاہ کو الٹ پلٹ نہ کر　مشو: مت ہو
ناپید: جس کا وجود نہ ہو　تابد: چمکے　حریم: چاردیواری، گھر　می سوز: جلتا رہ، جل　برافروز: چمکا　دید: دیکھا، مراد جلوہ محبوب کا مشاہدہ کیا

۱۸-۳۱: نیابی: تو نہ پائے　خیز: اٹھ　درآویز: چمٹ جا، لپٹ جا　مدہ دست: ہاتھ (میں ہاتھ) نہ دے　مرو: مت جا/ چل　شست: مچھلی پکڑنے کا کانٹا　ما کوریم: ہم نابینا/ اندھے ہیں　دمد: پھوٹتی ہے، پیدا ہوتی ہے　بن مویش: بال کی جڑ　آئین جمہوری نہاد: جمہوریت طرز کا آئین، جسے زیادہ ووٹ ملیں وہ گویا حق پر ہے خواہ وہ صریحاً باطل ہی کیوں نہ ہو　رسن: رسی　دیوے: ایک دیو، مراد شیطان　اے: بے، بغیر (شعری ضرورت کے تحت الف زاید لگایا ہے)　کشت ویرانے: ایک ویران کھیتی، جس میں کوئی فصل نہ اگی ہو　نکوتر: زیادہ اچھی　رہ زن: راہ مار، لٹیرا　درتگ وتاز: بھاگ دوڑ میں، دوڑ دھوپ میں　خوابید: سوگئی　مردم دری: انسانوں کو پھاڑنا، مراد انسانوں کو شدید اذیتیں پہنچانا　می ستاند: لیتی ہے، مارتی ہے　نہ ماند: نہیں رہتی

سوال (۸)

= کدامیں: کون سا/ سی　انا الحق: میں حق/ خدا ہوں (۲۴۴ھ/ ۸۵۸ء-۹۲۲ء) مشہور صوفی حسین بن منصور جنہوں نے ''انا الحق'' کا نعرہ لگایا، وہ وحدت الوجود کے قائل تھے۔ علما کے فتوے پر انہیں سولی پر چڑھا دیا گیا　ہرزہ: فضول　رمز: راز، بھید

جواب

ا-۷: بازگویم: دہراتا ہوں' بات کرتا ہوں فریب خورد: دھوکا کھایا خفت: سو گیا خوابش: اس کی نیند سیر: حرکت نکتہ بیں: گہری باتوں کو دیکھنے والی تصدیق: سچ اور درست ہونے کا یقین

۸-۱۵: فروغ: روشنی یعنی ترقی کیف وکم: کیسا اور کتنا' تمام حالات و اسرار تواں گفتن: کہا جا سکتا ہے بے چگونے: بے چگون' جس کی کوئی مثل نہ ہو' لاثانی خدا روزش: اس کا دن دورِ فلک: آسمان کی گردش خود بینی: خود کو دیکھنے کا عمل' خود کا نظارہ/ تماشا کرنا تخمین: اندازہ

۱۶-۲۷: نمودش: اس کا ظہور/ وجود کیست: کون ہے یکے: ذرا' ایک پل حجت: دلیل اندیش: سوچ' غور کر دریاب: پالے' سمجھ لے مپندار: مت سمجھ بداں: جان' سمجھ عین: پوری طرح' ٹھیک ٹھیک' بالکل تیز بالے: ایک یا کوئی تیز بازو/ پر می تواں داد: دیا جا سکتا ہے' دیے جا سکتے ہیں تپید لایزالے: ایسی تڑپ جسے زوال نہ ہو جانِ مستعارے: ادھار مانگی ہوئی جان' فانی جان ہیچ: کچھ بھی نہیں ہے دوام: ہمیشگی' ہمیشہ رہنا یا ہونا شنکر: برصغیر ہند کا ہندو حکیم و فلسفی شنکراچاریا (آٹھویں صدی عیسوی کے ربع چہارم (یعنی ۷۷۵ تا ۸۰۰ء کے درمیان) سے ۸۲۰ء تک زندہ رہا' وہ ''ہمہ اوست'' (خدا ہی سب کچھ ہے) کے نظریہ کا مفسر ہے۔ اس کے مطابق کثرت کا اپنا کوئی وجود نہیں بلکہ کثرت میں وحدت کے ظہور سے وجود پیدا ہوا ہے' لہٰذا حقیقت' وحدت ہی ہے منصور: یعنی حسین بن منصور (ذکر آ چکا ہے) جوے: تو تلاش کر گوے: تو کہہ صدیق: تصدیق کرنے والا

سوال (۹)

= کہ شد: کون ہوا چہ: کون سی چیز

جواب

۱-۷: ته گردوں: آسمان کے نیچے   زود میر: جلد مر جانے والے' جلد فنا یا غروب ہو جاتے ہیں   کواکب: کوکب کی جمع' ستارے   پرد: اڑتے ہیں   ریگ روانے: اڑتی ہوئی ریت' صحراؤں میں تیز ہواؤں کے باعث ریت کے تودوں/ ڈھیروں کی جگہ بدلتی رہتی ہے   نماند: نہیں رہتا   دمے: کچھ دیر   نشنیدہ: سنے بغیر' جو آواز سنی نہ جائے   ناجستہ: اچھلے بغیر' مراد نہ نکلنے والا   مپرس: مت پوچھ   عالمگیری مرگ: موت کا دنیا کی ہر شے کو اپنی گرفت میں رکھنا

غزل

۱-۵: کردند: مراد قدرت نے کیا   مرگِ ناگہاں: اچانک کی موت   خوے رم: دور بھاگنے کی عادت' دور ہونے کی عادت   آموخت: سیکھی   رام کردند: قضا و قدر نے مطیع یا گرفتار کر لیا   چہ می جوئی: تو کیا تلاش کرتا ہے   قرار: چین' یہاں مراد ابد' بقا

دوسرا بند

۱-۵: مقام آفلین: ڈوب جانے والا یا غروب ہو جانے والا مقام' قرآنی تلمیح' حضرت ابراہیمؑ کا ستاروں کو چاند وغیرہ کو اپنا خدا کہنا' ان کے ڈوبنے پر یہ فرمانا' میں غروب ہونے یا ڈوبنے والوں سے محبت نہیں کرتا   غربت سرا: یعنی ایسی جگہ جہاں انسان مسافر کی طرح آ کر کچھ عرصے بعد اپنے اصلی وطن (آخرت) کو لوٹ جاتا ہے   غم بے حاصلے: ایسا غم جس سے کچھ ہاتھ نہ لگے' کچھ حاصل نہ ہو   می تواں کرد: کیا جا سکتا ہے   تواں سوخت: جلایا جا سکتا ہے   بسوزن: سوئی سے   می تواں دوخت: سیا جا سکتا ہے

۶-۱۳: کہ: کس نے   زد: لگایا' گرایا' گرائی   بسرزد: سر پر مارا' توڑ دیا   الست: قرآنی تلمیح' کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟   بلیٰ: ہاں' روحوں کا جواب

میں ہاں کہنا   برافروخت: روشن کی، جلائی   گرداں: گردش میں ہے
می کارم: میں بوتا ہوں

خاتمہ

۱-۶:   کام: حلق، مراد خول   بہ برگیر: پہلو میں پکڑ، تسخیر کر   ید بیضا: روشن ہاتھ، حضرت موسیٰؑ کا معجزہ   کشت: بویا   درو داست: کاٹا ہے   رومی: مولانا جلال الدین رومیؒ   بیفروز: روشن کر   ممکنات: ایسے کام یا عمل جو انسان کر سکے

بندگی نامہ

(مطلب: غلامی سے متعلق نظمیں)

۱-۱۳:   مہ گیتی فروز: زمانے/ دنیا کو روشن کرنے والا چاند   تاب: چمک، روشنی   یادِ ایامے کہ: مجھے وہ دن یاد ہیں   بے لیل و نہار: رات اور دن کے بغیر   سوادِ من: میری حدود   نہاد: فطرت، سرشت   آئینہ پوش: یعنی روشن تھیں/ تھے   خروش: شور، یہاں مراد مدو جزر جو چاند کے بڑھنے گھٹنے سے سمندر میں پیدا ہوتا ہے   وائے: افسوس ہے   تافتن: چمکنا، روشن ہونا   آموختم: میں نے سیکھا   خاکدانے: مراد دنیا یا زمین   افروختم: میں نے روشن کیا   بے فراغ: سکون و اطمینان سے خالی   بہ شست: کانٹے لگائے   یزداں کشے: خدا کو مارنے یعنی بھلا دینے والا   خجل: شرمندہ   شایان: لائق، اہل   گسل: توڑ دے   رشتہ: دھاگا، تعلق   واگذار: چھڑا دے، رہائی دے   کبود: نیلی، اندھی   نوریاں: نوری کی جمع، مراد روشن ہونے والے، نور والے

۱۴-۲۴:   بمیرد: مرجاتا ہے   بارِتن: جسم کا بوجھ   ضعف پیری: بڑھاپے کی کمزوری/ ناتوانی   شیر غاب: جنگل کا آزاد شیر   افگندہ ناب: گرے ہوئے دانتوں والا   فرد فرد: الگ الگ، بکھر جاتی ہے   اندر نبرد: لڑنے لگتا ہے

درفتد: الجھ پڑتا ہے زنار بند: مراد کافر' کافر مزاج نار ارجمند: جس کی کوئی قیمت نہ ہو' بے قدر و قیمت مہرگاں: موسم خزاں کور ذوق: بدذوق' لذت کی حس سے محروم نیش: زہر نوش: شیریں شربت درباختہ: ہار بیٹھا ہے' لٹا چکا ہے خراں: خر کی جمع: گدھے درساختہ: موافقت کر لی ہے ریگِ ساعت: گھڑی کی ریت' بہت ست' عمل میں بہت ست' قدیم میں ایک برتن میں ریت بھر دیتے' جو ذرہ ذرہ کر کے نیچے گرتی رہتی اور ۲۴ گھنٹوں میں برتن کو خالی کر دیتی تھی' اس سے وقت کا اندازہ کیا جاتا تھا' گویا یہ اس وقت کی گھڑی تھی

۳۱-۲۵: شورہ بوم: بنجر زمین نیش کژدم: بچھو کا ڈنک مور: چیونٹی اژدر گز: اژدہے کو کاٹنے والی عقرب شکار: بچھو کا شکار کرنے والی صرصر: گرم اور تیز ہوا دوزخ نژاد: دوزخ کی نسل کی' یعنی بہت جلانے والی یا عذاب النار زورق: کشتی غلتیدہ ے: لپٹی ہوئی دودِ پیچاں: بل کھاتا ہوا دھواں تندرغو: بجلی کی کڑک والی اندرستیز: آپس میں لڑ رہے ہیں کفچہ: پھن کلب عقور: کٹ کھنا کتا' باؤلا/ پاگل کتا

دربیانِ فنونِ لطیفۂ غلاماں

= فنون: جمع فن' آرٹ فنون لطیفہ: فائن آرٹس

موسیقی

۱-۱۷: فنونِ بندگی: وہ ہنر یا فن جو غلامی میں تخلیق ہوں ہمچو: مانند' کی طرح تیرہ: سیاہ' تاریک سیمائے غلام: غلام کی پیشانی دل افسردہ: بجھا ہوا دل فردا: مراد مستقبل امروز: یعنی زمانہ حال می سازد: کرتا ہے مایست: مت کھڑا ہو' مت رک' کان نہ دھر الحذر: ڈر' بچو کسوتِ صوت: آواز کا لباس بم و زیرش: اس کے اونچے اور نچلے سر برد: لے جاتا ہے ساغر جم: جمشید/ مشہور ایرانی بادشاہ کا پیالہ گوش کن: سن' توجہ کر جملہ موجودات: ساری کائنات یم بے ساحلے: ایک ایسا سمندر جس

کا کوئی ساحل نہ ہو' بیکراں سمندر آہنگش: اس کا سر' اس کی لے شیون: ماتم' واویلا

۱۸-۲۸: خیل خیل: گروہ درگروہ تندرو: تیز چلنے والا' مراد جوش وولولہ پیدا کرنے والا جنوں پرورده ے: جس کی جنون نے پرورش کی ہو' جذبہ وسوزِ عشق کا حامل پروردن: پالنا' پرورش کرنا خامشی: خاموشی کاندرو: کہ اندراو' کہ اس میں می روید کلام: کلام اگتا یا پیدا ہوتا ہے' کلام کیا جاتا ہے آتش افسرده: بجھی ہوئی آگ مرشد رومی: مراد مولانا جلال الدین رومی کشود: کھولا' ظاہر کیا بستاند ترا: تجھے خود میں اتار لے یا جذب کر لے گرداند: کردے کوروکر: اندھا اور بہرا مطرب: گانے والا' مغنی رمید: بھاگ گیا' دور ہو گیا

مصوری

۱-۸: ہم چناں: اسی طرح کا' ایسا ہی براہیمی: مطلب یہ کہ روایتی قدروں سے ہٹ کر کوئی نئی چیز پیدا کرنا آزری: بت گری' حضرت ابراہیمؑ کے دور کا مشہور بت گرو بت تراش (زبور میں ہر جگہ یہ لفظ ذ کے ساتھ ہے۔ آذری جو غلط ہے کیونکہ اس کے معنی آگ کے ہیں) راہب: ترکِ دنیا کرنے والا آدمی' پادری خرقہ پوش: گدڑی پہنے ہوئے یا پہننے والا' فقیرانہ لباس پہننے والا ہیزم بدوش: ایندھن' لکڑیوں کا گٹھا کندھوں پر رکھے جوگیے: کوئی جوگی' کوئی سادھو' تارکِ دنیا ہندو فقیر پیر کے: کوئی حقیر سا بوڑھا دردِ پیری: بڑھاپے کا درد/ دکھ داغ داغ: بہت زخمی گل شد: بجھ گیا نالید: فریاد کی' روئی گسست: ٹوٹ گیا/گئی می چکد: ٹپکتا ہے

۹-۲۴: آفل: فنا ہو جانے والی یا باطل اشیا بیفزود: بڑھایا' اضافہ کیا ربود: اڑا لیا' اچک لیا رعشہ ہا: کپکپیاں' کانپنے کی حالتیں آوردن: لانا' تخلیق کرنا جمہور: یعنی عام لوگ دریوزه: بھیک تہی دستے: ایسا آدمی جس کے ہاتھ خالی ہوں' کنگال' مفلس جستن: تلاش کرنا می بایست: چاہیے ہے سپرد: حوالے کر دیا افگند: مراد کھینچا سترد: مٹا

دیا زجاج: شیشہ طیلسان ہفت رنگ: سات رنگ کی چادر
قرطاس: کاغذ پائے لنگ: لنگڑا پاؤں رخنہ: شگاف' سوراخ
بیباک: بے خوف' نڈر بے حضور: جس کے دل پر کوئی فیضان نہ ہو اور کسی قسم
کی جدت سے کام نہ لے سکے روح الامین: حضرت جبرئیلؑ اسرافیل:
وہ فرشتہ جو قیامت کے روز صور پھونکے گا رستخیز: قیامت شمرد: سمجھا
خاکی: مٹی کا بنا ہوا رسن: رسی کلیمے: مراد کلیم اللہ' حضرت موسیٰؑ کا لقب'
اللہ تعالیٰ سے انہوں نے کلام کیا تھا دست او تاریک: اس کا ہاتھ سیاہ ہو گیا'
حضرت موسیٰؑ کا ایک معجزہ ید بیضا (روشن ہاتھ) اس حوالے سے یہ کہا ہے
چوب او رسن: اس کا عصا رسی بن گیا' حضرت موسیٰؑ کا ایک اور معجزہ ان کا عصا تھا'
جب وہ اپنا عصا زمین پر مارتے تو وہ اژدہا بن جاتا' اسی حوالے سے یہ بات کی
ہے اعجاز: معجزہ' کرامت' عام طاقت سے بالاتر بات دانندہ: جاننے
والا

۲۵-۳۴: کشود: ظاہر کیا چیں رباید: شکنیں چن لیتا ہے می رسد: پہنچتا ہے' ملتا
ہے نگار: حسین' محبوب لات و مناتش: اس کے لات اور منات' قدیم
عرب کے دو مشہور بت' مراد انسانی جسموں کی موٹے قلموں سے بنائی ہوئی
تصویریں آفریند: وہ پیدا/تخلیق کرتا ہے برخود زند: اپنے اوپر اچھالتا ہے
افگند: پھینکتی ہے • فراوانی: کثرت پرنمودن: بھرنا' پُر کرنا عیار:
معیار' پرکھ' کسوٹی عین ابراہیمؑ: وہ سراپا حضرت ابراہیم بھی ہے' اس لحاظ سے
کہ وہ پرانے انداز کے بتوں یعنی تصویروں کو مٹاتا ہے عین آزر: آزر بھی
ہے یعنی وہ نئے نئے بت یعنی تصویریں بناتا ہے ہر بنائے کہنہ: ہر پرانی
عمارت یا بنیاد برمی کند (ک اور ن پر زبر): اکھاڑ ڈالتا/پھینکتا ہے
سوہان زند: ریتی چلا دیتا یا پھیر دیتا ہے

۳۵-۴۲: گردد تہی: خالی ہو جاتی ہے بہی: بہتری' اچھائی ذوقِ ایجاد: نت نئی
تخلیقات کا ذوق و شوق از خویشتن: اپنے آپ سے برفتد: آگرے
گنبد آئینہ فام: شیشے/آئینے کے رنگ کا گنبد' چمکتا ہوا آسمان تقلید: دوسروں
کی پیروی کرنا آزری: بت گری' بت پرستی ندرت: انوکھا پن' نئی نرالی

بات یا تخلیق تازگی ہا: تازگی کی جمع، نئی نئی باتیں کہنہ: پرانی فرسودہ: گھسی پٹی رفتہ: ماضی آیندہ: مستقبل مجاور: بزرگوں کی قبروں کا خادم زشت: برا نکوست: اچھا ہے از تارِ حریر: ریشم کے تاروں سے بنا ہوا

مذہب غلاماں

۱-۴: فراق: جدائی، الگ الگ ہونا انگبینِ زندگانی: زندگی کا شہد بدمذاق: بے مزہ عاشقی؟: یعنی عاشقی کیا چیز ہے زدن: لگانا، مارنا، بسانا وانگہے: اور پھر رحیل: کوچ بے سبیل: بے راہ بے دلیل: رہنما کے بغیر

۵-۲۷: ارزاں دہد: سستے داموں بیچ دیتا ہے دروغِ بافروغ: ترقی کرتا ہوا جھوٹ بطون: جمع بطن، پیٹ، شکم نزاید: پیدا نہیں ہوتا آں خدا: خدائے واحد، اللہ تعالیٰ برد: لے جاتا ہے یکتا: واحد صد پارہ: سوٹکڑوں والا بے چارہ: بے بس، عاجز درمان: علاج آزار: دکھ درد خوگر کند: مانوس کر لیتا ہے عبد: غلام راکب: سوار مردن: مرنا زیستن: جینا، زندہ رہنا نکتہ رس: گہری بات کو پا لینے/ سمجھ لینے والا اعتبارات: جمع اعتبار، ایسی چیز جس کے دو رخ ہوں، ایک کے نزدیک ایک رخ اور دوسرے کے نزدیک دوسرا رخ ٹھیک ہو سکتا ہے ماہیاں: جمع ماہی، مچھلیاں مردکر: بہرا آدمی کور: اندھا چنگے: ایک رباب، ایک ساز حی لایموت: وہ ایسا زندہ ہے جسے موت نہیں ہے قرآنی تلمیح، اللہ تعالیٰ کی ایک صفت زیست: جیا، زندہ رہا زار نیست: یعنی نہیں رویا دیدنی ہا: دیدنی کی جمع، ایسی چیزیں جو دیکھنے کے لائق ہوں عشا: یعنی رات اشراق: صبح کرمے: اس کیڑے برنخاست: باہر نہیں نکلا

۲۸-۳۹: مجوے: مت تلاش کر، توقع نہ رکھ محنتِ دیدن: دیکھنے کی تکلیف بکشایدش: اس (کی زنجیر) کھول دیتا ہے می نہد: رکھ دیتا ہے آئینے: ایسا آئین/ قانون گرہ اندر گرہ: پیچ در پیچ، بہت الجھا ہوا گویدش:

اسے کہتا ہے   می پوش: پہن لے، زندگی کا لباس بنا لے   ریز پیز: گھر کا مختصر سامان، سامان   افزایدش: اس کا (خوف) بڑھاتا ہے   ناپدید: غائب ہو جاتی ہے   خلعت زیبا: خوبصورت شاہی یا امیرانہ لباس   زمام کار: یعنی سلطنت کے کاروبار کا انتظام   مہرہ: شطرنج کی گوٹ، پانسا   شاطر: شطرنج کھیلنے والا   جہاند: گوٹ کو چلایا   بیدق: شطرنج کی ایک گوٹ پیادہ   بفرزینی: وزیر تک، فرزین شطرنج کی ایک گوٹ جسے اصطلاح میں وزیر کہا جاتا ہے   رساند: پہنچایا   شیداش کرد: اسے شیدا کر دیا، فریفتہ کر دیا   ستبر: موٹا   لاغری: کمزوری، ناتوانی   دوک: تکلہ، چرخے کا تکلہ   قریہ: گاؤں، آبادی   زار و زبوں: عاجز و خستہ، مراد ذلیل و رسوا، حقیر

درفنِ تعمیر مردانِ آزاد

۱-۱۲: رفتگاں: رفتہ کی جمع، گذرے ہوئے لوگ، اسلاف   گزیں: اختیار کر   ایبک: مراد قطب الدین ایبک، ہندوستان کا پہلا مسلمان بادشاہ، مشہور غوری بادشاہ شہاب الدین غوری نے اسے ۱۱۹۲ء میں اپنا نائب مقرر کیا، اس نے اسی سال دہلی کو فتح کیا۔ ۱۲۰۶ء میں سلطان کا لقب اختیار کیا اور دہلی کو دارالخلافہ بنایا۔ اس نے قطب الاسلام کے نام سے ایک عالیشان مسجد تعمیر کروائی جسے ''قوۃ الاسلام'' بھی کہتے ہیں۔ ۱۲۱۰ء میں وہ گھوڑے سے گر کر لاہور میں فوت ہوا اور یہیں دفن ہوا۔ اس کی قبر آج بھی انارکلی کے قریب موجود ہے۔   سوری: مراد شیر شاہ سوری، مشہور بادشاہ جس کا تعلق افغان خاندانِ سور سے تھا۔ ایک شیر مارنے پر اسے بادشاہ بہار نے شیر خاں کا خطاب دیا۔ اصل نام فرید، ولادت ۱۴۷۲ء، وفات ۲۲ مئی ۱۵۴۵ء ہندوستان پر وہ پانچ سال حکمران رہا، اس دوران میں اس نے عوام کے لیے بڑے تعمیری کام کیے جن میں کلکتہ سے پشاور تک کی طویل سڑک مشہور ہے۔ اس کے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مسافروں کے لیے ایک ایک سرائے اور کنوئیں بنوائے، نیز پرانے قلعہ میں ایک مسجد تعمیر کرائی جو فنِ تعمیر کا نادر نمونہ ہے، مذکورہ سڑک لاہور سے بھی گذرتی ہے، اسے جرنیلی سڑک

(G.T.Road) کہا جاتا ہے **وانما:** کھول **جگر:** مراد حوصلہ
برون آوردہ اند: مراد نمایاں / اجاگر کیا ہے **پیوستہ اند:** ملا دیے ہیں
بہ آنے: ایک پل / لمحے سے **ارجمند:** قیمتی، قدر و منزلت والا **مپرس:** مت
پوچھ **وائے من:** مجھ پر افسوس ہے **فرات:** مشہور دریا کا نام، مراد دریا
بیخ و بن: بنیاد اور جڑ **برکندہ ے:** اکھاڑ پھینکنے والا یا اکھاڑ پھینکا گیا
نیرو: طاقت **الا اللہ:** کلمہ طیبہ، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔

۱۳-۱۹: **گوہر نابے:** ایک خالص موتی **تاج:** مراد تاج محل جسے مغلیہ شہنشاہ شاہجہان نے آگرہ میں اپنی زوجہ ممتاز بیگم عرف تاج بی بی کی یاد میں تعمیر کرایا تھا، ممتاز وہیں دفن ہے، سنگ مرمر کی نہایت نفیس عمارت ہونے کے باعث دنیا کے سات عجائبات میں شامل ہے **گردندہ تر:** زیادہ رواں یعنی شفاف **سفتہ است:** پرویا ہے **پردہ در:** پردہ پھاڑنے والا **برکشید:** ہٹا دیا، اٹھا دیا

۲۰-۲۸: **ارج:** قیمت، قدر و قیمت **نا ارجمند:** جس کی کوئی قیمت نہ ہو، بے قدر و منزلت **صیقل می زند:** سان پر لگاتا یعنی چمکاتا ہے **فرہنگ:** عقل و دانش **مات:** عاجز، ہارا ہوا، سرنگوں **شاخِ نبات:** مصری کی ڈلی **آفریدن:** پیدا کرنا **دمیدن:** پھونکنا، ڈالنا **مور:** چیونٹی **آمیخت:** ملا دیا **انگیخت:** ابھارا

تمّت بالخیر

مزید کتابیں

زندہ رود	ڈاکٹر جاوید اقبال
اپنا گریبان چاک (خودنوشت سوانح حیات)	ڈاکٹر جاوید اقبال
اقبال فراموشی	پروفیسر فتح محمد ملک
اقبال کا فکری نظام اور تصورِ پاکستان	پروفیسر فتح محمد ملک
اقبال افغان اور افغانستان (اردو، فارسی، پشتو اور انگریزی)	ترتیب و تالیف: محمد اکرام چغتائی
مفکرِ پاکستان	محمد حنیف شاہد
کلیات اقبال	علامہ محمد اقبال
بانگ درا (اعلیٰ ایڈیشن)	علامہ محمد اقبال
شکوہ جواب شکوہ	علامہ محمد اقبال
علم الاقتصاد	علامہ محمد اقبال
اقبال شناسی اور آغا صادق	ترتیب: ڈاکٹر نوید حسن
علامہ اقبال کی سیاسی زندگی	محمد سلیم
اقبال ــــ نئی تفہیم	ڈاکٹر صدیق جاوید
اقبال: شخصیت، افکار و تصورات: مطالعہ کا نیا تناظر	ڈاکٹر سلیم اختر
علامہ اقبال - حیات، فکر، فن	ڈاکٹر سلیم اختر
اقبال اور ہمارے فکری رویے	ڈاکٹر سلیم اختر
فکرِ اقبال کا تعارف	ڈاکٹر سلیم اختر
فکر اسلامی کی تشکیل نو	پروفیسر محمد عثمان
اقبال کے آخری دو سال	عاشق حسین بٹالوی
ولی سے اقبال تک	ڈاکٹر سید عبداللہ
اعجازِ اقبال	ڈاکٹر سید عبداللہ

شرح اقبال

اُردو

۱) بانگِ درا
۲) بالِ جبریل
۳) ضربِ کلیم
۴) ارمغانِ حجاز (فارسی - اُردو)
۵) اسرار و رموز
۶) پیامِ مشرق
۷) جاوید نامہ
۸) زبورِ عجم
۹) پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق/مسافر

The Reconstruction of Religious Thought in Islam	Allama Muhammad Iqbal
The Development of Metaphysics in Persia	Allama Muhammad Iqbal
Iqbal and Tagore: New Avenues for their Comparative study	M. Ikram Chaghatai
Iqbal: New Dimensions	Ed. by M. Ikram Chaghatai
Iqbal Afghan and Afghanistan (English, Urdu, Persian, Pashto)	// //
Iqbal: The Spiritual Father of Pakistan	Rashida Malik
Iqbal: The Great Poet of Islam	Sh. Abdul Qadir
A Voice from the East (The Poetry of Iqbal)	Zulfiqar Ali Khan

Rs. 300.00

www.sang-e-meel.com
ISBN 969-35-1678-8
9 799693 516783